اشرف السیر

تصنیف

شارح بخاری حضرت مفتی شریف الحق امجدی

سابق صدر شعبۂ افتاء جامعہ اشرفیہ مبارک پور اعظم گڑھ

پیش کش

بزم فیض الرضا

اشرف السیر

تصنیف

حضور شارح بخاری

مفتی شریف الحق امجدی علیہ الرحمہ

ناشر

بزمِ فیضانِ رضا طلبہ دار العلوم محبوبِ سبحانی

© جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

سلسلۂ اشاعت نمبر: ۲۷

نام کتاب	:	اشرف السیر
مصنف	:	شارحِ بخاری مفتی شریف الحق امجدی علیہ الرحمہ
تقریظِ جلیل	:	نائبِ شارح بخاری مفتی نسیم احمد مصباحی
تقدیم	:	علامہ سید اکرام الحق قادری مصباحی
ایڈٹنگ (تحقیق و تسہیل)	:	مفتی فاروق خاں مہائمی مصباحی
پروف ریڈنگ	:	محمد مستقیم خان، جماعتِ سادسہ
		محمد صدر عالم رضوی، جماعتِ سادسہ
کمپوزنگ	:	مولانا نصر الدین سبحانی
		مولانا شیخ کلیم، جماعتِ فضیلت
		محمد زاہد الرحمٰن، جماعتِ خامسہ
		محمد عرشی، شعبۂ حفظ
		محمد تصور حسین، شعبۂ حفظ
اشاعت اول	:	اپریل ۱۹۶۸ء
اشاعت دوم	:	نومبر ۱۹۹۹ء
اشاعت سوم	:	دسمبر ۲۰۱۹ء
قیمت	:	
ملنے کا پتہ	:	دار العلوم محبوب سبحانی، کرلا، ممبئی

فہرست

۱	عرضِ حال	۹
۲	تقدیم	۱۳
۳	تقریظ جلیل	۲۴
۴	نذرانۂ عبدیت	۲۵
۵	دیباچہ طبع اوّل	۲۶
۶	دیباچہ طبع ثانی	۲۷
۷	پیشِ لفظ	۲۸
۸	کتاب کا آغاز	۳۲
۹	قدرت کا فضل	۳۳
۱۰	انبیاے سابقین	۳۳
۱۱	ایک جامع کامل کی ضرورت	۳۴
۱۲	سیرت کی ضرورت اور اس کی تالیف	۳۴
۱۳	سیرت نگاری کی ابتدا اور اس کی ترقی	۳۵
۱۴	سیرت پاک اور یوروپ	۳۶
۱۵	یورپ کی کدورت دنیاے اسلام میں	۳۸
۱۶	سیرت کی نئی تصنیفات	۳۸
۱۷	سبب تالیف	۴۲
۱۸	سیرت کی بنیادی کتابیں	۴۳

۱۹	محمد بن اسحاق	۴۳
۲۰	امام واقدی	۴۷
۲۱	ابن سعد	۵۳
۲۲	محب الدین بن جریر طبری	۵۵
۲۳	ضعیف اور موضوع کا فرق	۶۵
۲۴	خلاصۂ ابحاث	۷۴
۲۵	نسب نامہ	۷۵
۲۶	ابوالانبیاء سیدنا ابراہیم علیہ السلام	۷۷
۲۷	ولادت	۷۷
۲۸	تبلیغ توحید	۸۰
۲۹	بت شکنی	۸۰
۳۰	آتش کدۂ نمرود	۸۳
۳۱	نمرود اور قومِ نمرود کی بربادی	۸۴
۳۲	مصر کا سفر	۸۵
۳۳	حضرت اسماعیل علیہ السلام	۸۷
۳۴	ماں بیٹے اور وادی غیر ذی زرع	۸۷
۳۵	بیر زم زم کا اُبلنا	۸۹
۳۶	بنی جرہم کی آمد	۹۰
۳۷	شادی	۹۰
۳۸	انقیاد و ایثار کا عظیم امتحان	۹۳
۳۹	مرکز توحید کی تعمیر	۹۴
۴۰	وفات	۹۶
۴۱	اہلِ کتاب کی ہفوات کا رد	۹۷

۴۲	پہلا مسئلہ ---حضرتِ اسماعیل کہاں آباد ہوئے؟	۹۹
۴۳	دوسرا مسئلہ---قربانی کس کی ہوئی؟	۱۰۰
۴۴	بحث اول	۱۰۱
۴۵	بحث دوم	۱۰۶
۴۶	تیسرا مسئلہ---قربانی کہاں ہوئی؟	۱۱۰
۴۷	عدنان	۱۱۳
۴۸	معد	۱۱۳
۴۹	نزار	۱۱۴
۵۰	مضر	۱۱۴
۵۱	الیاس	۱۱۴
۵۲	مدرکہ	۱۱۵
۵۳	خزیمہ	۱۱۵
۵۴	کنانہ	۱۱۵
۵۵	نضر	۱۱۶
۵۶	مالک	۱۱۷
۵۷	فہر	۱۱۷
۵۸	غالب	۱۱۸
۵۹	لُوَی	۱۱۸
۶۰	کعب	۱۱۸
۶۱	مرہ	۱۱۹
۶۲	کلاب	۱۱۹
۶۳	قُصَیّ	۱۱۹
۶۴	عبدِمناف	۱۲۱

۶۵	ہاشم	۱۲۳
۶۶	عبدالمطلب	۱۲۵
۶۷	شادی	۱۲۶
۶۸	چاہِ زم زم کی دوبارہ کھدائی	۱۲۶
۶۹	حضرتِ عبداللہ	۱۲۹
۷۰	سنت ابراہیمی کی تجدید	۱۳۱
۷۱	ایک شبہ کا ازالہ	۱۳۳
۷۲	ایک اور موشگافی	۱۳۵
۷۳	شادی	۱۳۶
۷۴	وفات	۱۳۷
۷۵	ارہاصات	۱۳۹
۷۶	قبلِ نبوت خوارقِ عادات	۱۳۹
۷۷	واقعۂ فیل	۱۳۹
۷۸	اصحابِ فیل کی پیش قدمی	۱۴۲
۷۹	اصحابِ فیل کی تباہی	۱۴۲
۸۰	دیگر خوارقِ عادت	۱۴۴
۸۱	خورشید رسالت کا طلوع	۱۴۶
۸۲	ولادت	۱۴۷
۸۳	تاریخِ ولادت	۱۵۳
۸۴	صحیح تاریخ	۱۵۸
۸۵	رضاعت	۱۶۲
۸۶	آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حلیمہ کی گود میں	۱۶۴
۸۷	برکات	۱۶۴

۸۸	ایّامِ شیر خواری کے عادات	۱۶۶
۸۹	مکہ واپسی اور گمشدگی	۱۷۰
۹۰	مدینے کا سفر---والدۂ محترمہ کا انتقال	۱۷۱
۹۱	عبدالمطلب کی کفالت	۱۷۲
۹۲	دفعِ قحط	۱۷۳
۹۳	عبدالمطلب کی وفات	۱۷۳
۹۴	آبائے کرام کا اسلام	۱۷۴
۹۵	ابوطالب	۱۸۳
۹۶	دفعِ قحط	۱۸۴
۹۷	گھریلو مصروفیات	۱۸۴
۹۸	شام کا سفر اور بحیرا راہب سے ملاقات	۱۸۷
۹۹	چند یوروپین کی بڑھ	۱۸۸
۱۰۰	فجارِ ثانی	۱۹۹
۱۰۱	حلف الفضول	۲۰۰
۱۰۲	تعمیرِ کعبہ	۲۰۱
۱۰۳	کسبِ معاش و تأہّل	۲۰۴
۱۰۴	حضرتِ خدیجہ	۲۰۶
۱۰۵	نسطورا سے ملاقات	۲۰۶
۱۰۶	عقدِ نکاح:	۲۰۷
۱۰۷	خصوصی احباب	۲۱۰
۱۰۸	دنیا کی حالت	۲۱۱
۱۰۹	فارس	۲۱۲
۱۱۰	روم	۲۱۲

۱۱۱	یہود	۲۱۳
۱۱۲	ہنود	۲۱۴
۱۱۳	بدھ	۲۱۵
۱۱۴	عرب کی حالت	۲۱۶
۱۱۵	ہُبَل	۲۱۸
۱۱۶	مَنات	۲۱۹
۱۱۷	عزّیٰ	۲۱۹
۱۱۸	لات	۲۱۹
۱۱۹	اساف ونائلہ	۲۱۹
۱۲۰	ستارہ پرستی	۲۲۱
۱۲۱	نصرانیت	۲۲۱
۱۲۲	یہودیت	۲۲۱
۱۲۳	مجوسیت	۲۲۲
۱۲۴	اخلاقی حالت	۲۲۲
۱۲۵	دینِ حنیف	۲۲۲
۱۲۶	قس بن ساعدہ	۲۲۵
۱۲۷	اُمیہ بن صلت	۲۲۶
۱۲۸	بعثت	۲۲۷
۱۲۹	غارِ حرا	۲۲۷

عرضِ حال

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم حامداً ومصلیاً مسلّما

حضور شارحِ بخاری مفتی شریف الحق امجدی علیہ الرحمہ کی فنِ سیرت پر لکھی گئی ایک مستند کتاب کا نام ''**اشرف السیر**'' ہے، جو پہلی مرتبہ ۱۹۶۸ء میں اور دوسری مرتبہ کچھ ترمیم کے ساتھ **۱۹۹۹**ء میں منظر عام پر آئی اور کچھ ہی سالوں میں نایاب ہوگئی۔ حضرت **علامہ محمد احمد مصباحی** دام ظلہ- سابق صدر المدرسین اور موجودہ ناظمِ تعلیمات جامعہ اشرفیہ مبارک پور، اعظم گڑھ- سے مشورہ کرنے کے بعد ''**بزمِ فیضانِ رضا**- طلبۂ دار العلوم محبوبِ سبحانی'' اِس کی تبارہ اشاعت کر رہی ہے۔

''بزمِ فیضان رضا'' ہر سال کسی ایک دن کو مجددِ اعظم اعلیٰ حضرت امام احمد رضا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی طرف منسوب کرتی ہے، اُس دن ایک تعلیمی کانفرنس منعقد کرتی ہے، جس میں ملک کی جانی مانی ہستیاں مدعو کی جاتی ہیں، ساتھ ہی ساتھ کسی مفید علمی کتاب کی اشاعت بھی کرتی ہے۔ پچھلے سال اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ کا صد سالہ عرس تھا، اِس موقع پر بزمِ فیضان رضا نے ایک تاریخی قدم اٹھاتے ہوئے یہ فیصلہ کیا کہ اَب سے ہر سال کسی معظم علمی شخصیت کی بارگاہ میں ''امام احمد رضا ایوارڈ'' پیش کیا جائے گا؛ تاکہ اُن کی خدمات کا اعتراف بھی ہو جائے اور اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ کی بارگاہ میں خراج عقیدت بھی پہنچ جائے۔

صد سالہ عرسِ رضوی کی پروگرامنگ کی وجہ سے پچھلے سال کسی کتاب کی اشاعت نہ ہو سکی تھی، اس لیے بزمِ فیضانِ رضا کے سرپرست حضور خاتم الخلفاء حضرت مولانا سید اکرام الحق قادری مصباحی دام ظلہ نے اِس سال ایک ساتھ دو کتابوں کی اشاعت کا فیصلہ کیا۔ ''اشرف السیر'' کے علاوہ اِس سال امام غزالی علیہ الرحمہ کی مشہور زمانہ کتاب ''المنقذ من الضلال'' کا اردو ترجمہ بنام

''اجالوں کا سفر'' منظر عام پر آئے گی۔

''**بزمِ فیضانِ رضا**'' بے حساب داد و تحسین اور مبارک باد کی مستحق ہے، جو ممبئ میں رہ کر بھی طلبۂ جامعہ اشرفیہ جیسا کام کر رہی ہے، ۱۹۸۳ء سے اس نے اپنے اشاعتی سلسلے کا آغاز کیا ہے، اور اب تک ۲۸/ کتابیں منظر عام پر لا چکی ہے۔ اِس کے فعال ارکان اپنے اساتذہ کی راہ نمائی میں پوری تن دہی کے ساتھ مصروف عمل رہتے ہیں۔ امسال اس کے ارکان یہ ہیں:

صدر : **محمد سلیم رضا**، سدھارت نگر، یوپی، جماعت فضیلت

نائب صدر : **محمد صدرِ عالم رضوی**، چیتا کیمپ، ممبئ، جماعت سادسہ

: **محمد شمیم اختر**، کشن گنج، بہار، شعبۂ حفظ

خزانچی : **محمد ارمان**، بہرائچ، یوپی، جماعتِ سابعہ

نائب خزانچی : **سید مفتاح الحسن**، قنوج، یوپی، جماعت سادسہ

ہم نے جو کام کیا:

اشرف السیر پر ہمارے کام کرنے کا انداز کچھ اس طرح ہے:

۞ استادِ محترم حضرت مولانا اختر حسین فیضی مصباحی -دام ظلہ- کی کتاب ''قواعدِ املا و انشا'' اور اس میں موجود حضرت مصباحی صاحب -ادام اللہ بقاءہ- کے مقدمے کے مطابق اس کتاب کا املا درست کر دیا گیا ہے۔

۞ کتاب کی تسہیل کے لیے رموز و اوقاف بھی جوڑ دیے گئے ہیں۔

۞ کمپوزنگ کی غلطیاں بھی سدھار لی گئی ہیں۔

۞ ایسی ترکیب جس سے جملے کی سلاست پر آنچ آتی تھی، اسے دیانت داری کے ساتھ بدل دیا گیا ہے۔

۞ کنیت والے اسما کو ''ابو'' سے ہی لکھا گیا ہے، چاہے شروع میں ہو یا بیچ میں۔ جیسے ''ابو بکر''۔ اور ''ابن ابی شیبہ'' کو ''ابن ابو شیبہ'' کر دیا گیا ہے۔ اور ''بنو بکر اسد- بنو خزاعہ'' کو ''بنی اسد- بنی خزاعہ'' کر دیا ہے؛ کہ اردو میں ایسا ہی لکھا جاتا ہے۔

۞ حوالے اقتباس کے بعد ہی نقل کیے گئے ہیں۔

۞ لمبے لمبے پیراگراف کو چھوٹے چھوٹے پیراگراف میں تبدیل کر دیا ہے تاکہ قارئین کو پڑھنے میں سہولت ہو۔

۞ کسی کے قول یا حوالے کو واوین (''-'') میں کر کے نئی لائن سے لکھا ہے۔

۞ قرآنِ کریم کی آیتوں کو اِس طرح کے ﴿﴾ بریکٹ میں جگہ دی ہے۔

۞ ہم نے جو بھی اضافہ کیا ہے اسے اس طرح کے [] بریکٹ میں لکھا ہے۔

حاصل یہ کہ کتاب کو مفید اور جاذب نظر بنانے کا پورا اہتمام کیا گیا ہے، اور اِس کی بھی بھرپور کوشش کی گئی ہے کہ جملوں کی سلاست وروانی بحال رہے۔

اس کام میں درج ذیل حضرات نے ہمارا ساتھ دیا:

۞ **مولانا نصر الدین سبحانی**، استاد شعبۂ کمپیوٹر دار العلوم محبوب سبحانی - **شیخ کلیم**، جماعت فضیلت - **محمد زاہد الرحمٰن**، جماعتِ خامسہ - **محمد عرشی**، شعبۂ حفظ - **محمد تصور حسین**، شعبۂ حفظ، نے کتاب کی کمپوزنگ فرمائی۔

۞ صدر عالم رضوی، جماعتِ سادسہ اور محمد مسقیم خاں، جماعتِ سادسہ نے بڑی عرق ریزی کے ساتھ کتاب کی تین مرتبہ پروف ریڈنگ کی۔

مذکورہ تمام افراد نے بغیر کسی تکدُّر کے، خلوص وللّٰہیت کے ساتھ یہ کام کیا ہے۔ یہ چند جملے ان کے کام کا اجر کیسے بن سکتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ سب کی کاوش کو قبول فرمائے، اور سب کا مستقبل تابناک بنائے۔

راقم اور بزمِ فیضانِ رضا کی پوری ٹیم، نائب شارح بخاری حضرت مفتی نسیم احمد مصباحی دام ظلہ کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ آپ نے اس کتاب پر تقریظ لکھ کر ہماری بے پناہ ہمت افزائی فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کا سایۂ بابرکت ہمارے سروں پر قائم ودائم رکھے۔

اخیر میں قارئین سے گزارش ہے کہ اگر اس کتاب سے انھیں کسی بھی قسم کا فائدہ پہنچا ہو تو وہ طلبہ واساتذۂ محبوب سبحانی کو، خاص طور پر حضور خاتم الخلفاء حضرت مولانا سید اکرام الحق قادری مصباحی دام ظلہ - صدر المدرسین دار العلوم محبوب سبحانی کو اپنی خصوصی دعاؤں میں ضرور یاد

رکھیں، جوزبردست ٹیم ورنگ کے ساتھ دارالعلومحبوب سبحانی کوترقی کی بلندیوں پر لے جارہے ہیں۔مولا کریم آپ کا اقبال مزید بلند فرمائے اور حاسدوں کے حسد سے محفوظ فرمائے۔

فاروق خاں مہائمی مصباحی
خادمِ تدریس وافتا: دارالعلوم محبوب سبحانی، کرلا، ممبئی۔
ساکن: ماہم ایسٹ، ممبئی۔

۹/ربیع الآخر/۱۴۴۱ھ
۷/دسمبر/۲۰۱۹ء

موبائل:7860311024 /E-mail: khan170690@gmail.com

تقدیم

حضرت علامہ ومولانا سید محمد اکرام الحق قادری مصباحی دام ظلہ
صدر المدرسین دار العلوم محبوب سبحانی، کرلا، ممبئی۔

نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

ممبئ عظمیٰ (صوبۂ مہاراشٹر، ہند) میں دار العلوم محبوبِ سبحانی مسلکِ حق اہلِ سنت و جماعت، مسلکِ اعلیٰ حضرت کی صحیح ترجمانی کرنے والا ایسا معروف ادارہ ہے، جو اپنے مستحکم نظامِ تربیت، بلند معیارِ تدریس اور عصرِ جدید سے ہم آہنگ نصابِ تعلیم کی بنیاد پر اپنی الگ شناخت رکھتا ہے۔

کوئی ۴۲ برس قبل، فاضلِ جامعہ اشرفیہ مبارک پور، تلمیذِ حضور حافظِ ملت، حضرت علامہ مفتی شاہ عبد الرحیم صاحب قبلہ ساحلؔ مصباحی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (متوفّٰی ۲۷ رمئی ر ۲۰۰۵ء) نے سرزمینِ کرلا ویسٹ ممبئ میں بالکل لبِ روڈ اِس ادارے کی بنیاد ڈال کر تعلیم وتدریس کا آغاز فرمایا تھا۔ شروع ہی سے یہ ادارہ معیاری تعلیم اور عمدہ نظم ونسق کے سبب عوام وخواص کے مابین متعارف رہا، اور اب چار دہائیاں گزر جانے کے بعد، اِس کا علمی، تعلیمی، تربیتی، تبلیغی اور اشاعتی منہج اِس قدر منظم، مستحکم اور پائیدار ہو چکا ہے کہ پورے ملک میں اِسے ایک کامیاب ادارے کی شکل میں دیکھا جا رہا ہے۔ اگر اِس کے اراکین و منتظمین کی مساعیِ جمیلہ اور اساتذہ و مدرسین کی پیہم کاوشیں یوں ہی جاری رہیں تو مستقبل قریب میں یہ ادارہ ایک عظیم الشان جامعہ بن کر ابھرے گا۔ ان شاء اللہ تبارك وتعالیٰ۔

ویسے تو یہ ادارہ صوبۂ مہاراشٹر میں کسی تعارف وتذکرے کا محتاج نہیں؛ مگر چوں کہ آج سائنس وٹکنالوجی کی ترقی نے پوری دنیا کو ایک شہر، بلکہ ایک چھوٹے سے محلے میں تبدیل کر دیا ہے۔ انٹرنیٹ کے زمانے میں، نیٹ پر دستیاب کتابوں کا مطالعہ کسی بھی ملک وشہر سے کیا جا سکتا ہے۔ اِس لیے پوری دنیا کے علمی حلقوں میں متعارف ومانوس کرانے کے لیے ادارہ اور اِس کے متحرک وفعال

طلبہ کی انجمن ''بزمِ فیضانِ رضا'' کا مختصراً تعارف کر دینا مناسب معلوم ہو رہا ہے۔

دارالعلوم محبوبِ سبحانی، ممبئی، مہاراشٹر، ہند:

ایک صحیح اندازے کے مطابق ۱۹۴۹ء کے آس پاس چند دین دار حضرات نے ایک مسجد کا سنگِ بنیاد رکھ کر سرکارِ غوثِ اعظم کی نسبت سے اسے ''محبوبِ سبحانی مسجد'' کے نام سے موسوم کیا۔ تلاشِ بسیار کے باوجود یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کن سعادت مندوں کے ہاتھوں اِس کی تعمیر عمل میں آئی۔ ۱۹۴۹ء سے ۱۹۷۶ء تک اِسی مسجد کے احاطے میں اہلِ محلہ کے نونہالوں کے لیے دینیات و ناظرہ کی تعلیم ہوتی رہی۔ ۱۹۷۶ء کے اواخر میں اِس خطے کا اقبال بلند ہوا اور بفضلہٖ تعالیٰ، پروردۂ حضور حافظِ ملت علیہ الرحمہ، زاہدِ بے ریا، عمدۃ الأصفیا، زبدۃ الأتقیا حضرت علامہ مفتی عبد الرحیم صاحب قبلہ ساحلؔ مصباحی -رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ- کی آمد سے اِس کی رونقِ ظاہری و باطنی دو بالا ہوئی۔ حضورِ والا مرتبت کی اَن تھک کوششوں کا ثمرہ یوں برآمد ہوا کہ ۱۹۷۷ء ہی سے حفظ و درسِ نظامی کی تعلیم کا باضابطہ آغاز ہو گیا اور ۱۹۹۵ء تک مسجد ہی عمارت میں یہ سلسلۂ تعلیم جاری رہا۔

۱۹۹۵ء تک حضرتِ موصوف اپنی مخلصانہ و داعیانہ کوششوں کی بدولت اراکین و منتظمین کے دلوں کو دین و مذہب کی خدمت کے جذبۂ صادق سے لبریز کر چکے تھے، چناں چہ حضرتِ ممدوح کی تحریک پر آپ ہی کی سرپرستی میں اربابِ حل وعقد نے ادارے کی تعمیرِ نَو کا منصوبہ بنایا، سرمایہ جمع کیا اور خانوادۂ مارہرہ کے عظیم روحانی پیشوا، حضور احسن العلما رحمۃ اللہ علیہ سے سنگِ بنیاد رکھنے کی التجا کی۔ حضور اپنی علالت کے سبب خود تو نہ آ سکے؛ لیکن اپنے شہزادے حضرت سید محمد اشرف میاں مارہروی مدظلہ العالی کو سنگِ بنیاد کے لیے ایک اینٹ دے کر بھیجا، اور اِس طرح سے حضرت سید محمد اشرف صاحب اور حضرت علامہ سید کمیل اشرف صاحب رفعت معالیھما و بورکت فی ایامھما و لیالیھما کے مبارک ہاتھوں سے ادارے کی تعمیرِ نو کا سنگ بنیاد رکھا گیا اور چار منزلہ نہایت مضبوط، شان دار، زلزلہ پروف، سنگ مرمر سے مرصع بہت خوب صورت عمارت کی تعمیر عمل میں آئی۔ ساتھ ہی مسجد سے بالکل متصل ''زبیدہ'' نامی ایک وسیع و عریض تین منزلہ ہوٹل خرید کر ادارے کے نام وقف کیا گیا۔ تا دمِ ایں انھی دونوں عمارتوں میں ادارے کی تعلیمی سرگرمیوں کا سلسلہ جاری ہے۔

اِس برقی دور میں سائنسی علوم وفنون کی اہمیت وافادیت سے کسی بھی صاحب عقل کو انکار نہیں ہوسکتا، پھر طلبۂ اسلام کو کامیاب داعی بنانے کے لیے جدید آلاتِ تبلیغ سے لیس کرنا اور اُن میں دینی وعصری علوم کا امتزاج پیدا کرنے کے لیے ٹیکنیکل کورسز کے ادارے اور انسٹی ٹیوٹس قائم کرنا بھی ضروری ہے؛ اِس لیے طالبانِ علوم شرعیہ کے لیے بالخصوص اور مسلمانانِ اہلِ سنت کے بچوں کے لیے بالعموم ''ٹیکنکل اور میڈکل کالجز''، نیز قوم کو فنِّ تعلیم وتربیت سے آراستہ کرنے والی معلمات ومبلغات عطا کرنے کے لیے ایک بڑے '' كلية البنات'' (گرلس کالج) کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس ہوئی؛ لیکن اِن اغراض ومقاصد کی تکمیل کے لیے اِس کی موجودہ عمارت کافی تنگ ثابت ہورہی ہے اور تشنگاہِ علومِ نبویہ کی کثرت وہجوم نے بھی اِسے ناکافی بنادیا ہے۔ اِس لیے کرلا ممبئ سے تقریباً ۷۰ کلومیٹر دور بیرونی شہر مہاپولی، بھیونڈی میں تقریباً آٹھ ایکڑ (چالیس بیگھا) پر مشتمل نہایت وسیع وعریض ہموار زمین کی خریداری چند سال قبل عمل میں آچکی ہے۔ اگر اہلِ ثروت حضرات نے توجہ مبذول فرمائی تو جلد ہی تعمیری کام کا آغاز ہوگا اور اِس کی فلک بوس اور پرشکوہ عمارتیں دیکھ کر اہلِ باطل کی نگاہیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی، اِن شاء الله تبارك وتعالیٰ۔

موجودہ اراکین ومنتظمین میں یہ حضرات اہم ہیں:

[۱] عالی جناب الحاج سید سہیل اشرف صاحب قبلہ اشرفی (سرپرستِ اعلیٰ)۔
[۲] الحاج جناب محمد عارف نسیم خان صاحب قبلہ (صدرِ اعلیٰ)۔
[۳] الحاج جناب محمد یعقوب خان صاحب قبلہ برکاتی (نائب صدر)۔
[۴] الحاج جناب کلیم اللہ صاحب قبلہ نظامی (سیکریٹری)۔
[۵] جناب الحاج عنایت اللہ صاحب قبلہ برکاتی (خزانچی)۔
[۶] جناب الحاج اظہار الحسن صاحب قبلہ (نائب سیکریٹری)۔

اساتذۂ کرام شعبۂ درسِ نظامی:

[۱] راقم الحروف سید محمد اکرام الحق قادری مصباحی: صدر المدرسین۔
[۲] حضرت علامہ محمد امجد علی صاحب قبلہ مصباحی: شیخ الحدیث۔

[۳] حضرت علامہ مفتی سید محمد شاکر صاحب سیفی مصباحی: مفتیِ ادارہ۔
[۴] حضرت علامہ محمد شمیم صاحب مصباحی: نائب شیخ الحدیث۔
[۵] حضرت علامہ محمد فاروق خان صاحب مصباحی: استاذ و نائب مفتی۔
[۶] حضرت علامہ محمد حبیب الرحمٰن صاحب امجدی: استاذ درسِ نظامی۔
[۷] حضرت علامہ مفتی محمد وسیم صاحب قادری مصباحی: استاذ و نائب مفتی۔
[۸] حضرت علامہ محمد فیروز احمد صاحب قادری مصباحی: استاذ درسِ نظامی۔
[۹] حضرت علامہ بشیر اسلم صاحب قبلہ سبحانی: استاذ درسِ نظامی۔
[۱۰] حضرت علامہ ذوالفقار علی صاحب قبلہ برکاتی سبحانی: استاذ درسِ نظامی۔
[۱۱] حضرت علامہ محمد طاہر حسین صاحب مصباحی: استاذ درسِ نظامی۔
[۱۲] حضرت علامہ محمد رحمانی صاحب مصباحی۔نگراں واستاذ درس نظامی۔
[۱۳] حضرت علامہ ماسٹر شمس الدین صاحب مصباحی۔استاذ انگلش۔
[۱۴] حضرت مولانا منصور احمد صاحب۔استاذ انگلش۔
[۱۵] حضرت علامہ نصر الدین صاحب سبحانی۔استاذ کمپیوٹر۔
[۱۶] حضرت ماسٹر حسین صاحب۔استاذ انگلش۔

اساتذۂ کرام شعبۂ تجوید وتحفیظ:

[۱] حضرت حافظ وقاری منور حسین صاحب: سابق ناظمِ اعلیٰ۔
[۲] حضرت مولانا قاری محمد مزمل حسین صاحب قبلہ: شیخ القراء۔
[۳] حضرت حافظ وقاری محمد حسیب الرضا صاحب قبلہ نوری ضیائی: استاذ شعبۂ حفظ وقراءت۔
[۴] حضرت مولانا حافظ وقاری غلام احمد رضا صاحب سبحانی: استاذ شعبۂ حفظ۔
[۵] حضرت حافظ وقاری سید محمد حسن صاحب قبلہ: استاذ شعبۂ حفظ۔
[۶] حضرت مولانا حافظ وقاری ارشاد احمد صاحب قبلہ سبحانی: استاذ شعبۂ حفظ۔
[۷] حضرت حافظ وقاری ہارون صاحب قبلہ: استاذ شعبۂ حفظ وقراءت۔

[۸] حضرت حافظ وقاری اسرار احمد صاحب قبلہ: استاد شعبۂ حفظ۔

[۹] حضرت مولانا حافظ و قاری محمد کلیم احمد صاحب سبحانی : استاد شعبۂ حفظ۔

اساتذۂ کرام شعبۂ دینیات:

[۱] حضرت مولانا حافظ وقاری محمد رفیق احمد صاحب سبحانی۔

[۲] حضرت مولانا حافظ وقاری معین الدین صاحب سبحانی۔

[۳] حضرت حافظ وقاری محمد شریف احمد صاحب سبحانی۔

[۴] حضرت مولانا قاری محمد غلام غوث صاحب سبحانی۔

[۵] حضرت مولانا حافظ وقاری سہراب صاحب سبحانی۔

[۶] حضرت حافظ وقاری احمد رضا صاحب سبحانی۔

[۷] حضرت مولانا حافظ وقاری عبید رضا صاحب منظری۔

[۸] حضرت مولانا محمد خورشید رضا صاحب قبلہ سبحانی:

[۹] حضرت مولانا محمد عتیق اللہ صاحب قبلہ سبحانی: آفس انچارج۔

تعلیمی شعبے یہ ہیں:

[۱] شعبۂ دینیات بالتجوید برائے اہلِ محلہ: تعدادِ طلبہ پانچ سو سے زائد۔

[۲] تحفیظ بالحدر: تعدادِ طلبہ تقریباً پونے دوسو۔

[۳] قراءت بروایتِ حفص: از طلبۂ ثانیہ تا رابعہ لازم۔

[۴] مشق وترتیل: برائے طلبۂ حفظ، اعدادیہ اور اولیٰ لازم۔

[۵] قراءت بروایتِ سبعہ، برائے جماعتِ فضیلت۔

[۶] درسِ نظامی از اعدادیہ تا فضیلت: تعدادِ طلبہ تقریباً پونے تین سو۔

[۷] انگلش: از اعدادیہ تا فضیلت لازم۔

[۸] کمپیوٹر: از سادسہ تا فضیلت لازم۔

[۹] اسکول از کے۔جی تا ۸ کلاس برائے اطفال۔

[۱۰] شعبۂ نشر واشاعت۔

خلاصہ یہ کہ دارالعلوم محبوبِ سبحانی اپنی تعلیمی وتبلیغی سرگرمیوں کے باعث مہاراشٹر کی سر زمین پر ایک امتیازی شان رکھتا ہے۔ سرکارِ غوثِ اعظم -رضی اللہ تعالیٰ عنہ- کے فیضانِ کرم اور مشائخِ کرام کی دعاؤں سے روز بروز ترقی کی طرف گامزن ہے۔ اِس کے تعلیمی وتعمیری، علمی و تحریری شعبے ہنوز ترقی پزیر ہیں۔ ادارے سے اب تک تقریباً ڈیڑھ ہزار طلبہ فارغ ہوکر ملک کے گوشے گوشے میں مسلکِ اہلِ سنت کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ یہاں ازہرِ ہند "الجامعۃ الاشرفیہ" مبارک پور، اعظم گڑھ کے نصاب کے مطابق تعلیم دی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے متعلمین "جامعہ اشرفیہ" و "جامعہ علیمیہ" وغیرہما ملک کے مایۂ ناز اداروں میں نہ صرف یہ کہ داخلہ لینے میں کامیاب ہوجاتے ہیں؛ بلکہ ششماہی وسالانہ امتحانات میں نمایاں کامیابی حاصل کرکے، فتح وکامرانی کے جھنڈے گاڑتے ہوئے سندِ فراغت حاصل کرتے ہیں۔ فالحمد للہ علیٰ ذٰلک۔

بزمِ فیضانِ رضا:

دارالعلوم محبوبِ سبحانی کے متحرک وفعال، حوصلہ منداور باذوق طلبہ کی انجمن کا نام "بزمِ فیضانِ رضا" ہے، یہ انجمن بانی ادارہ حضرت علامہ عبدالرحیم خان صاحب قبلہ -رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ- کی سرپرستی میں ۱۹۸۳ء میں قائم ہوئی۔ یومِ قیام سے لے کر اب تک اِس بزم پر مجدد اعظم امام احمد رضا خان -رضی اللہ تعالیٰ عنہ- کا فیضِ کرم ابرِ بارندہ بن کر برس رہا ہے اوران شاءاللہ تعالیٰ صبحِ قیامت تک برستا رہے گا۔

یہ بزم درحقیقت اِن شاہیں صفت طلبہ کا ترویجی، اشاعتی، تربیتی اور تبلیغی ادارہ ہے، جس کا مقصد اگر ایک طرف مطبوعہ درسی وغیر درسی کتب ورسائل وجرائد کی ذخیرہ اندوزی ہے تو دوسری طرف یہ بھی ہے کہ دنیاے سنیت کے اربابِ فکر ودانش، سنجیدہ اسلوبِ بیان کے ماہر قلم کاروں بالخصوص اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان -رضی اللہ تعالیٰ عنہ- کی قلمی خدمات کو سلیس اندازِ بیان اور خوش اسلوبی سے مزین کرکے طباعت کے مرحلے سے گزار کر اُن کی اشاعت وترسیل کا منظم انتظام کیا جائے اور ملک کی اہم دانش گاہوں اور معروف لائبریریوں میں انھیں ارسال کیا

جائے، نیز عوام وخواص میں اُنھیں بلا قیمت مفت تقسیم کیا جائے۔

یہ بزم بحمد اللہ تعالیٰ اپنے اغراض و مقاصد میں صد فی صد کامیاب و کامران ہے۔ ادارے کو کفیل نہ بناتے ہوئے اِس نے اپنے ذاتی فنڈ سے نہ صرف یہ کہ اپنی مستقل لائبریری قائم کر کے اُس میں لاکھوں روپے کی کتابیں مہیا کرائیں، بلکہ تقریباً سوا لاکھ روپے خرچ کر کے ۱۲ بائی ۲۵ کے ہال میں جملہ سہولیات سے لبریز ایک دیدہ زیب ''**حافظِ ملت دارالمطالعہ**'' بھی قائم کیا۔ اراکین بزم کی کارکردگی کا اندازہ اِس سے لگائیں کہ یومِ تاسیس سے لے کر اب تک یہ انجمن تقریباً ہر سال کوئی نہ کوئی اہم کتاب منتخب کر کے اپنے صرفۂ خاص سے اس کی ترسیل و اشاعت کا بوجھ برداشت کرتی آئی ہے۔

اگست ۱۹۸۶ء مطابق ۱۴۰۶ھ میں بزم فیضانِ رضا نے پہلی کتاب'' **اظہار الحق الجلی**'' (مصنف: امام احمد رضا خان رضی اللہ تعالیٰ عنہ) شائع کرا کر مفت تقسیم کرنے پر عوام و خواص سے دادِ تحسین وصول کی۔ اِس کتاب کی طباعت کے بعد اِس بزم پر، فیضِ رضا کی ایسی برکھا برسی کہ اِس کی جانب سے علمی، تحقیقی، قیمتی اور معیاری کتب کی طباعت و اشاعت کا سلسلہ آج تک جاری ہے اور ان شاء اللہ تبارک وتعالیٰ کل بھی جاری رہے گا۔

بزمِ فیضانِ رضا سے اب تک درج ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

[۱] **اظہار الحق الجلی**: از اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان علیہ الرحمہ۔

[۲] **برکات الامداد**: از اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان علیہ الرحمہ۔

[۳] **میلادِ مصطفی**: از اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان علیہ الرحمہ۔

[۴] **سید المرسلین**: از اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان علیہ الرحمہ۔

[۵] **گستاخِ رسول کی شرعی سزا**: از اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان علیہ الرحمہ۔

[۶] **الحجۃ الفائحۃ**: از اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان علیہ الرحمہ۔

[۷] **دس عقیدے**: از اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان علیہ الرحمہ۔

[۸] **اکرامِ امام احمد رضا**: از حضرت مفتی برہان الدین جبل پوری علیہ الرحمہ۔

[۹] **کتاب التراویح**: از غزالیِ دوراں علامہ سعید کاظمی پاکستانی، علیہ الرحمہ۔

[۱۰] فاضلِ بریلوی اور امورِ بدعت: از سید فاروق القادری صاحب۔
[۱۱] اندھیرے سے اجالے تک: از علامہ عبدالحکیم شرف قادری صاحب علیہ الرحمہ۔
[۱۲] مسائل سبعہ: از مفتی رضوان الرحمٰن صاحب مالوی۔
[۱۳] مدارِ نجات: از مولانا رضوان احمد صاحب شریفی۔
[۱۴] رضا کوئیز بک: از پروفیسر حافظ شکیل پاکستان۔
[۱۵] دینِ حسن: از استاذِ زمن علامہ حسن رضا بریلوی علیہ الرحمہ۔
[۱۶] قیامت: از پروفیسر مسعود احمد صاحب علیہ الرحمہ۔
[۱۷] جشنِ بہاراں: از پروفیسر مسعود صاحب علیہ الرحمہ۔
[۱۸] عظمتِ نماز: از علامہ ساجد علی صاحب مصباحی۔
[۱۹] بولتی تصویریں: از ڈاکٹر جابر شمس صاحب مصباحی۔
[۲۰] ادلۂ ایمانیہ شرحِ قصیدۂ نعمانیہ: از سید محمد اکرام الحق قادری مصباحی۔
[۲۱] تابناک موتی (اردو ترجمہ: الدرر السنیۃ فی الرد علی الوہابیہ): از سید محمد اکرام الحق قادری مصباحی۔
[۲۲] عقائد و نظریات: از علامہ عبدالحکیم شرف القادری علیہ الرحمہ۔
[۲۳] حقیقتِ محمدی (اردو ترجمہ الجزء المفقود من الجزء الاول من المصنف) از: سید محمد اکرام الحق قادری مصباحی۔
[۲۴] تجلیاتِ امام احمد رضا۔
[۲۵] داستانِ غم یعنی یادِ اختر از ہری (الیکٹرانک ایڈیشن): از مفتی فاروق خاں مہائمی مصباحی
[۲۶] امام احمد رضا اور تصوف: (الیکٹرانک ایڈیشن): از مفتی فاروق خاں مہائمی مصباحی

یہ ۲۶/ کتابوں کی وہ فہرست ہے جو بزمِ فیضانِ رضا کی طرف سے شائع ہو کر مقبولِ عام ہو چکی ہیں، کتابوں کی طباعت و اشاعت و تقسیم کے علاوہ بھی طلبہ کی دیگر سرگرمیاں ہیں، جو قابلِ

تحسین بھی ہیں اور لائقِ تقلید بھی۔ اِن کی تعلیمی سرگرمیوں کا خاکہ ملاحظہ فرمائیں:

❁ دعوتی، فکری اور معلوماتی مضامین سے آراستہ پندرہ روزہ چار جداریے پابندی کے ساتھ منظرِ عام پر لانا۔ اُن کے نام حسب ذیل ہیں:

(۱) المصباح : عربی (۲) خیابانِ حرم : فارسی (۳) پیغامِ ساحلِ ملت : اردو (۴) Edify of Sahil e Millat: انگلش

❁ اساتذۂ کرام کی نگرانی میں ہفتہ واری چار بزموں کا انعقاد۔ یہ کیف آفریں اور روح پرور بزمیں درج ذیل خصوصیات کی حامل ہوتی ہیں۔

[۱] بزموں کا انعقاد بروزِ پنج شنبہ از: صبح ۱۰:۴۵ تا ۱۲:۳۰ چار بڑے ہالوں میں ہوتا ہے۔

[۲] ہر بزم میں چار طلبہ کی خطابت، چار کی نعت خوانی اور چار کی قراءت ہوتی ہے۔ جب کہ چار چار طلبہ مختلف عناوین پر تین تین احادیثِ کریمہ اور دیے گئے مسائلِ فقہیہ حفظ کر کے باحوالہ پیش کر کے دادِ تحسین حاصل کرتے ہیں۔

❁ عقائد و معمولات اور احکامِ فقہیہ پر وقتاً فوقتاً کوئیز کونٹسٹ کرانا۔

❁ نعت و خطابت کی خصوصی مزاولت کے لیے طلبہ کے مابین مسابقۂ نعت و خطابت کرانا۔

❁ اپنے موقر اساتذۂ کرام کے زیرِ سایہ رہ کر ہر سال ایک عظیم الشان محفل بنام ''جشنِ امام احمد رضا'' منعقد کر کے، ملک کے مایۂ ناز علما اور خطبا کو بلا کر اُن کے مقدس ہاتھوں سے مطبوعہ کتاب کی رونمائی کرانا۔

❁ مطبوعہ کتاب کو مدارسِ اسلامیہ کی لائبریریوں، مشائخِ کرام اور ائمۂ مساجد کی بارگاہوں تک مفت پہنچانا۔

❁ تحفظِ ناموسِ رسالت، تشہیرِ مسلکِ اعلیٰ حضرت اور فکرِ امام احمد رضا کی اشاعت کے لیے ٹھوس و مضبوط اقدام کرتے رہنا۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر و ستائش ہے کہ طلبہ، بزم کی سرگرمیوں کے نتیجے میں سال بھر خرچ

ہونے والی رقم کا انتظام واہتمام خود ہی کرتے ہیں، سرمایہ کے بوجھ سے اراکین و منتظمین کی پشتوں کو گراں بار نہیں کرتے۔ اِس بزم پر اعلیٰ حضرت عظیم البرکت کے فیوض و برکات کی برکھا ایسی برس رہی ہے کہ اِنھیں قلتِ سرمایہ کی شکایت کبھی نہیں ہوتی، بلکہ ہر سال بزم کے جملہ اقدامات بحسن و خوبی پایۂ تکمیل تک پہنچ جاتے ہیں، **فالحمد للہ علیٰ ذٰلك**۔

طلبۂ کرام کی پیہم تگ و دو اور مسلسل کاوشیں آج بھی جاری ہیں اور آج بھی یہ نونہالانِ اسلام اپنے خونِ جگر سے ملکی سطح پر علمی و دینی گل بوٹے اگا رہے ہیں۔ اِس سال اِن فیروز بخت نوجوانوں کی جانب سے ایک ساتھ یہ دو کتابیں زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آ رہی ہیں۔

[۱] حجۃ الاسلام حضرت سیدنا امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی کتاب "**المنقذ من الضلال**" کا اردو ترجمہ بنام "اجالوں کا سفر"۔

[۲] ماضی قریب کے زبردست عالمِ دین و مفتی، شارح بخاری حضرت علامہ مفتی محمد شریف الحق امجدی علیہ الرحمہ کی "اشرف السیر"۔

اِن کتابوں کی طباعت و اشاعت یقیناً علمی حلقوں میں اِن طلبۂ محبوبِ سبحانی کی زریں خدمت شمار ہوگی۔ ہمیں یقین ہے کہ جہاں ایک طرف اہلِ علم اِن باذوق و سعادت مند طلبہ کی سراہنا کریں گے اور اِنھیں اِس انتہائی اہم اور کامیاب پیش رفت پر دادِ تحسین سے نوازیں گے وہیں دوسری طرف عوام و خواص اِن کتابوں کے بطن سے نکلنے والے انوار سے مستنیر و مستفید ہوں گے اور اِنھیں خاطر خواہ پزیرائی حاصل ہوگی۔

بڑی ناسپاسی ہوگی اگر میں محبِّ گرامی قدر، پیکرِ اخلاص و وفا، عالمِ نبیل، فاضلِ جلیل حضرت علامہ مفتی محمد فاروق خان صاحب قبلہ مصباحی مہائمی **رفعت معالیہ و بورکت فی ایامہ و لیالیہ**، نائب مفتی ادارہ ہذا کی پیہم کاوشوں اور مسلسل محنتوں کا تذکرہ نہ کروں۔ حضرتِ والا دارلعلوم محبوبِ سبحانی کے لیے یقیناً اللہ ربُّ العزت کی ایک عظیم نعمت ہیں۔ خدائے واحد و قیوم نے موصوف کو غضب کی ذہانت، بلا کی صلاحیت اور مضبوط قوتِ ارادی سے نوازا ہے۔ عالمِ دین تو وہ ہوتا ہے جو علمی وسعت و گہرائی کے ساتھ، حسنِ نیت و جمالِ سیرت سے متصف ہو۔ بحمد اللہ مولانا

موصوف اِن خوبیوں کے حامل ہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ مفتی صاحب کے حوالے کوئی کام کیا گیا ہو اور آپ نے سرعت وخلوص کے ساتھ اُسے تکمیل آشنا نہ کیا ہو۔ اتنی کم عمر میں اِس برق رفتاری کے ساتھ علمی اور معیاری کارنامے سرانجام دینا، اِس دورِ خودغرضی میں، کسی عجوبے سے کم نہیں۔ اگر آپ کی شب خیزی وعرق ریزی نہ ہوتی تو شاید یہ کام بھی اتنی برق رفتاری وخوش اسلوبی کے ساتھ مکمل نہ ہو پاتا۔ حضرت موصوف نے کمالِ دیانت ومہارت اور خلوص وللّٰہیت کے ساتھ اِنھیں گویا کہ ازسرِ نومرتب فرمایا ہے۔ حضرت مفتی صاحب قبلہ کی محنت ومشقت کا صحیح اندازہ اُن کے ''پیش لفظ'' کے مطالعے سے لگایا جا سکے گا، جس میں اُنھوں نے اِن کتابوں پر کیے گئے کام کو بالتفصیل بیان کر دیا ہے۔ کتابیں پڑھنے سے قبل، اِن کے ''پیش لفظ'' کا مطالعہ بڑا مفید وکارآمد ثابت ہوگا۔

دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ''بزمِ فیضانِ رضا'' کے جملہ اراکین ومنتظمین بالخصوص حضرت مولانا مفتی فاروق صاحب قبلہ مصباحی کی اِس کاوش کو مقبولیت کا جوہر بخش کر اِنھیں وہ جزاعطا فرمائے جو اُس کی شانِ کریمی کے لائق ہو، مستقبل میں بھی اِن حضرات کو، مشائخِ کرام کی قلمی خدمات کو متعارف کرانے کی توفیق مرحمت فرمائے اور دینی کتب ورسائل کی اشاعت وترسیل کے لیے اِن کی عقل وفکر کو دوآتشہ بنائے! آمین

بجاہ حبیبہ سید المرسلین وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ سیدنا مولانا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ وبارک وسلم

از: خاکسار

سید محمد اکرام الحق قادری مصباحی عفی عنہ
صدرالمدرسین: دارالعلوم محبوبِ سبحانی، کرلا ویسٹ، ممبئی ۷۰
E-mail:smikram786@gmail.com

۵؍ربیع الآخر ۱۴۴۱ھ
۴؍دسمبر؍ ۲۰۱۹ء
فون:9029249679

تقریظ جلیل

نائب شارح بخاری، ماہر سراجی حضرت **مفتی نسیم احمد مصباحی** دام ظلہ

استاد و مفتی جامعہ اشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ

شارحِ بخاری حضرت علامہ مفتی محمد شریف الحق امجدی دی علیہ الرحمۃ والرضوان ایک عظیم مفتی ہونے کے ساتھ ساتھ بلند پایا محدث اور مختلف موضوعات پر متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔

ان تمام مصروفیات کے ساتھ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت طیبہ لکھنے کا کام بھی آپ نے شروع فرمایا تھا، جس کا کچھ حصہ محرم ۱۳۸۸ھ مطابق اپریل ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا تھا، مگر کچھ نامساعد حالات پیدا ہو گئے تھے جس کی وجہ سے یہ تصنیفی کام بند ہو گیا، جشن تکمیلِ بخاری کے موقع پر آپ کی تمام تصانیف دوبارہ طبع ہو رہی تھیں، اسی لیے بعض حضرات نے ''اشرف السیر'' کے بھی طبع کرانے کا مطالبہ کیا، اُسی زمانے میں حضرت کی الماری سے ''اشرف السیر'' کے غیر مطبوعہ کچھ اور اجزاء مجھے ملے، میں نے حضرت کی خدمت میں پیش کیا، حضور والا اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے، مجھے دعائیں بھی دیں اور اُسے بھی شامل کرنے کا حکم دیا، میں نے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ دونوں اجزا کی از سرِ نو کتابت کروائی، اُن کی تصحیح کی اور دہلی لے جا کر طباعت کروائی؛ اس طرح یہ کتابت اور خوب صورت ٹائٹل کے ساتھ دوبارہ منظر عام آئی۔

ہمیں یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ ہمارے عزیزان مولانا سید اکرام الحق قادری مصباحی اور مفتی فاروق خاں مصباحی - زید مجدہما - کی کوشش سے دار العلوم محبوب سبحانی، کرلا، ممبئی، مہاراشٹر کے طلبہ اس کتاب کو پھر سے شائع کر رہے ہیں، میں اِن طلبہ کو ان کے اس نیک کام پر مبارک دیتا ہوں اور ان کے لیے دعا کرتا ہوں کہ اللہ عزوجل انھیں علمِ نافع عطا فرمائے اور حضور شارحِ بخاری کے فیوض و برکات سے انھیں مالا مال فرمائے۔

۹ ربیع الآخر ۱۴۴۱ھ — خاک پائے شارحِ بخاری

۷ دسمبر ۲۰۱۹ء — محمد نسیم مصباحی

خادم التدریس والافتاء بالجامعۃ الاشرفیۃ، مبارک فور

نذرانۂ عبدیت

الہ العالمین!

ایک بندۂ بے مایہ،
تیری بارگاہ میں،
تیرے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذکر پاک کی نذر لے کر،
حاضر ہے۔
آس و یاس کی کش مکش سے دل دھڑک رہا ہے۔
آنکھیں پرنم ہیں،
مگر پھر بھی تیرے کرم سے قبول کی امید ہے۔

وَاَنْتَ لِمَا اَمَّلْتُ فِيْكَ جَدِيْرُ
بر من منگر بر کرم خویش نگر

بندۂ عاجز
محمد شریف الحق امجدی
۲۷ محرم الحرام ۱۳۸۸ھ
یوم جمعہ

دیباچہ طبع اوّل

اردو میں سیرتِ پاک پر مبسوط اور مختصر ہر قسم کی متعدد کتابیں موجود ہوتے ہوئے بھی اس کتاب کی ضرورت تھی یا نہیں اس کتاب کو پڑھنے کے بعد یہ فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔ سیرتِ پاک پر ایک مبسوط کتاب لکھنے کے لیے جتنا سکون اور وقت درکار ہے وہ مجھے میسر نہ آسکا، اس لیے میں خود اپنے ذوق کے مطابق اسے مکمل اور آراستہ نہ کرسکا، اطمینانِ خاطر کے انتظار میں برسہا برس گزر گئے، آخر مایوس ہوکر جس حال میں تھا اسی حال میں لکھتا گیا، میری منتشر معلومات کا مجموعہ ناظرین کے سامنے ہے۔

وقت کی ایک اہم ضرورت پوری کرنے میں کس حد تک میں کامیاب ہوا یہ میں نہیں جانتا لیکن پھر بھی میں اپنی جگہ مطمئن ہوں۔

ع

شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم

اس کتاب کی چار جلدیں ہیں اور ہر جلد تقریباً ڈھائی سو صفحات کی ہے۔ آپ کے ہاتھوں میں اس کا ابتدائی حصہ ہے، سرمائے کی کمی کی وجہ سے پوری جلد نہیں چھپ سکی۔ اگر ناظرین کا تعاون میرے شاملِ حال رہا تو بہت جلد بقیہ جلدیں منظرِ عام پر آجائیں گی۔

بھول چوک انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ ناظرین کو اگر کہیں کوئی غلطی ملے تو براہ کرم مجھے مطلع کریں۔

۲۷/محرم الحرام ۱۳۸۸ھ
۲۶/اپریل ۱۹۶۸ء
جمعہ

محمد شریف الحق امجدی
جامعہ عربیہ انوار القرآن،
بلرام پور، ضلع گونڈہ

دیباچہ طبع ثانی

''اشرف السیر'' کا ابتدائی کچھ حصہ ۲۷؍محرم الحرام ۱۳۸۸ھ مطابق ۲۶؍ اپریل ۱۹۶۸ء کو ۳۲؍سال پہلے انتہائی نامساعد حالات میں چھپا تھا اور اب تکمیل شرحِ بخاری کی تقریب کے موقع پر احباب کے اصرارِ بے حد پر، دوبارہ پریس بھیج رہا ہوں۔

نظر ثانی کرتے وقت بہت سے ابحاث کا اضافہ ضروری محسوس ہوا، مگر وقت کی قلت کی وجہ سے یہ اضافے نہ ہو سکے، البتہ کہیں کہیں معمولی ترمیم یا کچھ زیادتی کر دی گئی ہے۔

''اشرف السیر'' کی تکمیل یقیناً آج کل کے حالات کے پیش نظر ضروری ہے، لیکن اب میرے سارے قویٰ جواب دے چکے ہیں، اس لیے اب معذور ہوں۔

اللہ عزوجل کسی کو توفیق عطا فرمائے، وہ اسے مکمل کر دیں تو مجھ پر اور مسلمانوں پر بہت بڑا احسان ہوگا۔

۹؍صفر ۱۴۲۰ھ — محمد شریف الحق امجدی

۲۵؍مئی ۱۹۹۹ء — جامعہ اشرفیہ، مبارک پور

پیشِ لفظ

مولانا یٰسٓ اختر مصباحی

اردو زبان میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کا مبسوط و مستند ذخیرہ جمع کرنے اور تحقیقی و مفصل کتاب لکھنے کی نیت سے شارح بخاری نے آج سے تقریباً ۳۵ رسال پہلے ''**اشرف السیر**'' کے نام سے اپنے کام کا آغاز کیا۔ اچھا خاصا ابتدائی مواد بھی جمع ہو گیا، مگر حالات نے اجازت نہ دی کہ آپ اس عظیم و جلیل خدمت کا سلسلہ جاری رکھ سکیں۔

جلد اول کا صرف نصف حصہ دو سو بتیس ۲۳۲ رصفحات پر مشتمل ہے۔ جو قسطِ اول کے طور پر ۱۹۶۸ء میں شائع ہو سکا، لیکن جتنا جو کچھ شائع ہو سکا ہے، وہی اس حقیقت کا غماز ہے کہ اگر ''**اشرف السیر**'' کی تکمیل ہو جائے تو ''**نزہۃ القاری**'' کی طرح اسے بھی قبول عام کا درجہ مل جائے گا۔

عزیزِ گرامی قدر مولانا عبدالحق رضوی نے خوش خبری سنائی ہے کہ نو جلدوں میں ''نزہۃ القاری شرح بخاری'' کا کام چوں کہ مکمل ہو چکا ہے، اس لیے اب حضرت شارحِ بخاری مدظلہ العالی ''**اشرف السیر**'' کی تکمیل میں کچھ ہی دنوں بعد ہمہ تن مصروف ہونے والے ہیں۔

''**اشرف السیر**'' کا اسلوبِ تحریر اور اندازِ ترتیب نہایت فاضلانہ و مؤرخانہ ہے اور محققانہ بھی، علمِ راسخ اور عشقِ رسول کی، سطر سطر میں آمیزش ہے۔ کتاب کی تمہید میں سیرت نگاری کی ابتدا اور اس کی ترقی، قدیم سیرت نگار اور جدید مؤرخین، مستشرقین کے مہمل اعتراضات سے مرعوب جدید مصنفین اور ان کا کردار اور ان سب کی روشنی میں سیرت النبی کے موضوع پر اردو زبان میں ایک جامع اشرف السیر کی ترتیب زیرِ نظر ''**اشرف السیر**'' کا سببِ تالیف ہے۔

شارحِ بخاری نے تحریر کیا ہے کہ

''**محمد بن اسحاق، محمد بن عمر واقدی، محمد بن سعد، محب الدین ابن جریر طبری**''

یہ سیرت کے قدیم مؤرخین ہیں اور سیرت پر ترتیب دی ہوئی ان کی کتابیں سیر و مغازی کی بنیاد ہیں، جو سارے عالمِ اسلام کے اندر معروف و مشہور ہیں۔

مذکورہ حضرات پر کچھ لوگوں نے نقد و جرح کی جو روایتیں نقل کی ہیں، اُن کا شارحِ بخاری نے مفصّل جواب دے کر انھیں ثقہ، عادل معتمد قرار دیا ہے اور شکوک وشبہات کے مصنوعی گھروندے کو خود اپنی اپنی نقد و جرح کے ذریعے بکھیر دیا ہے، ضعیف اور موضوع کا فرق بتلا کر نقلی و عقلی دلائل سے ثابت کیا ہے کہ سیر و مغازی میں ''موضوع'' کے علاوہ ہر قسم کی روایت مقبول ہے۔ پھر اصطلاحِ حدیث کی کچھ تفصیلات درج کی ہیں، بحث کے آخر میں تحریر فرماتے ہیں:

①

سیر و مغازی فضائل و مناقب کے وہ ابواب جو قطعی نہیں، اُن میں موضوع کے علاوہ ہر حدیث و روایت مستند ہے، اسی پر تمام امت اور علماے سیر و مغازی کا عمل ہے۔

②

عقائد و احکام میں البتہ موضوعات کے ساتھ ضعاف بھی غیر معتمد ہیں، اگرچہ وہ سیر و فضائل کا جز ہوں۔

③

جب تک علماے معتمدین و محتاطین - جن پر امت کو اطمینان ہے - یہ تصریح نہ کریں کہ یہ حدیث موضوع یا ضعیف ہے، کسی غیر محتاط متغالی کے موضوع کہہ دینے سے حدیث موضوع نہ ہوگی۔

④

کسی حدیث یا روایت پر کسی محدّث کا طعن، اس کے ساقطُ الاعتبار ہونے کے لیے کافی نہیں، جب تک کہ اس کی مکمل چھان بین نہ ہو جائے۔

⑤

''لا یصیح - لا یثبت - صحیح نہیں - ثابت نہیں - مجہول ہے - شاذ ہے - منکر ہے - منقطع ہے - مرسل ہے - مدلس ہے - معضل ہے - مضطرب ہے - مدرج ہے - معلل ہے - غریب ہے۔''
اِس قسم کی جرحیں سیر و مغازی فضائل و مناقب مستند ہونے میں مخل نہیں؛ بلکہ ان میں سے بعض احکام میں بھی معتمد ہیں۔

⑥

ہاں! تعارض کے وقت کتاب اللہ، پھر احادیثِ صحاح [و] حسان کو ہمیشہ ترجیح ہوگی۔

روایتِ مقبولہ کے ہوتے ہوئے محض اپنی رائے اور قیاس سے مزاحم ہونے کی وجہ سے کسی مروی کو رد نہیں کیا جا سکتا، ہماری عقل خواہ کتنا ہی ابا[وانکار] کرے۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نسب نامہ بیان کر کے، شارحِ بخاری لکھتے ہیں:

''عدنان تک سلسلۂ نسب متفق علیہ ہے، اسی لیے علماے محتاطین نے اس پر اکتفا فرمایا، خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنا نسب نامہ عدنان تک بیان فرما کر خاموش ہو جاتے۔ حضرتِ عمر فرماتے ہیں کہ مجھے کوئی ایسا نہیں ملتا جو عدنان کے آگے سلسلۂ نسب جانتا ہو۔

علماے انساب کا اس پر اتفاق ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آبا و اجداد میں عدنان کے آگے حضرت اسماعیل، حضرت ابراہیم، حضرت نوح، حضرت ادریس، حضرت شیث بالضرور ہیں۔''

حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل کی مکۂ مکرمہ میں تشریف آوری، بنی جرہم کی آمد، خانۂ کعبہ کی تعمیر، حضرت اسماعیل کی سکونت کے بیان کے بعد اس امر کی تفصیلی تحقیق کی کہ حضرت اسماعیل ہی ذبیح اللہ ہیں۔

قبائلِ عرب اور ان کی مختلف شاخوں کا بھی ذکر ہے، عہد عبد المطلب میں چاہِ زم زم کی دو بارہ کھدائی اور حضرت عبد اللہ کی ولادت اور اس کے متعلق واقعات ہیں۔ سنت ابراہیم کی تجدید، حضرت آمنہ سے حضرت عبد اللہ کا نکاح، اصحابِ فیل کی تباہی، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادتِ طیبہ اور رضاعت، پھر کتاب کے آخر میں والدین کریمین کے بارے میں اس بات کا مستند ثبوت کہ وہ اور ان کے آبائے کرام کفر و شرک اور ہر طرح کی بدکاری اور بے حیائی سے پاک تھے، اپنے زمانہ کے افضل ترین لوگ تھے، صاحب اسلام تھے۔

''**خورشیدِ رسالت کا طلوع**'' کے عنوان سے شارحِ بخاری نے جس والہانہ انداز سے ولادتِ طیبہ کے احوال و واقعات کا آغاز کیا ہے، اسی پر اِن سطور کا اختتام کیا جا رہا ہے، یہ اقتباس ایک ادبی شہ پارہ بھی ہے:

'' آج بہارِ خلد وادیِ تہامہ میں اتر آئی ہے،
آسمان اپنی انجمن کے ساتھ دولت سرائے آمنہ پر جھکا آ رہا ہے،
مہتاب وسطِ آسمان پر فضاے بسیط پر اپنی نقرئی چاندنی تانے ہوئے ہے،

آفتاب بڑی تیزی سے افقِ مکہ کی طرف بڑھ رہا ہے،
جبریلِ امین ملاء اعلیٰ کے نورانی انفاس کی فوج درفوج جِلو میں لے کر دست بستہ کاشانۂ عبداللہ پر کھڑے ہیں،
کارکنانِ قضاوقدر چشم براہ ہیں،
ملکۂ مصر آسیہ، کنواری بتول مریم، حورانِ بہشت کے ساتھ خلوت کدۂ آمنہ میں حاضر ہیں
کیوں؟
اس لیے کہ نورِ ازل کا آئینۂ جمال وکمال،
قادرِ مطلق کا مظہر ذات وصفات،
ربُّ العالمین کا خلیفۂ اعظم،
خالقِ کونین کا نائب اکبر،
خزائن السماوات والارض کا مالک،
نعمہائے الٰہیہ کا قاسم،
ملکوت وملک کا تاجدار،
بحر وبر کا مختار،
سید المرسلین، خاتم النبین،
رحمت اللعالمین، شفیع المذنبین،
دعائے خلیل، تمنائے کلیم، بشارتِ مسیح،
جگر گوشۂ عبداللہ، نور دیدۂ آمنہ،
رونق افزائے عالم شہود ہونے والا ہے۔

۲ ربیع النور ۱۴۲۰ھ

یٰس اختر مصباحی
بانی دارالقلم، نئی دہلی
مدیر ماہ نامہ کنزالایمان، نئی دہلی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الۡمَجِیۡدِ الۡاَمۡجَدِ الۡعَلِیِّ الۡاَعۡلٰی وَ الصَّلَاۃُ وَ السَّلَامُ عَلٰی اَحۡمَدَ رِضًا سَیِّدِنَا مُحَمَّدِنِ الۡمُصۡطَفٰی وَ عَلٰی اٰلِہٖ سَفِیۡنَۃِ النَّجَاۃِ وَ صَحۡبِہٖ نُجُوۡمِ الۡھُدٰی

عقل اگر انسان کا جوہر کامل اور مکمل ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر انسان اپنی عقل کے کمال کو دوسرے قوائے بہیمیہ پر غالب رکھے تو پھر انسان کہیں بھٹک نہیں سکتا ہے اور نہ ٹھوکر کھا سکتا ہے۔ مگر افسوس یہی ہے کہ انسان کا یہ جوہرِ اعلیٰ اس کے دوسرے قویٰ کی شہواتِ بد سے اکثر دب جاتا ہے اور اس کا جوہرِ ذاتی مغلوب ہو کر بالکل ناکارہ ہو جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ عقل جو انسان کو مدارجِ ترقی طے کرانے کا آلۂ کامیاب تھی، اس کی تباہی و بربادی کا زبردست وسیلہ ہو جاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ دنیا میں جو بھی خرابی پیدا ہوئی یا ہوتی ہے یا ہوگی وہ سب کی سب اسی عقل مغلوب کی رہینِ منت ہے۔ انسان نے جب کبھی ٹھوکر کھائی تو اسی وجہ سے کہ اس کی عقل کے کمال میں کمی یا کجی تھی۔

یہی عقل مغلوبہ تھی، جس نے نمرود کو بابل کی حکومت پر خدائی کا دعویٰ کرنا سکھایا تھا۔

یہی عقل مغلوبہ تھی، جس نے مصر کے جاہ و حشم کو اپنی مٹھی میں دیکھ کر فرعون کو انا ربکم الاعلیٰ کہنے پر ابھارا تھا۔

یہی عقل مغلوبہ تھی، جس نے سامری کو سونے چاندی کے مجسمے میں بچھڑے کی طرح بولنے کی قوت پیدا کرنے کا طریقہ سکھایا تھا۔

یہی عقل مغلوبہ تھی، جس نے یہودیوں کو حضرت عزیر علیہ السلام پر اور عیسائیوں کو حضرت مسیح پر ''ابن اللہ'' ہونے کا فریب دیا تھا۔

یہی عقل مغلوبہ تھی، جس نے توریت و انجیل کو مسخ کرایا اور انسان کی پیشانی کو معبود برحق کی بارگاہ سے ہٹا کر صلیب اور بت کے سامنے جھکایا۔

قدرت کا فضل

اس لیے ضرورت تھی کہ انسان کے اس جوہر اعلیٰ کی حفاظت کے لیے بھی اور تکمیلِ تربیت کے لیے بھی کوئی ایسا انتظام ہوتا کہ قوائے بہیمیہ اس کے علو میں انحطاط اور کمال میں زوال نہ پیدا کرسکیں اور نہ اس کی ترقی میں سدّ راہ ہوسکیں۔

انسان اگر خود انتظام کرتا تو خطرہ تھا کہ کہیں اس میں بھی قوائے بہیمیہ نے اپنے دخیل ہونے کی گنجائش باقی رکھی ہو؛ اس لیے اس ذاتِ ارحم الراحمین، کریم و جواد نے خود اپنے فضل و کرم سے اپنی عطا فرمودہ اس نعمت عظمیٰ کی حفاظت کے لیے، اس کی اصطلاح و تربیت کے لیے، اپنے اُن بندگانِ خاص کو مبعوث فرمایا جو شکل میں انسان ہی کے ہوتے ہیں، کھاتے بھی ہیں، پیتے بھی ہیں، بازاروں میں چلتے پھرتے بھی ہیں، مگر حقیقت میں اُن کا حریم اس قدر بلند ہے جہاں مَلَکِ مقرَّب کی بھی رسائی نہیں ہوتی۔ جن کا ایک تعلق ہم سے اور تم سے ہوتا ہے اور ایک تعلق اس ذاتِ مالک المُلک سے ہوتا ہے جن کی عقل کے کمال پر ذاتِ بخت کی تجلیاں پرتو افگن ہوتی ہیں، اور اس کے غلبے کو اس کا جبروت فیض بخش ہوتا ہے۔ دوسرے قویٰ ہوتے تو ضرور ہیں، مگر ان کی فعّالی قوت کے تمام ارادے محکوم اور معصوم ہوتے ہیں، **انھی نفوس قدسیہ کو زبان شرع میں انبیا کہا جاتا ہے۔**

علی سیدھم و علیھم الصلاۃ السلام

انبیاے سابقین

اگلے انبیا علیہم السلام کی بعثت اور ان کی کتاب و حکمت کا تعلق کسی مخصوص قوم سے ہوا کرتا تھا؛ اس لیے ان کی تعلیم میں اس قوم کی خصوصیات کے لحاظ سے کچھ مخصوص جوہر کی تابش ہوا کرتی تھی اور ان کی میعاد بھی زمانے کے اعتبار سے بھی اور مکان کے اعتبار سے بھی محدود ہوا کرتی تھی، یہی سبب ہے کہ علاحدہ علاحدہ خطۂ زمین کے لیے علاحدہ علاحدہ پیغمبر کی حاجت ہوئی۔

چناں چہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ حضرت لوط علیہ السلام کے ہوتے ہوئے بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا حلم و رحمت سایۂ گستر تھا اور حضرت شعیب علیہ السلام کے زمانے ہی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جلال و جبروت کی ضرورت ہوئی اور پھر جب یہ تشریف لے گئے تو حضرت سلیمان و

داؤد کی خلافت اور حضرت روح اللہ کی مسیحائی کی دنیا محتاج ہوگئی۔ علیہم الصلاۃ والسلام

ایک جامع کامل کی ضرورت

یہ تمام آنے والے آئے اور چلے گئے، کیوں کہ یہ اسی لیے آئے تھے کہ اپنے کام کی تکمیل کے بعد چلے جائیں، یہ بھی تشریف لے گئے اور ان کے ساتھ ہی ان کی تعلیمات بھی منسوخ ہوگئیں؛ مگر ابھی نہ زمین فنا ہوئی تھی اور نہ اس کے بسنے والے، اور نہ ان کے روحانی اور جسمانی حوائج منقطع ہوئے تھے۔ اور جس طرح دنیا کو اللہ کی زمین اور اس کے لامتناہی خزائن اس کے آسمان اور اس کے شمس وقمر کی احتیاج باقی تھی، اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ اللہ کے نبی اللہ کی کتاب اور اس کی تعلیم وحکمت کی حاجت تھی؛ مگر اب دنیا محض نوح ویونس علیہما السلام کی عبادت وشکر پر قانع نہیں رہ سکتی تھی؛ کیوں کہ وہ اب ابراہیم کے حلم ورافت سے بھی لذت آشنا ہو چکی تھی۔ اب صرف یعقوب و یوسف علیہما السلام کا صبر وصداقت حسن ومحبت دنیا کو اپنی طرف مائل نہیں رکھ سکتا تھا؛ [کیوں] کہ وہ داؤد وسلیمان علیہما السلام کی خلافت کے جاہ وحشم بھی دیکھ چکی ہے۔ اب صرف موسیٰ کا جاہ وجلال دلوں کو نرم نہیں رکھ سکتا تھا؛ کیوں کہ وہ حضرت مسیح کے عفو وصفح، زہد وورع، کی مومیائی سے بھی لذت یاب ہو چکی ہے۔ اس لیے یہ تمام عالمِ کون وفساد بے چین تھا۔ اس کامل ہستی اور جامع وُجود کے لیے جو زیبِ تخت وتاج ہونے کے ساتھ ہی ساتھ زینتِ سجادۂ خلوت بھی ہو، جس کے عفو ورحمت میں تمام عالم پناہ لے، اور جلال وہیبت سے قیصر وکسری اپنے محل میں لرز اٹھیں، جن کا عفو وصفح عام ہو اور جلال وجبروت ہیبت آگیں، جو 'رحمۃ للعالمین' بھی ہوا اور 'اشد علی الکفار ورحماء بینھم' بھی ہو، جس کی نظرِ رحمت حیات بخش بھی ہو اور نگاہِ قہر جانستاں بھی ہو۔ **اسی ذاتِ کامل کا نام ہے محمد مصطفیٰ اسی وجودِ جامع کو کہتے ہیں احمد مجتبیٰ**۔ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تسلیما کثیرا کثیرا

سیرت کی ضرورت اور اس کی تالیف

چوں کہ اس جامع اکمل کی رسالت کا تعلق نہ صرف مخصوص لوگوں سے تھا اور نہ اس کی تعلیم کی میعاد محدود تھی؛ بلکہ [وہ] تمام عالم کے لیے سب سے آخری مقتدا تھا اور اس کی تعلیم بھی قیامت تک کے لیے غیر متبدل اور غیر مختتم قانون تھی، اس لیے خود اس ہادیِ کامل نے اپنے حلقہ بگوشوں پر

تمام فرائض سے اہم یہ فرض مقرر فرمایا کہ وہ کتاب اللہ کے ساتھ ہی ساتھ اُن کے اقوال کے ایک ایک حرف کا، اُن کے افعال کی ہر ہر ادا کا، اس کے حلیۂ وجود کے ہر ہر نقش ونگار کا ایک کامل سراپا تیار کریں، جو اس کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد بھی مینارۂ رشد وہدایت ہو۔

صحابۂ کرام نے، پھر تابعین اور تبع تابعین نے، پھر علماے ملت نے اپنے اس فرض کو جس حسن وکمال کے ساتھ انجام دیا، وہ اتنا عظیم الشان ہے کہ جس پر آج کا ترقی یافتہ دور بھی انگشت بدنداں ہے۔

سیرت نگاری کی ابتدا اور اس کی ترقی

احادیثِ کریمہ کے قلم بند کرنے کی داغ بیل تو عہدِ رسالت ہی میں پڑ چکی تھی، اس سلسلے میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی جمع فرمودہ احادیث خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ خطیب کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی کچھ احادیث قلم بند کی تھیں۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے عہدِ صحابہ میں اس پر کوئی ترقی نہیں ہوئی، احادیث کی اشاعت اگرچہ پورے اہتمام سے ہوئی، مگر اس کا ذریعہ صرف زبانی روایت ہی تھا۔

عہد تابعین میں سیدنا عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے احادیث کی تدوین کا کام بلند پیمانے پر شروع فرمایا۔ ابوبکر بن محمد بن عمر بن حزم انصاری اور سعد بن ابراہیم کو خاص طریقہ سے اس خدمت پر مقرر فرمایا۔ ان دونوں بزرگوں نے اس قابلِ فخر خدمت کو بڑی عمدگی سے انجام دیا، دفتر کی دفتر احادیث جمع کیں۔

عہدِ صحابہ میں عام احادیثِ کریمہ کی طرح واقعات سیر بھی سینہ بہ سینہ محفوظ تھے۔ یہ فخر بھی عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی قسمت میں تھا کہ انھوں نے سیر کی بھی اشاعت کا مخصوص اہتمام کیا۔ عاصم بن قتادہ انصاری کو غزواتِ نبی کے درس پر متعین فرمایا۔ انھی کے عہد میں محمد مسلم بن شہاب زہری نے سیرت کی تدوین کا افتتاح کیا، انھوں نے اس فن میں ایک مستقل کتاب لکھی اور خاص توجہ سے اس فن کی اشاعت میں مصروف رہے۔

یہ ابن شہاب زہری ہی کی برکت ہے کہ موسیٰ بن عقبہ اور محمد بن اسحاق جیسے امام پیدا ہو

ئے، جنھوں نے اس فن میں وہی درجہ حاصل کیا جو فنِ حدیث میں امام بخاری اور مسلم کا ہے۔ پھر ابن ہشام، امام واقدی اور ان کے تلمیذِ جلیل ابن سعد اور ابن جریر طبری جیسے کاملِ فن ائمۂ سیر نے اس فن کی جو عظیم الشان اشاعت کی وہ انھی اجلۂ ائمہ کا حصہ تھا۔ چناں چہ آج یہ امر مسلم ہے کہ سیرت پر اگر چہ سیکڑوں کتابیں مدون ہوئیں، مگر وہ سب کی سب انھی ائمہ کی تصنیفات سے ماخوذ ہیں۔

سیرتِ پاک کے ساتھ مسلمانوں کے ایمان کو جو وابستگی تھی اس کی وجہ سے مسلمانوں نے اس کی جتنی مہتم بالشان اشاعت کی، اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ آج بھی - جب کہ مسلمان اپنا سب کچھ کھو چکے ہیں - ان کے پاس سیرت کا اتنا بڑا ذخیرہ موجود ہے جس پر تمام دنیا کی قومیں رشک کر رہی ہیں، اور اس کی بقا اور دوام کا ایسا مکمل انتظام ہے کہ قیامت تک کوئی اسے فنا نہیں کر سکتا۔

سیرت پاک اور یوروپ

اسی صاحبِ سیرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فضل و تربیت کے سائے میں مسلمانوں نے جب اپنا قدم آگے بڑھایا تو ان کے قدم میں وہ ثبات اور سرعت تھی کہ دنیا کی کوئی طاقت ان کی سَدِّ راہ نہ ہو سکی۔ کسریٰ مزاحم ہوا تو وہ ٹکڑے ٹکڑے ہوا، قیصر مقابل ہوا تو اسے بھی سامنے سے بھاگنے ہی میں اپنی نجات نظر آئی اور چند ہی دنوں میں دنیا کی تمام قوموں کو اسلام ہی کی آغوشِ رحمت میں اطمینان کی زندگی نصیب ہوئی۔ دنیا کے جس حصے تک مسلمانوں نے اپنے آپ کو پہنچایا، وہاں کے بسنے والوں نے ان کو جانا اور پہچانا اور ان کے وجود کی قدر کی۔ مگر وہ لوگ جو اپنی بدقسمتی سے مسلمانوں کے سایۂ رحمت سے محروم رہے۔ وہ گھروں میں بیٹھے بیٹھے اپنے قِسِّیسِین [پادریوں] اور رہبانوں کی زبانوں سے مسلمان کے متعلق عجیب و غریب کچھ وحشیانہ اور کچھ احمقانہ قصے سنتے رہے۔ انھوں نے مسلمانوں کو تو نہیں جانا، البتہ ان کے مخترعہ عجیب وجود سے باخبر ہوئے، انھی بدقسمتوں میں سے یوروپ بھی تھا۔

یوروپ نے مسلمانوں کو کیا سمجھا تھا۔ اسے ہنری وی کاستری فرانسی کی زبان سے سنیے:

''ہر مسیح شاعر مسلمانوں کو مشرک اور بت پرست سمجھتا تھا اور حسبِ ترتیبِ درجات ان کے تین خدا تسلیم کیے جاتے تھے:

'باہوم' یا 'ماہوم' یا 'مافومیڈ' (یعنی محامڈ)

اور دوسرا 'اپلین'،

اور تیسرا 'ٹرگامان'۔

ان کا خیال تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) نے اپنے مذہب کی بنیاد دعویٰ الوہیت پر قائم کی، اور سب سے عجیب تر یہ ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) - وہ محمد جو بت شکن اور دشمنِ اصنام تھا - لوگوں کو اپنے طلائی بت کی پرستش کی دعوت دیتا تھا۔'' (سیرت، ص:۸۱)

جب سترہویں صدی کے قرونِ وسطیٰ سے یورپ نے نئی کروٹ لی اور کچھ زمانے کے بعد اپنے قِسِّیْسِیْن [عیسائی علما] اور رہبانیین کے پنجے سے نجات حاصل کی۔ اور آزاد ہو کر اسلام اور بانی اسلام کے حالات خود اہلِ اسلام کی زبانی سنا تو ان کو خود بھی اپنے اگلوں کے ان بے بنیاد توہمات پر حیرت ہوئی؛ لیکن مذہب کا تعصب ایسا بینا نہ تھا کہ انھیں واقعات کی صحیح شکلیں نظر آجاتیں۔ انھوں نے بھی اگلی ذہنیت کے ماتحت جب اسلام کی صحیح تاریخ پڑھی تو ان کو بھی اس سے کچھ کم نہ سوجھا جو ان کے اگلوں کو سوجھا تھا۔ ان واقعی باتوں کا اعتراف ہنری وی کاستری کو خود بھی ہے، چناں چہ لکھتا ہے:

''وہ تمام قصص اور گیت جو اسلام کے متعلق یوروپ میں قرونِ وسطیٰ میں رائج تھے، ہم نہیں سمجھتے کہ مسلمان ان کو سن کر کیا کہیں گے، یہ تمام داستانیں اور نظمیں مسلمانوں کے مذہب کی ناواقفیت کی وجہ سے بغض وعداوت سے بھری ہوئی ہیں۔ جو غلطیاں اور بدگمانیاں اسلام کے متعلق آج تک قائم ہیں، ان کا باعث وہی قدیم معلومات ہیں۔''

(سیرت، ص۱۸)

اسی مسموم ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ وہ اوصاف جو انسانیت کے لیے باعث کمال ہیں، جب اسلام اور بانیِ اسلام میں انھیں نظر آئے تو اسلام کے کامل مذہب ہونے کے بجائے، جوشِ تعصب میں الٹے ان سے بانیِ اسلام کے عیوب کی فہرست تیار کرتے ہیں۔

شبلی صاحب تو شبلی صاحب، اگر تمام دنیا ان متعصبین کو معذور رکھنے پر مصر ہو تو بھی ہم معذور نہیں سمجھ سکتے۔ مدعی کا بینا ہوتے ہوئے آفتاب کو داغ دار بتانا لائق درگزر نہیں ہوسکتا۔ یو روپ کے مستشرقین کا یہ جرم ایسا جرم ہے جو قیامت تک ان کے فہم و دانش پر بدنما دھبہ بن کر رہے گا۔

یوروپ کی کدورت دنیائے اسلام میں

یوروپ کی اس گندگی کی رَو ایسی سست نہ تھی جسے وہ مسلمان روک سکتے تھے جنھیں صدیوں کا عیش و تنعم تھپکیاں دے رہا تھا۔ اس طوفان کا رخ جب غافل مسلمانوں کی طرف ہوا تو دیکھتے ہی دیکھتے مسلمان اس طرح بہہ گئے جیسے زمین پر پڑے ہوئے تنکے۔ حکومت چلی گئی تھی۔

واقعہ یہ ہے کے یہ نقصان بھی نا قابل برداشت تھا، مگر ہمارے قلب کی ایک ایک دھڑکن ٹیس بن کر ہمارے رگ و ریشے میں پیوست ہو رہی ہے، جب ہم یہ دیکھنے کے لیے زندہ ہیں کہ ہمارے مذہبی عمران [تہذیب و تمدن] کو یوروپ کا مکر و کید خود ہمارے ہی ہاتھوں ہمارے ہی مہیا کردہ اسباب سے تباہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

سیرت کی نئی تصنیفات

یوروپین مؤرخین نے سیرت نبوی پر جو اعتراضات کیے ہیں،

وہ حسب ذیل ہیں:

۞ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی مکۂ معظّمہ تک پیغمبرانہ تھی؛ لیکن مدینہ جا کر جب زور اور قوت حاصل ہوئی تو دفعتاً بادشاہی سے بدل گئی جس کی دلیل لوازم بادشاہی، لشکر کشی، خوں ریزی، انتقام وغیرہ ہیں۔

۞ دنیاداروں کی سی حکمت عملی اور بہانہ جوئی۔

۞ مذہب کی اشاعت پر جبر و قہر۔

۞ لونڈی، غلام بنانے کی اجازت اور اس پر عمل۔

۞ کثرتِ ازواج۔

ان اعتراضات کی مستشرقین نے جو کریہہ تصویر کھینچی ہیں وہ صرف ایک مسلمان کے لیے ہی ناقابلِ برداشت نہیں، بلکہ ہر انصاف پسند محقق کی نظر میں قابل نفریں ہے۔ یوروپ کی ایسی کتابوں کے مطالعے کے بعد بعض لوگوں نے بنام مسلمان سیرت پر قلم اٹھایا اور اپنا مطمحِ نظر سب سے زیادہ مستشرقین کے ان اعتراضات کا دنداں شکن جواب دینا بتایا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ملت کا ایک اہم فریضہ تھا، اس طرف جو قدم بھی اٹھایا جاتا، وہ آنکھوں سے لگانے کے قابل تھا۔ لیکن ہمیں افسوس اس امر کا ہے کہ ان اعتراضات کے جواب دینے والے جواب دیتے وقت اس قدر مرعوب ہو جاتے ہیں کہ بجائے جواب دینے کے مسلم الثبوت واقعاتِ سیر کا سرے سے انکار کر دیتے ہیں؛ بلکہ کہیں کہیں ایسے بے اختیار یا بدحواس ہو جاتے ہیں کہ ان کی تحقیقات کی رَوْ میں سارے فن سیرت کی بنیاد کھوکھلی ہو جاتی ہے، جس کی بکثرت مثالیں اپنے مواقع میں ملیں گی، یہاں صرف دو مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں:

۞ بحیرا راہب کا واقعہ کتبِ سیر کے علاوہ صحاحِ ستہ کی کتابوں میں بھی موجود ہے کہ حضور ﷺ جب ابو طالب کے ساتھ ''شام'' کو بغرضِ تجارت تشریف لے جا رہے تھے تو راستے میں بحیرا راہب نے آں حضور ﷺ میں آثارِ نبوت دیکھ کر آں حضور اور تمام قافلے والوں کو اپنے کنیسہ میں مدعو کیا اور ابو طالب کو مشورہ دیا کہ انھیں شام نہ لے جائیں! یہود کی حاسد و مبغض طبیعت سے خطرہ ہے، انھیں مکہ واپس کر دیں! چناں چہ ابو طالب نے حضور ﷺ کو مکہ واپس کر دیا۔

یوروپ نے اِس پر یہ ٹُک بندی کی:

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت محمد عربی ﷺ نے اسرار مذہب اسی عیسائی راہب سے سیکھے تھے، یہ عیسائیت کی اسلام پر فتح ہے۔

جدید مصنفین نے جواب دیا کہ یہ واقعہ سرے سے بے بنیاد ہے، اسے ثابت کرنے لیے اجلۂ محدثین پر وہ طعن و تشنیع کی ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔

۞ کتبِ سیر کے علاوہ کتب حدیث میں بھی غزوۂ بدر کا سبب یہ مذکور ہے کہ ایک قریشی کا ایک تجارتی قافلہ ابوسفیان کی سرکردگی میں شام سے مکہ واپس جا رہا تھا، نبی کریم ﷺ کو خبر ہوئی، آپ اس قافلے کی نیت سے مدینہ سے باہر تشریف لائے، ابوسفیان کو پہلے ہی سے خطرہ تھا اس نے

مکہ آدمی بھیج کر ایک لشکرِ جرار منگا لیا اور بدر کے میدان میں معرکہ ہوا۔

مستشرقین نے اس پر اعتراض کیا:

یہ ڈاکہ زنی ہوئی اور نبی کی شان ڈاکہ زنی کرنا نہیں ہے۔

ان محققین نے جواب دیا کہ سرے سے یہی غلط ہے کہ ''غزوۂ بدر میں آں حضور ﷺ اس قافلے کی نیت سے نکلے تھے۔''

- یہ تو میں اس کی جگہ بتاؤں گا کہ بحیرا راہب کا واقعہ کسی طرح بھی عیسائیت کی اسلام پر فتح نہیں ہوسکتا، بلکہ درحقیت اسلام کی عیسائیت پر فتحِ مبین ہے، اس واقعہ کو تسلیم کر لینے کے بعد عیسائیوں کو سوائے اس کے اور کوئی چارۂ کار نہیں کہ وہ اسلام کے دامن سے وابستہ ہو جائیں-

قریش نے حضور ﷺ اور صحابہ کے ساتھ جو کچھ کیا تھا اور آئندہ جو کچھ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے، خود یہ قافلہ جس مقصد کے پیش نظر شام گیا تھا، اس کو سامنے رکھ کر حضور سید عالم ﷺ کا یہ اقدام ڈاکہ زنی نہیں۔ حفاظت، خود اختیاری، استیصال فساد اور قیامِ امن کا سنگ بنیاد ہے۔

مجھے یہاں یہ بتانا ہے کہ یہ حقائق اُن محققین کے مرعوبانہ انکار سے ہرگز ہرگز بے اصل نہیں ہوسکتیں اور نہ مستشرقین نے جو مہمل اعتراضات کیے ہیں ان کا جواب یہ ہے کہ سچی بات کو جھوٹی کہی جائے؛ بلکہ معترضین نے ان کی تصویر کشی میں جو خیانتیں کی تھیں ان کو بے نقاب کر دیا جائے اور بس۔

جدید مصنفین کے طرزِ عمل نے ایک نیا سوال کھڑا کر دیا،

ان کے رویّے نے بتایا:

۞ حضور سید عالم ﷺ کی سیرتِ پاک کے جس حصے پر یوروپین دریدہ دہنوں کا جو اعتراض ہے وہ اپنی جگہ درست ہے۔

۞ سیرت پاک کا یہ جز ضرور ایسا ہی ہے جیسا کہ یوروپین معترضین کہہ رہے ہیں۔

اب ہر منصف بتائے کہ آپ نے گندگی دور کی یا اس کو اور گھناؤنی کر دیا، وہ تو غیر تھے ان کے لکھنے اور کہنے سے کیا ہوتا ہے؟ آپ تو اپنے بن کر غیروں کی تائید کر گئے، اس طرح جو تسمہ لگا تھا آپ نے اسے بھی علاحدہ کر دیا۔

خون کے آنسو بہانے کے لیے یہی کیا کم تھا آگے بڑھ کر فضائل و معجزات کی ہزار ہا احادیث کو بے اصل ثابت کرنے اور واقعاتِ سیر کی لاکھوں جزئیات کو جھٹلانے کے لیے ائمۂ محدثین پر ایسی متعصّبانہ یک طرفہ تنقیدیں کی جاتی ہیں کہ جس کے بعد کتبِ احادیث وسیر کا درجہ داستانِ الف لیلہ وطلسمِ ہوش ربا کے ہم پلہ ہو جاتا ہے، اپنے مطلب کی باتیں ثابت کرنی ہوتی ہیں تو صرف بخاری و مسلم تک نظر محدود نہیں رہتی، بلکہ ابن تیمیہ اور ابن قیم کے تہورات وخرافات بھی مستند ہو جاتے ہیں اور جہاں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فضائل و معجزات کی باری آتی ہے تو امام احمد بن حنبل، امام ابوعبد اللہ حاکم، امام قاضی عیاض، ابونعیم، ابن ابوشیبہ، علامہ جلال الدین سیوطی، علامہ ابن حجر عسقلانی، علامہ احمد خطیب قسطلانی، شیخ محقق عبدالحق دہلوی جیسے اساطین ملت غیر مستند ہو جاتے ہیں۔ جس کی صدہا مثالیں آئندہ ملیں گی، یہاں بقدر نصاب شہادت صرف دو مثالوں پر اختصار کرتا ہوں۔

۞ امام حاکم نے مستدرک میں یہ حدیث روایت کی ہے:

''جب حضرت آدم علیہ السلام سے لغزش ہوگئی تو انھوں نے شفیعِ اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وسیلے سے مغفرت چاہی۔

ارشاد ہوا:

تم نے میرے محبوب کو کیسے جانا؟

حضرت آدم نے عرض کیا:

میں نے عرش کے پایوں پر ''لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' لکھا دیکھا اس سے میں نے جانا کہ جن کا نام تو نے اپنے نام کے ساتھ عرش کے پائے پر لکھا ہے۔ وہ یقیناً تیری بارگاہ میں محبوب ترین ہوں گے۔

ارشاد ہوا:

آدم تم نے سچ کہا، اگر محمد نہ ہوتے تو تم کو بھی پیدا نہ کرتا۔''

حاکم نے اس حدیثِ جلیل کی تصحیح کی۔

ابن تیمیہ نے اس پر یہ بے سروپا جرح کی:

اَمَّا تَصْحِیْحُ الْحَاکِمِ لِمِثْلِ ھٰذَا الْحَدِیْثِ وَ اَمْثَالِہٖ، فَھٰذَا مِمَّا اَنْکَرَہُ عَلَیْہِ

أَئِمَّةُ الْعِلْمِ بِالْحَدِيْثِ، وَقَالُوْا: إِنَّ الْحَاكِمَ يُصَحِّحُ أَحَادِيْثَ وَهِيَ مَوْضُوْعَةٌ مَكْذُوْبَةٌ عِنْدَ أَهْلِ الْمَعْرِفَةِ بِالْحَدِيْثِ.

[یعنی] حاکم کے اس قسم کی حدیثوں کو صحیح کہنے پر ائمۂ حدیث نے انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ [حاکم] بہت سی جھوٹی اور موضوع حدیثوں کو صحیح کہتے ہیں۔

ان بزرگوں نے اس جرح کو لے کر ایک طرف اس روایت کو موضوع کہہ دیا اور دوسری طرف امامِ حاکم کی پوری مستدرک کے اعتبار کا جنازہ نکال دیا۔

۞ حسبِ تخریج آں جناب کتبِ سیر کے علاوہ، بیہقی، ابونعیم، خرائطی، ابن عساکر، ابن جریر نے یہ روایت کی ہے کہ وقت ولادت، ایوانِ کسریٰ میں زلزلہ پڑ گیا، آتش کدۂ فارس بجھ گیا، بحیرۂ طبریہ سوکھ گیا، مگر حضور والا نے اس روایت کو صرف اس بنا پر غیر معتبر کہہ دیا کہ بخاری و مسلم میں نہیں ہے۔ دوسری طرف اسی ہندوستان میں ایک گروہ ایسا بھی پیدا ہو گیا ہے جو اللہ کے رسولوں کو گاؤں کے پردھان اور چودھری اور زمین دار کی طرح سمجھتا ہے، بلکہ ذرۂ ناچیز سے کمتر، چمار سے زیادہ ذلیل جانتا ہے۔ ان کے علم سے شیطان کے علم کو وسیع کہتا ہے، حتی کہ علمِ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بچوں، پاگلوں اور چوپایوں کے مثل بتاتا ہے۔

تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا۔

سببِ تالیف

یہ تلخ حقائق ایسے نہیں جنھیں دیکھ کر خاموشی اختیار کی جاتی۔ بالآخر میں نے سیرتِ پاک پر ایک مکمل مفصل کتاب لکھنے کا ارادہ کر لیا۔

حقیقت میں تو یہ کام ان اکابرِ ملت کا تھا جو علم دین کے تمام شعبوں پر کامل دست گاہ رکھتے ہیں، مگر یہ بھی زمانہ کی نیرنگی ہے کہ وہ اس سے بھی زیادہ اہم مصروفیتوں میں مشغول ہیں، مجبوراً اس بے بال و پر بے زور وزر نے اس کام کو شروع کر دیا ہے، اُس قادرِ مطلق پر توکل ہے، پھر اُس کے نائبِ اکبر پر بھروسا ہے، وہی قوت و طاقت عطا فرمائیں گے اور دستگیری فرما کر اتمام کی توفیق دیں گے۔

سیرت کی بنیادی کتابیں

سیرت پر اگرچہ سیکڑوں تصنیفات موجود ہیں، مگر ان سب کا سلسلہ ان چاروں کتابوں پر منتہی ہوتا ہے:

- سیرت ابنِ اسحاق،
- سیرت امام واقدی،
- طبقات ابن سعد،
- تاریخ طبری۔

ان کے علاوہ بقیہ جتنی کتابیں ہیں وہ تمام کی تمام اِنھی کتابوں سے ماخوذ ہیں۔ البتہ بعض کتابوں میں کتبِ احادیث سے بھی مواد فراہم کیا گیا ہے، وہ مستثنیٰ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں نے فن سیرت کو غیر مستند وغیر معتبر ثابت کرنا چاہا ہے انھوں نے اپنی تنقید کی پوری قوت اِنھی کتابوں پر صرف کردی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم بھی ان چاروں کتابوں کے بارے میں علماے جرح وتعدیل کی رائے نقل کرکے فیصلہ ناظرین پر چھوڑ دیں۔

محمد بن اسحاق

یہ تابعی ہیں۔ انھوں نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زیارت کی ہے، امام زہری کے تلمیذ خاص ہیں۔ امام زہری تابعی اور جلیل القدر محدث، امام بخاری جیسے محدث کے مشائخ میں سے ہیں۔ ابن اسحاق کی جلالتِ شان کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ امام زہری جیسے یگانۂ روزگار امام کے ایسے خاص تلمیذ ہیں کہ امام زہری کے دروازے پر دربان رہتا تھا کوئی شخص بلا اجازت باریاب نہیں ہوسکتا تھا، مگر ابن اسحاق کو اجازتِ عام تھی جب چاہیں حاضر ہوجائیں۔

ان پر بعض محدثین نے بہت سخت جرحیں کی ہیں، یہاں تک کہ ہشام بن عروہ، پھر امام مالک، پھر وہب پھر یحییٰ قطان نے کذاب کہا۔

اَخْرَجَهُ ابْنُ عَدِيٍّ عَنْ أَبِي بِشْرٍ الدَّوْلَابِيِّ وَ مُحَمَّدِ بْنِ جَعْفَرِ بْنِ يَزِيْدَ عَنْ

أَبِي قِلَابَةَ الرَّقَاشِي ثَنِي أَبُوْ دَاوُدَ وَ سُلَيْمَانُ بْنُ دَاوُدَ، قَالَا: قَالَ يَحْيَى الْقَطَّانُ: إِنَّ مُحَمَّدَ بْنَ إِسْحَاقَ كَذَّابٌ، قُلْتُ: مَا يُدْرِيْكَ؟ قَالَ: قَالَ: وَهَبٌ، فَقُلْتُ لِوَهَبٍ: مَا يُدْرِيْكَ؟ قَالَ: قَالَ لِيْ مَالِكُ بْنُ أَنَسٍ: فَقُلْتُ لِمَالِكٍ: وَمَا يُدْرِيْكَ؟ قَالَ: قَالَ [لِيْ] هِشَامُ بْنُ عُرْوَةَ [قَالَ] قُلْتُ لِهِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ: وَمَا يُدْرِيْكَ؟ قَالَ حَدَّثَتْ عَنِ امْرَاتِيْ فَاطِمَةَ بِنْتِ الْمُنْذِرِ وَ اَدْخَلَتْ عَلَيَّ وَ هِيَ بِنْتُ تِسْعٍ وَ مَا رَاٰهَا رَجُلٌ حَتّٰى لَقِيَتِ اللّٰهَ.

ابن عدی نے ابو بشر دولابی اور محمد بن جعفر بن یزید سے روایت کی، وہ ابو قلابہ رقاشی سے روایت کرتے ہیں کہ مجھ سے ابو داؤد اور سلیمان بن داؤد نے بیان کیا کہ یحییٰ قطان نے کہا: محمد بن اسحق کذاب ہیں۔

میں نے پوچھا آپ نے کیسے جانا؟

انھوں نے بتایا کہ مجھے وہب نے اور ان کو امام مالک نے اور ان کو ہشام بن عروہ نے بتایا کہ وہ میری زوجہ فاطمہ بنت منذر سے روایت کرتے ہیں، حالاں کہ وہ نو سال کی عمر میں میرے یہاں آئی ہے اور زندگی بھر کسی غیر مرد نے اسے نہیں دیکھا۔

مگر عند التحقیق ابن اسحاق کا ثقہ ہونا ہی ثابت ہے، سیر و مغازی کے علاوہ احکام میں بھی ان کی روایت لائق احتجاج ہے۔

ان پر جو جرحیں کی گئی ہیں ان کا ائمۂ حدیث نے جواب دیا ہے۔ ابھی جو جرح مذکور ہوئی، میزان میں اس کا جواب یہ دیا کہ اس جرح کا مدار یہی ہے نا، کہ فاطمہ بنت منذر کو کسی غیر مرد نے نہیں دیکھا۔ پھر ابن اسحاق ان سے روایت کیسے کرتے ہیں؟

ہوسکتا ہے کہ ابن اسحاق نے فاطمہ سے مسجد میں احادیث سنی ہو یا بچپن میں سنی ہو، اس کا بھی احتمال ہے کہ فاطمہ نے پردہ کے پیچھے سے حدیث ابن اسحق سے بیان کی ہو۔

امام ابن ہمام فتح القدیر میں فرماتے ہیں۔

تَوْثِيْقُ ابْنِ إِسْحَاقَ هُوَ الْحَقُّ الْاَبْلَجُ وَمَا نَقَلَ عَنْ كَلَامِ مَالِكٍ فِيْهِ لَا يَثْبُتُ وَلَوْ صَحَّ لَمْ يَقْبَلْهُ اَهْلُ الْعِلْمِ كَيْفَ وَقَالَ شُعْبَةُ فِيْهِ هُوَ اَمِيْرُ

اَلْمُؤْمِنِيْنَ فِي الْحَدِيْثِ وَرَوٰى عَنْهُ مِثْلُ الثَّوْرِيِّ وَابْنِ اِدْرِيْسَ وَحَمَّادِ بْنِ زَيْدٍ وَ زَيْدِ بْنِ رَبِيْعٍ وَابْنِ عُلَيَّةَ وَعَبْدِ الْحَارِثِ وَابْنِ مُعِيْنٍ وَعَامَّةِ اَهْلِ الْحَدِيْثِ غُفِرَ اللّٰهُ تَعَالٰى لَهُمْ وَقَدْ قَالَ الْبُخَارِيُّ فِي تَوْثِيْقِهٖ فِي كِتَابِ جُزْءِ الْقِرَاءَةِ ۔خَلْفَ الْاِمَامِ لَهُ وَذَكَرَهُ ابْنُ حَبَّانَ فِي الثِّقَاتِ وَاَنَّ مَالِكًا رَجَعَ عَنِ الْكَلَامِ فِي ابْنِ اِسْحٰقَ وَاصْطَلَحَ مَعَهُ وَبَعَثَ اِلَيْهِ هَدِيَّةً۔(جزء القراءۃ خلف الامام)

امام ابن اسحاق کا ثقہ ہونا ہی حق ظاہر ہے، امام مالک کا جو کلام ان کے بارے میں منقول ہے، وہ ثابت نہیں۔اور اگر وہ صحیح بھی ہو،تو اسے اہل علم نے قبول نہیں کیا۔کیسے قبول کریں؟ حالاں کہ شعبہ نے ان کی شان میں فرمایا ہے: وہ امیر المومنین فی الحدیث ہیں اور ان (ابن اسحاق) سے ثوری اور ابن ادریس اور حماد بن زید اور زید بن ربیع اور ابن علیہ اور عبدالحارث اور ابن مبارک جیسے (اکابر) نے روایت کیا ہے۔امام احمد اور ابن معین نے ان سے روایت لی ہے۔اللہ تعالیٰ ان سب کی مغفرت فرمائیں۔

امام بخاری نے اپنی کتاب ''جزء القراءۃ خلف الامام'' میں ان کی توثیق کی اور ابن حبان نے انھیں ثقات میں ذکر کیا اور امام مالک نے ابن اسحاق پر جو جرح کی تھی اس سے رجوع فرمالیا اور ان سے صلح کرلی اور ان کے پاس ہدیہ بھیجا۔

ان پر جو جرحیں کی گئی ہیں امام بخاری ''جزء القراءۃ'' میں اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

رَاَيْتُ عَلِيَّ بْنَ عَبْدِ اللّٰهِ يَحْتَجُّ بِحَدِيْثِ ابْنِ اِسْحٰقَ ۔وَقَالَ عَلِيٌّ عَنِ ابْنِ عُيَيْنَةَ مَا رَاَيْتُ اَحَدًا يَتَّهِمُ مُحَمَّدَ بْنَ اِسْحٰقَ.

میں نے علی بن عبداللہ کو ابن اسحاق کی حدیث سے احتجاج کرتے دیکھا اور علی نے ابن عیینہ سے نقل کیا کہ میں نے کسی کو نہیں جانا جس نے محمد ابن اسحاق کو متہم کیا ہو۔

ان اقوالِ ائمہ سے واضح طور پر ثابت ہوگیا کہ محمد بن اسحٰق ہر حیثیت سے ثقہ اور مستند ہیں۔عام اہلِ حدیث نے ان سے روایت کی ہے؛ بلکہ حسبِ ارشادِ شعبہ، وہ حدیث میں امیر المومنین کے درجہ پر فائز ہیں۔اور امام مالک جو ان پر جرح کی ہے، اسے اہل علم نے قبول نہیں کیا، بلکہ

خود امام مالک نے اس سے رجوع کر لیا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بسا اوقات ائمۂ حدیث کسی راوی پر جرح کرتے ہیں، مگر وہ جرح واقع کے مطابق نہیں ہوتی۔

امام ذہبی نے لکھا ہے:

''ابن اسحٰق، یہود و نصاریٰ سے روایت کرتے تھے اور ان کو ثقہ جانتے تھے۔''

ابن حبان نے اسی جرح کو ذرا واضح کر کے یوں بیان کیا ہے:

''محدثین کو ابن اسحاق کی کتاب پر جو اعتراض تھا تو یہ تھا کہ انھوں نے خیبر کے واقعات اُن یہودیوں سے نقل کیے ہیں جو مسلمان ہو گئے تھے اور یہ واقعات اُن لوگوں نے یہودیوں ہی سے سنے ہوں گے؛ اس لیے اُن پر کامل اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔''

لیکن جب کہ ابن حبان نے خود تصریح کر دی ہے کہ ابن اسحاق نے خیبر کے واقعات یہودیوں سے نہیں لیے تھے؛ بلکہ انھوں نے واقعات اُن مسلمانوں سے لیے تھے جو پہلے کبھی یہودی تھے اور اسی بنا پر وہم کیا جا سکتا ہے کہ شاید ان لوگوں نے یہودیوں سے واقعات سنے ہوں؛ لیکن جس طرح کسی کو یہ توہّم ہوا، اسی طرح ہم کو اس پر یقین ہے کہ ابن اسحاق نے جو خیبر کے واقعات اپنی مغازی میں تحریر کیے ہیں ان کے راوی یہودی نہیں، بلکہ مسلمان ہیں؛ کیوں کہ ابن اسحاق کی یہ روایتیں مرسل ہیں، اگر متصل ہوتیں تو راویوں سے خود معلوم ہو جاتا کہ یہ یہودی تھے کہ نصرانی یا مسلمان۔

اور یہ امر اپنی جگہ ثابت ہے کہ ثقہ اور مستند محدّث جب کسی روایت کی سند حذف کرتا ہے تو اسی بنا پر حذف کرتا ہے کہ اسے راویوں کی تعدیل و توثیق پر پورا اعتماد ہے اور یہی وجہ ہے کہ حدیثِ مرسل دربارۂ احکام بھی عند التحقیق حجت ہے۔

مقدمہ اشعۃ اللمعات میں ہے:

''و نزد ابو حنیفہ و مالک رحمۃ اللہ علیہما مقبول است مطلقاً و ایشان گویند کہ ارسال بجہتِ کمالِ وثوق و اعتماد است، زیرا کہ کلام در ثقہ است۔ و اگر نزد دوے صحیح نمی بود ارسال نمی نمود۔''

امام ابو حنیفہ، امام مالک رحمۃ اللہ علیہما کے نزدیک [حدیثِ] مرسل مقبول ہے مطلقاً۔ اور یہ لوگ فرماتے ہیں کہ ارسال کمال وثوق اور اعتماد کی بنا پر ہے؛ اس لیے کہ کلام ثقہ کے ارسال میں

ہے، اگر اس کے نزدیک صحیح نہ ہوتی تو ارسال نہیں کرتا۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ابن اسحاق فنِ سیرت کے نہایت ثقہ اور عادل امام ہیں؛ بلکہ عند التحقیق حدیث میں بھی مقبول و مستند ہیں۔ ان کی ''کتاب المغازی'' سیر میں متفقہ طور پر مستند اور لائق اعتبار کتاب ہے۔ ان کی وفات ۱۵۱ھ میں ہوئی۔

امام واقدی

ان کا نام محمد بن عمر واقدی اسلمی ہے۔ ان پر بعض علما نے سخت سے سخت جرحیں کیں، جیسا کہ ''میزان'' و ''تہذیب'' وغیرہ میں موجود ہے۔ اور آج کل تو تقریباً اس کو اجماعی مسئلہ بنانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ جوشِ تعصب میں لوگ یک طرفہ جرح نقل کر کے خوب خوب ان کا تمسخر اڑاتے ہیں۔ لیکن ٹھنڈے دل سے، تعصّب نکال کر، امام واقدی کے حالات جرح کے سلسلے میں لوگوں کے دعوی اور دلیل میں مطابقت اور استقصا کے ساتھ ان کے بارے میں جو کہا گیا ہے اس پر غور کرتے ہیں تو واقعہ اس کے بالکل برعکس نظر آتا ہے، اگر کچھ لوگ ان کو متروک، وَضّاع، کذّاب کہہ رہے ہیں تو دوسرے ائمہ ان کو ثقہ، عادل، مستند بتا رہے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض ائمہ نے مخصوص طور پر اپنی کتابوں میں ان کے ثقہ اور عادل ہونے کے عنوانات قائم کیے ہیں۔ ان کے متعلق تمام مختلف موافق اقوال نقل کر کے ایک ایک مخالف قول کا جواب دیا ہے۔ اور تمام موافق اقوال دلائل سے مؤید کر کے ان کا ثقہ، ثبت، عادل، مستند ہونا ثابت کیا۔

امام ابن ہمام- صاحبِ فتح القدیر، جن کی جلالتِ شان، تبحرِ علمی، تحقیق و تدقیق تمام دنیاے اسلام میں مسلم ہے- فتح القدیر، فصل آثار میں فرماتے ہیں:

قَالَ فِي الإِمَامِ جَمَعَ شَيْخُنَا أَبُو الْفَتحِ الْحَافِظُ فِيْ أَوَّلِ كِتَابِهِ الْمَغَازِي وَ السِّيَرِ مَنْ ضَعَّفَهُ وَمَنْ وَثَّقَهُ وَرَجَّحَ تَوْثِيْقَهُ و ذَكَرَ الأَجْوِبَةَ عَمَّا قِيْلَ.

امام واقدی کے بارے میں ہمارے شیخ ابوالفتح حافظ نے اپنی کتاب مغازی وسیر کے شروع میں مخالف وموافق تمام اقوال جمع کر کے ان کے ثقہ ہونے کو راجح ثابت فرمایا اور ان پر جتنی جرحیں کی گئیں ہیں سب کا جواب دیا۔

علامہ بدرالدین محمود عینی عمدۃ القاری شرحِ بخاری میں فرماتے ہیں:

وَ قَالَ اَیْضًا اَلْوَاقِدِیْ شَدِیْدُ الضُّعْفِ اِذَا انْفَرَدَ فکیف اِذَا خَالَفَ؟ قُلْتُ ذَکَرَ الْحَافِظُ الْمُزَنِیُّ وَلَمْ یَتَعَرَّضْ اِلٰی شَیْءٍ مِنْ ذَالِكَ وَمِنَ الْعُجْبِ اَنَّ الْوَاقِدِیْ اَحَدُ مَشَائِخِ الْاِمَامِ الشَّافِعِیِّ وَ یَحُطُّ عَلَیْهِ هٰذَا الْحَطِّ وَهُوَ اِنْ کَانَ ضَعَّفَهُ بَعْضُهُمْ فَقَدْ وَثَّقَهُ اٰخَرُوْنَ فَقَالَ اِبْرَاهِیْمُ الْحَرْبِیُّ: اَلْوَاقِدِیْ اَمِیْنُ النَّاسِ عَلٰی اَهْلِ الْاِسْلَامِ وَعَنْ مُصْعَبِ بْنِ زُبَیْرٍ ثِقَةٌ مَامُوْنٌ کَذَا وَ ثَّقَهُ اَبُوْ عُبَیْدَةَ وَاَثْنٰی عَلَیْهِ ابْنُ الْمُبَارَكِ وَاٰخَرُوْنَ (ج:۱۸،ص:۴۵۹)۔

''یہ بھی کہا کہ واقدی جب منفرد ہوں تو بھی سخت ضعیف ہیں، تو اگر مخالف ہوں تو کیا حال ہوگا؟ یہ حافظ مزنی نے ذکر کیا اور اس پر کچھ نہیں کہا۔ تعجب یہ ہے کہ واقدی، امام شافعی کے مشائخ میں سے ہیں، اور یہ ان کو اتنا گرا رہے ہیں۔ امام واقدی کو اگرچہ بعض لوگوں نے ضعیف بتایا ہے، مگر دوسرے لوگوں نے ان کو ثقہ کہا ہے۔

ابراہیم حربی نے کہا:

'واقدی اہلِ اسلام کے امین ہیں۔'

مصعب بن زبیر سے مروی ہے کہ انھوں نے بھی واقدی کو ثقہ مامون کہا۔

یوں ہی ابوعبیدہ نے توثیق کی اور عبداللہ بن مبارک اور دوسرے لوگوں نے ان کی تعریف کی۔''

امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے مشائخ میں سے ہونا ہی امام واقدی کی جلالتِ شان کے لیے کافی تھا۔ اس سونے پر سہاگا یہ کہ عبداللہ بن مبارک- جو امام بخاری کے مشائخ میں سے ہیں- اور ان کے ہم پلہ دوسرے اماموں نے ان کی تعریف کی ہے۔

مصعب بن زبیر اور ابوعبیدہ جیسے مسلم الثبوت بزرگوں نے اُن کو 'ثقہ- مامون' کہا ہے، حتیٰ کہ ابراہیم حربی نے یہ شان دار خطاب دیا ''امین الناس علی اهل الاسلام''

کیا ان روشن تصریحات کے بعد بھی 'صاحب سیرۃ النبی' وغیرہ کی یک طرفہ متعصّبانہ جرح کی کوئی علمی حیثیت باقی رہ جاتی ہے؟

کہاں وہ شدّ و مد کہ اگر واقدی سچا تو دنیا میں کوئی جھوٹا نہیں۔ اور کہاں ائمۂ حدیث کی یہ زوردار توثیق و تعدیل۔

لوگ یہ سمجھے ہوئے تھے کہ اب علم دنیا سے اٹھ گیا اور اب تنقیدی جائزہ لینے والا کوئی مو جود نہیں، جس پر ہم چھری چلا دیں گے، اسے دنیا مذبوح مان لے گی؛ لیکن اب واقدی کے ساتھ بغض رکھنے والے سوچیں کہ دنیا اُن ائمہ کے یہ ارشادات پڑھے گی تو انھیں کیا کہے گی؟

امام واقدی کے متعلق یہ بحث اور اختلاف اس صورت میں ہے کے ان کی مرویات دربارۂ احکام مقبول ہے کہ نہیں اور آپ نے دیکھا کہ راجح مختار یہی ہے کے وہ بابِ احکام میں بھی ثقہ، مامون، مقبول، مستند ہیں۔ رہ گیا سیر و مغازی، فضائل و معجزات کے ابواب، اس سلسلے میں امام واقدی کا مقبول و مستند ہونا سب کے نزدیک مسلّم ہے۔ اس میں کسی ایک کا اختلاف نہیں جس کی دلیل تمام کتبِ سیر و مغازی میں ان کی مرویات کا اخذ و قبول ہے۔ اور اہل علم جانتے ہیں کہ تلقیِ امت کا کیا درجہ ہے۔

اسی لیے میزان میں فرمایا:

كَانَ اِلٰى حِفْظِهِ الْمُنْتَهٰى فِي الْأَخْبَارِ و السِّيَرِ وَ الْمَغَازِي وَا لْحَوَادِثِ وَ اَيَّامِ النَّاسِ وَغَيْرِ ذَالِكَ.

اخبار، سیر، مغازی، حوادث اور ایام وغیرہ میں امام واقدی ہی کے حفظ تک منتہیٰ ہے۔

اس لیے سیر و مغازی میں ان کی مرویات کے مقبول وغیرہ مقبول ہونے کی بحث ایجادِ بندہ سے زائد اور امت میں انتشار و افتراق کی کوشش کے سوا اور کوئی علمی خدمت نہیں کہی جا سکتی۔

امام واقدی کے وضّاع و کذّاب ہونے کے ثبوت میں آج سب سے بڑی دلیل جو پیش کی جاتی ہے وہ یہ ہے:

''اور حقیقت میں واقدی کی تصنیف خود اس بات کی شہادت ہے۔ ایک ایک جزئی واقعہ کے متعلق جس قسم کی گوناگوں اور دل چسپ تفصیلیں وہ بیان کرتا ہے، آج کوئی بڑے سے بڑا واقعہ نگار چشم دید واقعات قلم بند نہیں کر سکتا۔''

(از: سیرت، ص: ۴۴)

اس مبارک متن کی شرح یہ ہے کہ مثلاً حضرت خالد بن ولید سیف اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فلان جنگ میں فلاں پہلوان سے مقابلہ کیا، جو اتنا موٹا تگڑا تھا، اس کے پاس فلاں فلاں اسلحے تھے، فلاں فلاں لباس پہنے تھا، اس نے آ کر پہلے یہ کہا، حضرت خالد نے اس کا یہ جواب دیا، پھر اس نے نیزے کا وار کیا، حضرتِ خالد نے رد کر دیا یا پینترہ بدل کر وار خالی کر دیا اور آگے بڑھ کر اس کا نیزہ چھین لیا، اب اس پہلوان نے تلوار چلائی، حضرت خالد نے اسے سر پر لیا، پھر سیف اللہ نے تلوا رکا ایسا وار کیا کہ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا، یا وہ تلوار اس کے سر پر پڑی خود کٹا، سر دو ٹکڑے ہو گیا، تلوار سر سے گزر کر کمر تک چیرتی ہوئی نکل گئی۔ (یہ صرف تمثیلاً ہے، کوئی واقعہ نہیں۔)

علامہ کا فرمانا ہے کہ یہ تمام تفصیلات یاد کر لینا آج کے اہل حفظ وضبط کی قوت سے باہر ہے؛ لہذا یہ جھوٹ اور من گھڑت ہے؛ لیکن قبلہ! اس زمانے کے اہلِ حفظ وضبط پر اُس زمان برکت نشان حفاظ کو قیاس کرنا ہی وہ غلطی ہے جس کے بعد کتب احادیث کا پورا ذخیرہ فرضی داستان کی صف میں آ جاتا ہے، اس بنیادی غلطی کو دور کرنے کے لیے ہم ناظرین کو ذرا تفصیلی مطالعہ کی تکلیف دے رہے ہیں:

امام واقدی اگر کسی جزئی واقعے کی جملہ تفصیل بیان کریں تو وہ ان کے کذّاب ووضّاع ہونے کی شہادت ہے؛ لیکن بخاری اور مسلم میں بھی اس قسم کی تفصیلات موجود ہیں تو پھر آپ کیا فتویٰ صادر فرمائیں گے۔ اٹھایئے صحیحین اور ملاحظہ کیجیے، سید الشہداء سیدنا حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کا واقعہ جس تفصیل کے ساتھ مذکور ہے، کیا وہ واقدی کی بیان کردہ تفصیلات سے کسی طرح کم ہے؟ اسی طرح خود آپ کی اصح کتب بعد کتاب اللہ میں ایک دو نہیں دسیوں جزئیات کی وہ حیرت انگیز تفصیلیں مذکور ہیں جو واقدی نے بھی نہیں بیان کی، مثلاً غزوۂ بدر میں حضرتِ زبیر بن عوام اور ابو ذات کرش کا مقابلہ اور اس کی پوری تفصیل، کیا امام واقدی کی بیان کردہ تفصیلات سے کم ہیں؟ ابو ذات کرش کس طرح لوہے میں غرق آیا، حضرتِ زبیر نے کیسے اس کی آنکھ میں برچھی ماری اور یہ برچھی پھر کیسے نکلی اور اس کی نوک ٹیڑھی ہوئی، پھر کس کے پاس رہی، پھر کس نے کس قیمت پر خریدی، کیا واقدی کے یہاں کسی مجاہد کی تلوار یا برچھی کے بارے میں اتنی لمبی معلومات ہے؟

پھر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ اگر امام بخاری جزئی جزئی باتوں کی تفصیلات بیان کریں تو

وہ حفظ وضبط کے جبل شامخ ہوں اور اسی کو آپ بیان کریں تو آپ کی کتاب اصح کتب ہو اور امام واقدی بیان کریں تو جھوٹے کذّاب ووضّاع ہوں، اُن کی کتاب میں ہو تو وہ اکذب کتب ہو، سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ.

بات دراصل یہ ہے کہ اُس زمانے میں جنگ کا شجاعانہ طریقہ یہ تھا کہ فوج سے ایک ایک آدمی نکل کر مقابلہ کرتا اور ابتداءً فوج کے منتخب تجربہ کار افراد باہر نکلا کرتے، ایسی صورت میں پوری فوج کو لڑنے والوں کی جملہ حرکات وسکنات بغور دیکھنے کا بہت اچھا موقع ملتا تھا، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ فوج کو وہ ساری تفصیل معلوم ہو جاتی جو اُن دونوں نبرد آزما کو پیش آتی۔ اور اگر عام دھاوا ہو جاتا- جسے اس وقت جنگِ مغلوبہ کہا جاتا تھا- تو بھی جو لوگ جنگ کے طریقۂ کار سے واقف تھے، وہ بخوبی جانتے تھے کہ مقابلہ ہمیشہ ماہر بہادر کیا کرتے تھے، ان کے آس پاس کچھ لوگ ان کی امداد اور حفاظت کے لیے موجود رہتے، یہ لوگ اپنے اپنے نبرد آزما کی ہر حرکت ونقل پر پورے تیقظ کے ساتھ نگاہ رکھتے تھے، اس بنا پر جنگ مغلوبہ کی صورت میں بھی کچھ لوگوں کا ہر قسم کی تفصیلی معلومات محفوظ کر لینا بعید از قیاس نہیں۔ عام طور پر اس قسم کی تفصیلات باعث دل چسپی ہوتی ہیں، لوگ سننے سنانے کے شائق ہوتے ہیں؛ اس لیے وہ سینہ بہ سینہ منتقل ہو کر سفینہ میں محفوظ ہو جاتی ہے۔

یہی چیز امام واقدی کے یہاں موجود ہے۔ پھر اس پر طعن کرنا انصاف ودیانت کا خون کرنا ہی نہیں؛ بلکہ جمیع کتبِ احادیث کے دفتر کو برباد کرنے کا دروازہ کھولنا ہے، بنیادی غلطی یہ ہے کہ اُس زمانے کے حفاظ کو آج کے مشاہدین ومؤرخین پر قیاس کیا گیا۔

آپ ذرا سوچیے!

حضرتِ امام بخاری کے متعلق محدثین نے تصریح کی ہے کہ ان کو چھ لاکھ حدیثیں یاد تھیں۔

انھوں نے خود فرمایا ہے:

''میں نے اپنی جامع صحیح کو تین لاکھ صحیح احادیث سے منتخب کیا ہے۔''

یہ تین لاکھ احادیث تو بہت ہیں، صرف صحیح بخاری میں جتنی احادیث ہیں ان کو مع سند آج

کا کوئی متحفظ یاد کرسکتا ہے؟ نہیں! ہرگز ہرگز نہیں!

مگر امام بخاری کے حفظ وضبط کو سنیے:

انھوں نے چھ لاکھ احادیث کو بھی یاد کیا اور ان کے متعلق اس قسم کی گوناگوں تفصیلیں بھی یاد رکھیں [کہ] فلاں متن کی فلاں سند ہے، اس کے رواۃ میں تلمیذ وشیخ کی یہ ترتیب ہے، شیخ کی وفات فلاں وقت ہوئی، تلمیذ فلاں وقت سماع وتحمل کے لائق ہوا، تلمیذ وشیخ میں ملاقات ہوئی، فلاں سند میں فلاں راوی ثقہ ہے، فلاں مطعون ہے، اس پر طعن یہ ہے، مثلاً: وہ متروک ہے، منکر ہے، فلاں مختلط ہے، فلاں مجہول ہے، فلاں مدلّس ہے، فلاں فاسق ہے، فلاں مبتدع ہے، فلاں کذّاب ہے، فلاں وضّاع ہے، اس راوی پر فلاں محدّث نے یہ طعن کیا، فلاں نے یہ جواب دیا، فلاں نے اس کے بارے میں مجھ سے یہ کہا، مگر صحیح یہ ہے کہ وہ ویسا نہیں، یہ حدیث اس سند سے صحیح ہے، اس سند سے حسن ہے، اس سند سے ضعیف ہے، صحیح کے درجے سے تنزل کی وجہ یہ ہے، ضعیف اس وجہ سے [ہے]، یہ حدیث میں نے شیخ کے سامنے پڑھی، وہ حدیث شیخ نے پڑھ کر مجھے سنائی تھی، یہ مجمع میں سنی یا سنائی وغیرہ وغیرہ۔

احادیث کے متعلق یہ ساری تفصیلات اتنی ضروری اور اہم ہیں کہ اگر یہ تفصیلیں نہ یاد کی جائیں تو پھر حدیثِ صحیح وحسن وضعیف میں؛ بلکہ حدیث وغیر حدیث میں امتیاز مشکل ہوجائے، اسی وجہ سے اس عہد کے تمام محدّثین اور فقہا احادیث کے متن کے ساتھ ساتھ اس قسم کی جملہ تفصیلات کامل طور سے محفوظ رکھتے تھے اور آج اس دور ترقی میں بڑے سے بڑا مُدَمِّغ متحفظ واقعات کے بارے میں اس قسم کی آدھی تفصیل بھی یاد نہیں رکھ سکتا، ایسی صورت میں اپنی قوتِ یادداشت پر قیاس کرکے محدّثین وفقہا پر طعن کرنے والے کو آپ بھی یہی جواب دیں گے۔ ع

کارِ پاکاں را قیاس از خود مگیر

اس لیے امام واقدی پر آپ کے طعن کے جواب میں ہم بھی یہی عرض کرکے رخصت ہوتے ہیں کہ اگر واقدی پر آپ کی جرح صحیح مان لی جائے تو اگر آپ ہی سے سیکھ کر کوئی یہ کہے:

''حقیقت یہ ہے کہ محدّثین اور فقہا کی تصانیف خود اس بات کی شہادت ہیں، ایک ایک جزئی روایت کے متعلق اس قسم کی گوناگوں اور دلچسپ تفصیلیں وہ یاد رکھتے ہیں کہ آج بڑے

سے بڑا مُدَمِّغ متحفظ بھی نہیں یاد رکھ سکتا۔''

تو بولیے دین و مذہب کا کوئی ٹھکانا رہا؟ بخاری و مسلم کو جانے دیجیے، جناب کی اصح کتب کا کیا حال ہوگا؟ یہی مجھے رونا ہے کہ آپ نے نشۂ تحقیق و تصحیح میں وہ وہ لکھ مارا ہے جس کی رَو میں تمام دینیات بہہ سکتے ہیں۔

ہم اس بحث کو اس تصفیہ پر ختم کرتے ہیں:

''امام واقدی کا ثقہ عادل مستند ہونا ہی صحیح و مرجح ہے۔ ان کی مرویات در بارۂ احکام بھی مقبول ہیں اور سیر و مغازی کے وہ بالاتفاق امام مستند ہیں۔

یہی میزان میں فرمایا:

وَ كَانَ إِلَى حِفْظِهِ الْمُنْتَهَى فِي الْأَخْبَارِ وَ السِّيَرِ وَ الْمَغَازِي وَ الْحَوَادِثِ وَ أَيَّامِ النَّاسِ وَ غَيْرِ ذَٰلِكَ.

امام واقدی کے ہی حفظ تک اخبار، سیر، مغازی، حوادث، واقعات وغیرہ میں منتہیٰ ہے۔

ان کی وفات ۲۰۷ھ میں ہوئی۔

ابن سعد

ان کا نام بھی محمد ہے، کاتب واقدی سے مشہور ہیں، امام واقدی کے تلمیذ خاص ہیں۔ نہایت ثقہ، مستند، مقبول الحدیث، صاحبِ سیرت امام ہیں، اس کے باوجود کہ لوگوں نے ان کے استاذ پر سخت سے سخت جرحیں کیں ہیں؛ مگر ان کو سب نے متفقہ طور پر ثقہ اور عادل کہا ہے۔ ان کی کتاب کا نام ''**طبقاتِ ابنِ سعد**'' ہے۔ یہ بارہ جلدوں کی مبسوط کتاب ہے۔ ان میں دو جلدیں سیرت نبوی ہیں، بقیہ دس جلدیں صحابہ و تابعین کے حالات میں ہیں۔ یہ کتاب نایاب ہو چکی تھی، جرمن نے بڑے اہتمام سے چھاپ کر شائع کیا ہے۔

جدید مہربانوں کو جب کوئی گنجائش نہ ملی تو لامحالہ انھیں ثقہ کہنا پڑا؛ لیکن اس طرح سیرت کا بہت بڑا ذخیرہ مستند ہو جاتا تھا اس لیے ان پر بے تکی جرح کر دی۔

ابنِ سعد کی نصف سے زیادہ روایتیں واقدی کے ذریعہ سے ہیں؛ اس لیے ان روایتوں کا وہی رتبہ ہے جو خود واقدی کی روایتوں کا ہے۔ باقی رواۃ میں سے بعض ثقہ ہیں اور بعض غیر ثقہ

۔یعنی حسبِ تحقیق آں جناب، واقدی جھوٹے کذّاب وضّاع اور ان کی مرویات کذب وجعل ہیں اور حدیث میں فرمایا:

''مَنْ حَدَّثَ عَنِّیْ بِحَدِیْثٍ یَرٰی أَنَّہٗ کَذِبٌ فَھُوَ اَحَدُ الْکَاذِبِیْنَ.''

جو ایسی حدیث بیان کرے جسے جانتا ہو کہ جھوٹی ہے، تو وہ خود بھی جھوٹا ہے۔

لہٰذا ابن سعد خود بھی جھوٹے کذّاب ہوئے اور اگر یہ کہا جائے کہ انھیں اپنے استاذ واقدی کا جھوٹا کذّاب ہونا معلوم نہ تھا، انھوں نے لاعلمی میں روایت کر دیا، تو دوسری حدیث سنیے! فرماتے ہیں:

کَفٰی بِالْمَرْءِ کَذِبًا أَنْ یُّحَدِّثَ بِکُلِّ مَا سَمِعَ.

''کسی کے جھوٹے ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ ہر سنی ہوئی بات بیان کر دے۔''

اس طرح بھی ابنِ سعد کا دامن جھوٹ کے داغ سے بری نہیں ہوسکتا، پھر مجھے تو حیرت ہے ہی، ہر ناظر کو حیرت ہوگی کہ ابنِ سعد کے بارے میں خطیب بغدادی کا یہ قول کس منہ سے نقل کیا گیا:

کَانَ مِن اَھْلِ الْعِلْمِ وَ الْفَضْلِ وَ الْفَھْمِ وَ الْعَدَالَۃِ،صَنَّفَ کِتَابًا کَبِیْرًا فِی طَبَقَاتِ الصَّحَابَۃِ وَالتَّابِعِیْنَ اِلٰی وَقْتِہٖ فَأَجَادَ فِیْہِ وَاَحْسَنَ.

ابنِ سعد اہل علم وفضل وفہم [و] صاحب عدالت ہیں، صحابہ اور اپنے وقت تک کے تابعین کے طبقات میں ایک بہت بڑی کتاب تصنیف کی جو بہت عمدہ اور اچھی کتاب ہے۔

اپنی کتاب میں وہ بھی نصف سے زائد وضّاع وکذّاب کی روایت داخل کرنا، اس پر بغیر نقد وجرح کیے بیان کرنا، صاحب علم وفضل وفہم [و] عدالت کا کام نہیں؛ لیکن جیسا کہ میں پہلے ثابت کر آیا ہوں۔امام واقدی ثقہ، عادل، مامون، مقبول ہیں؛ اس لیے ان کی وجہ سے ان کے تلمیذِ جلیل پر بھی حرف نہیں آسکتا اور نہ ان کی تصنیف پر۔

ان کی وفات ۲۳۰ھ میں ہوئی ہے۔

امام واقدی اور ان کے تلمیذ ابنِ سعد پر اتنی زوردار جرح صرف اس وجہ سے ہے کہ علامہ کی دانست میں یوروپ کے مستشرقین کو اعتراض کرنے کے مواد انھی کی کتابوں سے ملے ہیں۔

چناں چہ تحریر فرماتے ہیں:

''سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کا تمام تر سرمایۂ استناد صرف سیرت و تاریخ کی کتابیں ہیں، مثلاً: مغازیِ واقدی، سیرتِ ابنِ ہشام، سیرتِ محمد بن اسحاق، تاریخِ طبری وغیرہ''

(ص:۹۷)

دوسری جگہ ہے:

مثلاً اہلِ یوروپ واقدی کے بیان پر سب سے زیادہ اعتماد کرتے ہیں۔

(ص:۹۹)

یوروپین متعصبین کے اعتراض کا جوابات یہ نہیں تھے کہ ائمہ جھوٹے کذّاب، وضّاع، ناقابلِ استناد ہیں؛ بلکہ ان کے تعصب، خیانت کی پردہ دری ہے؛ لیکن کیا کیا جائے شمس العلماء ہونا اور بات ہے اور دین میں تیقظ، تفقہ اور چیز ہے۔

محب الدین بن جریر طبری

یہ بھی مسلم الثبوت، عادل، ثقہ، مستند، محدّث اور مفسر ہیں۔ ان کی تفسیر احسن التفاسیر سمجھی جاتی ہے۔ ان کی کتاب ''تاریخِ کبیر'' نہایت مفصل اور جامع مستند کتاب ہے۔ ان کی یہ کتاب بھی نایاب تھی، یوروپ نے چھاپ کر شائع کیا۔ ان پر سلیمانی نے یہ طعن کیا کہ یہ روافض کے لیے حدیثیں وضع کیا کرتے تھے۔ اس کا جواب علامہ ذہبی نے ان زوردار الفاظ میں دیا:

هٰذا رَجْمٌ بِالظَّنِّ الْكَاذِبِ، بَلِ ابْنُ جَرِيْرٍ مِنْ كَبَائِرِ أَئِمَّةِ الْإِسْلَامِ وَ الْمُعْتَمِدِيْنَ.

یہ جھوٹی بدگمانی ہے، حقیقت میں ابن جریر اسلام کے ایک بڑے امام اور معتمد ہیں۔

اُن پر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اُن کے بعض شیوخ مثلاً ''سلمہ ابرش'' ضعیف ہیں؛ لیکن سلمہ ابرش کو ابنِ معین جیسے ماہر نقاد نے کہا ہے۔ خصوصاً سیر و مغازی میں سلمہ کی سِیَر کو احسن السِیَر کہا ہے اور تقریباً یہی حال امام طبری کے دوسرے مشائخ کا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ طبری امام معتمد ثقہ ہیں، اُن کی کتاب ''تاریخ کبیر'' بہت مقبول و مستند

کتاب ہے۔ بعد کے تمام مؤرخین کا یہی ماخذ ہے۔

ان کی وفات ۳۰۱ھ میں ہوئی ہے۔

یہ چاروں کتابیں سیر ومغازی کی بنیاد ہیں۔ اس لیے فن سیرت کو بے اعتبار کرنے کے لیے ان پر سخت سے سخت طعن کیے گئے ہیں؛ لیکن سطورِ بالا پڑھنے والوں پر یہ بات اچھی طرح روشن ہوگئی کہ محض طعن وجرح سے یہ فن مجروح نہیں ہوسکتا اور نہ یک طرفہ جرح سے کسی امام کو ناقابل استناد کہا جاسکتا ہے۔

ان ائمہ پر اگر کچھ ناقدین نے طعن کیے تو دوسرے اکابر نے اس کا جواب دیا، ان کو ثقہ معتمد کہا، اور جب مصنفین مستند ہیں تو ان کی تصنیفات کا مستند ہونا بدیہی امر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام دنیائے اسلام نے ان ائمہ کی کتابوں کو قبول کیا، انھیں کتابوں سے روایتیں اخذ کرکے دوسری کثیر تصانیف تیار کیں۔ ماہر دینیات جانتا ہے کہ تلقّیِ امت خود کسی تصنیف کے معتمد ومستند ہونے کے لیے کافی ہے؛ لیکن ماتم کی بات یہ ہے کہ اب یہ شگوفہ کھلایا جارہا ہے۔

''لیکن افسوس ہے کہ ان لوگوں کا مستند ہونا، ان کی تصنیفات کے مستند ہونے پر چنداں اثر نہیں ڈالتا۔ یہ لوگ شریک واقعہ نہیں؛ اس لیے جو کچھ بیان کرتے ہیں وہ راویوں کے ذریعے بیان کرتے ہیں، لیکن ان کے بہت سے رواۃ ضعیف الروایہ اور غیر مستند ہیں، اس کے علاوہ ابنِ اسحاق کی اصل کتاب ہندوستان میں موجود نہیں، ابنِ ہشام نے ابنِ اسحاق کی کتاب کو ترتیب اور تہذیب کے بعد جس صورت میں بدل دیا وہی آج موجود ہے؛ لیکن ابنِ ہشام نے ابنِ اسحاق کی کتاب کو ''زیاد بکائی'' کے واسطے سے روایت کیا ہے، بکائی اگرچہ رتبہ کے شخص ہیں، تاہم محدثین کے اعلیٰ معیار سے فروتر ہیں۔''

ابنِ مدینی (امام بخاری کے استاد) کہتے ہیں کہ وہ ضعیف ہے میں نے اس کر ترک کر دیا۔

ابوحاتم کہتے ہیں وہ استناد کے قابل نہیں۔ نسائی کہتے ہیں وہ ضعیف ہیں۔ ابن سعد کی نصف سے زیادہ روایتیں واقدی کے ذریعہ سے ہیں۔ اسی لیے ان روایتوں کا وہی رتبہ ہے جو خود واقدی کی روایتوں کا ہے، باقی رواۃ میں بعض ثقہ ہیں اور بعض غیر ثقہ۔ طبری کے بڑے بڑے شیوخ

روایت مثلاً سلمہ ابرش، ابنِ سلمہ ضعیف الروایہ ہیں۔ (سیرت البنی، ص: ۴۵)

کتبِ سیر کے متعلق، وہ بھی بنیادی کتابوں کے بارے میں، اس تبصرے سے ہر شخص یہی سمجھے گا کہ جب ائمۂ فن اور ان کی تصنیفات کی یہ ناگفتہ بہ حالت ہے کہ جھوٹ، کذب، متروک غیر مستند مرویات سے بھری ہوئی ہیں، تو پھر اس مبارک فن کی وقعت شاہ نامہ، فردوسی سے زائد اور کیا ہوگی۔ لیکن پھر حیرت اور سخت حیرت ہے کہ جس شخص کی یہ تحقیق ہو، وہی اس عظیم فن پر تمام دنیا سے ان الفاظ میں کس طرح مباہات کرتا ہے:

مسلمانوں کے اس فخر کا قیامت تک کوئی حریف نہیں ہوسکتا کہ انھوں نے اپنے پیغمبر کے حالات اور واقعات کا ایک ایک حرف اس استقصا کے ساتھ محفوظ رکھا ہے کہ کسی شخص کے حالات آج تک اس جامعیت اور احتیاط کے ساتھ قلم بند نہیں ہو سکے۔ اور نہ آئندہ توقع کی جاتی ہے۔ (ایضاً، ص: ۸)

علامہ تو موجود نہیں کہ ان سے کچھ گزارش کریں؛ لیکن ہر ذی انصاف سے اتنی بات کہنی ہے کہ ''زیاد بکائی'' کے واسطے سے جو ضعف بقول آپ کے پیدا ہو گیا، وہ سیرت ابنِ ہشام میں پیدا ہوگا۔ رہ گئی ابنِ اسحاق کی کتاب تو وہ ''زیاد بکائی'' کے واسطے سے پاک ہے۔ پھر خواہ مخواہ کھینچ تان کر اسے ضعیف بتانا دیانت کا خون کرنا ہے۔

رہ گئی سیرت ابنِ ہشام تو

اولاً:

ابنِ اسحاق کی اصل کتاب ہندوستان میں بھی موجود ہے اور ہندوستان سے باہر بھی موجود ہے- اگرچہ بہت کم- اس سے مقابلہ کر کے ابنِ ہشام کی کتاب میں ''زیاد بکائی'' کے واسطے سے جو ضعف بقول آپ کے پیدا ہو گیا ہے دور کیا جا سکتا ہے۔

ثانیاً:

زیاد بکائی کا رتبہ آپ کو بھی تسلیم ہے، ان کا یہ مسلمہ رتبہ کس سلسلے میں ہے، ان کا یہی رتبہ آپ ظاہر کر دیتے تو آپ کی حق پرستی پر کسی کو کوئی شبہ نہیں ہوتا، زیاد بکائی سیر و مغازی میں بالاتفاق ثقہ و مستند ہیں، ابن مدینی، ابوحاتم، نسائی کا ان پر طعن وہی درجہ رکھتا ہے جو ابن اسحاق وغیرہ پر طعن

کا ہے۔

ثالثاً:

اس طعن کا حاصل صرف یہ کہ وہ ضعیف الروایۃ ہیں۔اور فضائل وسیر میں روایات ضعا ف بالا جماع مقبول ہیں جس کی مفصل بحث ابھی آتی ہے، رہ گئی طبقات ابن سعد جب کہ امام واقدی کا ثقہ ومستند ہونا ثابت ہو چکا تو اس کتاب کے نصف سے زائد حصہ کا مستند ومقبول ہونا ثا بت ہوگیا، رہ گئیں نصف سے کم روایتیں ان میں بعض کا ثقہ ہونا آپ کو بھی مسلم، اس بعض سے آپ کی مراد کیا ہے اکثر یا اقل؟ اگر اکثر مراد ہیں تو آپ ہی کی تحقیق کے مطابق طبقات کا ربع سے بھی کم غیر مامون رہا۔اور آگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ کسی کتاب میں کچھ حصہ اگر رطب و یابس ہے تو وہ کتاب غیر معتمد نہیں کہی جاتی، ورنہ امان اٹھ جائے، کوئی کتاب سوائے قران مجید کے مستند نہ رہے گی۔

طبری کی تاریخ کبیر کے بعض رواۃ مثلاً ابرش سلمہ وابن سلمہ وغیرہ پر جو طعن ہے وہ اولاً مرجوح ہیں۔

اور ثانیاً ان کا مفاد یہی ہے کہ وہ ضعیف ہیں اور سیر ومغازی میں ضعاف بالاتفاق مقبول ہیں، جیسا کہ آپ نے خود ابنِ معین کا قول نقل کیا ہے کہ وہ سیر ومغازی میں ان کی توثیق کرتے تھے اور ان کی سیرت کو بہترین سیرت کہتے تھے۔

حیرت بالائے حیرت یہ ہے کہ اس زور شور کی تنقید کے بعد جو نتیجہ نکلا وہ صرف اتنا:

''اس بنا پر مجموعی حیثیت سے سیرت کا ذخیرہ کُتبِ حدیث کے ہم پلہ نہیں، البتہ ان میں تحقیق وتنقید کے معیار پر جو اتر جائے وہ حجت واستناد کے قابل ہے

اس نتیجے کو دیکھ کر ہمیں شبہ ہوتا ہے کہ یہ نتیجہ ان ہی مقدمات کا ہے جو ابھی مذکور ہوئے یا کسی اور کا پھر یہ کہ اولاً کس نے یہ دعوی کیا ہے کہ کتب سیر، کتب احادیث کے ہم پلہ ہیں۔ پھر اس کی تغلیط کے لیے آپ نے اتنی زحمت کیوں اٹھائی!

ثانیاً:۔ان کا مفاد یہی ہے کہ وہ ضعیف ہیں اور سیر ومغازی میں ضعاف بالاتفاق مقبول ہیں جیسا کہ آپ نے خود ابن معین کا قول نقل کیا ہے کہ وہ سیر ومغازی میں ان کی توثیق کرتے

تھے۔اوران کی سیرت کو بہترین سیرت کہتے تھے۔

حیرت بالائے حیرت یہ ہے کہ اس زور وشور کی تنفید کے بعد جو نتیجہ نکلا وہ صرف اتنا۔

''اس بنا پر مجموعی حیثیت سے سیرت کا ذخیرہ کتب حدیث کے ہم پلہ نہیں البتہ ان میں تحقیق وتنفید کے معیار پر جو اتر جائے وہ حجت اور استناد کے قابل ہے۔'' (ایضاً،ص:۴۵)

اس نتیجے کو دیکھ کر ہمیں شبہ ہوتا ہے کہ یہ نتیجہ انھی مقدمات کا ہے جو ابھی مذکور ہوئے یا کسی اور کا۔پھر یہ کہ

اولاً: کس نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ کُتبِ سیر، کتب حدیث کہ ہم پلہ ہیں۔پھر اس کتاب کی تلغیط کے لیے آپ نے اتنی زحمت کیوں اٹھائی؟

ثانیاً: آپ کا دعویٰ یہ تھا یہ کتابیں مستند نہیں اور ثابت یہ ہوا کہ کُتبِ حدیث کے ہم پلہ نہیں۔کسی فن کی کتابیں اگر کُتبِ حدیث کے ہم پلہ نہ ہوں تو ان کا غیر مستند ہونا کیسے لازم؟ سیرت کا درجۂ استناد مخصوص ہے اور احادیث کا مخصوص۔اگر ایک فن اپنے اعلیٰ فن سے فروتر ہو تو اس کو بے اعتبار کہنا کیسے صحیح ہے؟ اس طرح تو ایک بے باک یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ کتبِ احادیث غیر مستند ہیں ،دلیل یہ دے کہ قرآن کے ہم پلہ نہیں اور جب علم حدیث کا یہ حال ہے تو علم فقہ وتفسیر سب صاف۔ یہ تحقیق ہے یا علوم دینیہ کے تباہ وبرباد کرنے کی یوروپین مشین؟

ثالثاً: یہ بات تو حق ہے کہ فنِ سیرت ،فنِ حدیث کے بلند درجہ کے مساوی نہیں۔مگر آپ یہ بھی نہیں کہہ سکتے؛اس لیے کہ آپ کی تنفید کی رَو جتنی تیز کتبِ سیر کی طرف ہے اتنی ہی کتبِ حدیث کی طرف بھی ہے۔آپ نے ہی احادیث کی مسلم الثبوت کثیر کتابوں کے بارے میں لکھا:

''ان کتابوں کی قسم میں کثرت سے جھوٹی حدیثیں موجود ہیں جن پر اعتماد کرنا جائز نہیں۔''

مستدرک کے بارے میں تحریر فرمایا:

''اس میں بہت سی چھوٹی اور موضوع حدیثیں موجود ہیں۔''

آپ ہی نے اصفہانی ،ہیثم بن سلیمان ،ابونعیم،ابوبکر خطیب،ابوالفضل،ابوموسیٰ مدینی،ابن عساکر،عبدالغنی وغیرہ کی کتابوں کے بارے میں یہ رائے ظاہر کی:

''ان میں بہت سی ضعیف اور موضوع اور مہمل حدیثیں ہیں۔''

آپ نے ہی وہ حدیث جس میں وقتِ ولادت ایوانِ کسریٰ کے کنگرے گرنے کا ذکر ہے، بیہقی، ابونعیم، خرائطی، ابن عساکر اور ابن جریر کی روایت کے باوجود یہ کہہ کے رد کر دیا کہ وہ بخاری، مسلم اور صحاح ستہ میں نہیں۔

آپ ہی نے صحاحِ ستہ کی کثیر احادیث کو صرف اس بنا پر ناقابلِ قبول بتایا کہ وہ آپ کے خیال میں دلائلِ عقلیہ وقرائن کے مطابق نہ تھیں۔ جب آپ کی تحقیق کے بموجب تمام کتبِ حدیث، کتب سیر کی طرح احادیثِ موضوعہ، مکذوبہ، مہملہ ومردودہ پر مشتمل ہیں تو آپ کس منطق سے کتبِ احادیث کے کتبِ سیر پر تفوّق کی جانب اِن الفاظ میں اشارہ کر رہے ہیں:

''اس بنا پر سیرت کا ذخیرہ کتبِ حدیث کے ہم پلہ نہیں۔''

اب تو آپ کو اور آپ نہیں رہے تو آپ کے مقلدین کو نہایت اطمینان کے ساتھ اعلان کر دینا چاہیے کہ

احادیث کا ذخیرہ ہماری تحقیق کے ہم پلہ نہیں، البتہ جو تحقیق وتنقید کے معیار پر اتر جائے وہ حجت اور استناد کے قابل ہے اور اگر کوئی محدثین کے ثقہ اور عادل، ضابط، محتاط ہونے کو پیش کرے تو صاف صاف اپنی یہ تحقیق پیش کر دیں:

''لیکن افسوس ہے کہ ان لوگوں کا مستند ہونا ان کی تصانیف کے مستند ہونے پر چنداں اثر نہیں ڈالتا، ان لوگوں نے خود حضور سے نہیں سنا ہے، جو کچھ بیان کرتے ہیں وہ راویوں کے ذریعہ بیان کرتے ہیں، لیکن ان کے بہت سے رُواۃ ضعیف الروایۃ اور غیر مستند ہیں۔''

فنِ سیرت کی گردن پر یہ چھری صرف اس بنا پر چلائی گئی ہے کہ علامہ کا گمان یہ تھا:

''مسلمانوں نے اس فنِ سیرت کا جو معیار قائم کیا، وہ اس سے بہت زیادہ بلند تھا، اس کا پہلا اصول یہ تھا کہ جو واقعہ بیان کیا جائے اس شخص کی زبان سے بیان کیا جائے جو خود شریک واقعہ تھا اور اگر خود نہ تھا تو شریک واقعہ تک تمام راویوں کا نام بہ ترتیب بتایا جائے، اس کے ساتھ یہ بھی تحقیق کی جائے کہ جو اشخاص سلسلۂ روایت میں آئے کون لوگ تھے، کیسے تھے، کیا مشاغل تھے، چال چلن کیسا تھا، حافظہ کیسا تھا، سمجھ کیسی تھی، ثقہ تھے کہ غیر ثقہ، سطحی الذہن تھے یا دقیق بیں، عالم

تھے یا جاہل۔(ایضاً،ص:۳۵)

فن سیرت کا اتنا بڑا معیار سمجھنا ہی بنیادی غلطی ہے، یہ عقائد واحکام کے لیے معیار ہے، مگر سیر ومغازی فضائل ومناقب کے لیے ہرگز نہیں، ائمۂ سیر اور محدثین سب اس بات پر متفق ہیں کہ سیر ومغازی میں موضوع کے علاوہ ہر قسم کی روایتیں مقبول ہوں گی، ظاہر ہے بانیانِ فن کے قائم کردہ معیار کے علاوہ جدید معیار قائم کر کے فنِ سیرت کو پرکھا جائے گا، تو سوائے بھٹکنے اور ٹھوکریں کھانے کے اور کیا حاصل ہوگا؟

جس طرح آیاتِ قرآنیہ کے معیار پر احادیث کو پرکھنے سے احادیث غیر مستند نظر آئیں گی، اسی طرح احادیث کے بلند معیار پر سیر ومغازی کو پرکھنے سے یہ کھوٹی دکھائی دیں گی، مگر یہ حقیقت میں فنِ سیرت کا کھوٹ نہیں؛ بلکہ نقاد کی ذہنیت کا کھوٹ ہے، اب آیئے علماے سیر وائمۂ محدثین کے ارشادات سنیے:

(۱)

امام زین الدین عراقی سیرت منظوم میں فرماتے ہیں:

وَلِيَعْلَمَ الطَّالِبُ اَنَّ السِّيَرَ يَجْمَعُ مَا صَحَّ وَمَا قَدْ اَنْكَرَ.

طالب کو معلوم ہو کہ فن سیرت صحیح اور منکر سب کو جمع کرتا ہے۔

(۲)

امام احمد بن حنبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

إِبْنُ إِسحاقَ رَجلٌ تُكْتَبُ عَنْهُ هٰذِهِ الاَحَادِيْثُ يَعْنِيْ الْمَغَازِيْ وَنَحْوِهَا وَإِذَا جَاءَ الْحَلَالُ وَالْحَرَامُ اَرَدْنَا قَوْمًا هٰكَذَا وَقَبَضَ الْاَصَابِعَ الْاَرْبَعَ.

(فتح المغیث)

ابن اسحاق اس درجہ کے آدمی ہیں کہ ان سے مغازی وغیرہ کی حدیثیں مقبول ہیں اور جب حلال وحرام کی باری آتی ہے تو ہم سب ایسے لوگوں کو چاہتے ہیں اور اپنی انگلیاں دبا کر بند کر لیں۔

(۳)

امام بیہقی نے کتاب ''المدخل'' میں ابن مہدی کا یہ قول نقل کر کے ثابت رکھا:

اِذَا رَوَیْنَا فِی الْحَلَالِ وَا لْحَرَامِ وَالْاَ حْکَامِ شَدَّدْنَا فِی الْاَسَا نِیْدِ وَ انْتَقَدْنَا فِی الرِّجَالِ وَاِ ذَا رَوَیْنَا فِی الْفَضَائِلِ وَا لثَّوَابِ وَالْعِقَابِ سَهَّلْنَا الْاَسَانِیْدَ وَتَسَامَحْنَا فِی الرِّ جَالِ.

جب ہم حلال وحرام میں روایت کرتے ہیں تو سند مین شدت کرتے ہیں، راویوں کو پرکھ لیتے ہیں، اور جب فضائل، ثواب وعقاب میں روایت کرتے ہیں تو سند میں نرمی کرتے ہیں، اور راویوں کے متعلق چشم پوشی کرتے ہیں۔

یہ تینوں عبارتیں سیرت النبی میں بھی ہیں۔

(۴)

علامہ حلبی ''سیرۃ انسان العیون'' مین فرماتے ہیں:

لَا یَخْفٰی اَنَّ السِّیَرَ یَجْمَعُ الصَّحِیْحَ وَ السَّقِیْمَ وَا لضَّعِیْفَ وَ الْبَلَاغَ وَ الْمُرْ سَلَ وَ الْمُنْقَطِعَ وَ الْمُعْضَلَ دُوْنَ الْمَوْ ضُوْعِ وَ قَدْ قَا لَ الْاِ مَامُ اَحْمَدُ وَ غَیْرُهٗ مِنَ الْاَ ئِمَّةِ اِذَا رَوَیْنَا فِی الْحَلَالِ وَالْحَرَا مِ شَدَّدْنَا وَاِذَا رَوَیْنَا فِی الْفَضَا ئِلِ وَ نَحْوِهَا تَسَامَحْنَا۔

پوشیدہ نہ رہے کہ فن سیرت موضوع کے علاوہ صحیح، سقیم، ضعیف، بلاغ، مرسل، منقطع، معضل سب کو جمع کرتا ہے۔ امام احمد وغیرہ ائمہ نے فرمایا: ہم جب حلال وحرام میں روایت کرتے ہیں تو سختی کرتے ہیں، اور فضائل وغیرہ کی روایت کرتے ہیں تو نرمی کرتے ہیں۔

(۵)

علامہ عبدالباقی زرقانی شرح مواہب اللدنیہ میں تحریر فرماتے ہیں:

عَا دَةُ الْمُحَدِّثِیْنَ اَلتَّسَا هُلُ فِی غَیْرِ الْاَ حْکَامِ وَالْعَقَا ئِدِ مَا لَمْ یَکُنْ مَوْضُوْعًا.

محدثین کی عادت ہے کہ احکام وعقائد کے غیر میں نرمی کرتے ہیں جب تک کہ موضوع

نہ ہو۔

(۶ تا ۱۰)

مقدمۂ امام ابوعمرو بن الصلاح ومقدمۂ جرجانیہ وشرحِ الفیہ للمصنف وتقریب النواوی اورتدریب الراوی میں ہے:

وَ اللَّفْظُ لِلْاَخِیْرَیْنِ یَجُوْزُ عِنْدَ اَھْلِ الْحَدِیْثِ وَ غَیْرِھِمْ اَلتَّسَاھُلُ فِی الْاَسَانِیْدِ الضَّعِیْفَۃِ وَ رِوَایَۃِ مَا سِوَی الْمَوْضُوْعِ مِنَ الضَّعِیْفِ وَالْعَمَلِ بِہٖ مِنْ غَیْرِ بَیَانِ ضُعْفِہٖ فِی فَضَائِلِ الْاَعْمَالِ وَ غَیْرِھَا مِمَّنْ لَا تَعَلُّقَ بِہٖ بِالْعَقَائِدِ وَ الْاَحْکَامِ وَ مِمَّنْ نُقِلَ عَنْہُ ذٰلِکَ ابْنُ حَنْبَلٍ وَ ابْنُ مَھْدِیٍّ وَ ابْنِ الْمُبَارَکِ قَالُوْ إِذَا رَوَیْنَا فِی الْحَلَالِ وَ الْحَرَامِ شَدَّدْنَا وَ إِذَا رَوَیْنَا فِی الْفَضَائِلِ وَ نَحْوِھَا تَسَاھَلْنَا.

محدثین کے نزدیک فضائلِ اعمال وغیرہ میں -جن کو عقائد واحکام سے تعلق نہیں- ضعیف سندوں میں نرمی برتنا اور موضوع کے علاوہ ہر ضعیف کو اس کا ضعف بیان کیے بغیر روایت کرنا، اُس پر عمل کرنا جائز ہے۔ جن لوگوں سے یہ منقول ہے اُن میں امام احمد بن حنبل، ابن مہدی اور ابن مبارک بھی ہیں، اِن لوگوں نے فرمایا کہ ہم جب حلال وحرام میں روایت کرتے ہیں تو سختی کرتے ہیں اور فضائل وغیرہ میں نرمی برتتے ہیں۔

اِن کے علاوہ نصوص، کثیر ہیں کتنی نقل کی جائیں؟ ناظرین انھیں بغور پڑھیں، اِن پر واضح ہوجائے گا کہ ائمۂ سیر کے ساتھ جملہ محدثین کا اس پر اجماع ہے کہ عقائد واحکام چھوڑ کر سیر، مغازی، فضائل ومناقب میں موضوع کے علاوہ ہر قسم کی روایت مقبول ومستند ہے۔ سیر ومغازی کا جو معیار ہے اس کے لحاظ سے روایتِ ضعاف بھی اس باب میں حجت ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ فنِ سیرت ہی سرے سے غیر معتبر اور غیر مستند ہے؛ بلکہ یہ ہے کہ سیر ومغازی میں جن امور کو بیان کرنا مقصود ہوتا ہے، اُن کا اثبات، احادیثِ متواترہ یا مشہورہ یا صحاح یا حسان ہی پر موقوف نہیں؛ بلکہ یہ اُمور صحاح وحسان کے علاوہ اُن روایات سے بھی ثابت ہوجاتے ہیں جنھیں محدثین اپنی اصطلاح میں ضعیف کہتے ہیں؛ کیوں کہ ضعیف کے معنی یہ

نہیں کہ وہ جھوٹی روایت ہے اور من گھڑت کہانی ہے۔ روایتِ ضعیفہ کے معنی صرف یہ ہیں کہ باعتبارِ اصطلاح، روایت کو صحیح وحسن کہنے کے لیے جس درجے اور جن شرائط کے مستجمع راوی درکار ہیں، اِس کے راوی اُس اعلیٰ درجے کے نہیں۔ اِس کا ماحاصل صرف یہ ہے کہ صحیح اور حسن سے جس اعلیٰ درجے کا صدق حاصل ہوتا ہے، روایتِ ضعیف سے اس اعلیٰ درجے کا صدق نہیں حاصل ہوتا۔

صدق جس طرح صحیح اور حسن سے حاصل ہوتا ہے، ضعیف سے بھی حاصل ہوتا ہے۔ اگرچہ درجے میں اُس سے کم ہوتا ہے اور فنِ سیرت میں جس درجے کا صدق درکار ہے، وہ ضعیف سے بھی حاصل ہوجاتا ہے، اس کی تفصیل یہ ہے:

مدعا جس حیثیت کا ہوتا ہے اسی حیثیت کی دلیل کی حاجت ہوتی ہے، ایک وہ مدعا ہے جو اعلیٰ درجے کا ہے، جیسے: عقائد کے وہ مسائل جو مدارِ کفر وایمان ہیں، اُن کے ثبوت کے لیے ایسی قطعی دلیل کی حاجت ہے جس میں شک وشبہ کی ذرا بھی گنجائش نہ ہو، اِس باب میں احادیثِ آحاد- اگرچہ صحیح ہوں، اگرچہ صحیحین کی ہوں- حجت نہیں۔ یہاں صرف قرآنِ مجید اور احادیثِ متواترہ حجت ہیں۔

دوسرے وہ مدعا جو اوسط درجے کا ہے، جیسے: حلت وحرمت، اِس کا ثبوت ایسی قطعی دلیل پر موقوف نہیں، تاہم اِس کے ثبوت کے لیے ایسی دلیل ضروری ہے جو مفیدِ ظنِ غالب ہو، اس کے لیے احادیثِ صحیحہ وحسنہ- اگرچہ وہ آحاد ہو- کافی ہیں، اگرچہ وہ صحیحین میں نہ ہوں، اگرچہ وہ صحاحِ ستہ میں نہ ہوں۔

تیسرے وہ مدعا جو اُس سے بھی ادنیٰ ہے، اِس کا ثبوت دلیلِ قطعی پر موقوف ہے نہ ایسی مرجح الصدق دلیل پر جو رواۃ کے اعلیٰ درجے کے ثقہ اور عادل اور سند کے اتصال اور علل قادحہ سے خالی ہوئے بغیر حاصل نہیں ہوتا، جیسے: کسی معزز فی الدین انسان یا محمود عند الشرع فعل کی مخصوص یا غیر مخصوص فضیلت کا ثبوت۔ یہ احادیثِ صحیحہ حسنہ کے علاوہ ضعاف سے بھی ثابت ہوتا ہے؛ البتہ موضوع یہاں بھی ناقابل قبول ہے، موضوع حدیث ہی نہیں؛ بلکہ کسی بدطینت انسان کی من گھڑت ہے۔

اب آیئے! ہم اور آپ غور کریں کہ سیرت کے جزئیات کا درجہ اِن تینوں میں سے

کس درجہ پر ہے؟ جو بھی عاقل، منصف غور کرے گا وہ اسی نتیجے پر پہنچے گا کہ اس کا مقام تیسرا ہے، کیوں کہ ظاہر ہے کہ جزئیاتِ سیر و مغازی کا انکار نہ کفر ہے نہ موجبِ اثم۔ اس لیے ابوابِ مغازی و سیر میں تیسرے درجے کی روایات جنھیں ضعیف کہتے ہیں مستند ہیں۔ جس طرح واجبات و مکروہات کے اثبات کے لیے آیاتِ قرآنیہ یا احادیثِ متواترہ تلاش کرنا تکلیف مالا یکلف اور اصولِ شرع سے نابلدی ہے۔ اسی طرح مغازی و سیر [اور] فضائل و مناقب کے لیے احادیثِ صحیحہ متصلہ کی تحدید اپنے اوپر شدت بیجا لازم کرنا اور اصول دین سے بے خبری ہے۔

ضعیف اور موضوع کا فرق

اب جب کہ دلائل عقلی و نقلی سے ثابت ہو چکا کہ سیر و مغازی میں موضوع کے علاوہ ہر قسم کی روایات مقبول ہیں تو یہ بھی ضروری ہوا کہ اِس کی بھی توضیح کرتے چلیں کہ موضوع اور ضعیف میں فرق کیا ہے؟ اس کی ضرورت یوں اور زیادہ بڑھ جاتی ہے، جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ حضرت علامہ اور اُن کے مقلدین جس روایت کو رد کرنا چاہتے ہیں اُس پر اتنی جرح کافی سمجھتے ہیں کہ کسی نے اس کے بارے میں یہ کہہ دیا ہو:

''یہ صحیح نہیں، یہ ثابت نہیں، اس کا رفع ثابت نہیں، یہ شاذ ہے، منکر ہے، متروک ہے۔''

اس سے ان عوام میں جو محدثین کی اصطلاح سے واقف نہیں، یہ غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے کہ غالباً یہ سب موضوع کی تعبیرات ہیں۔

موضوع اگرچہ ضعیف ہی کی قسم ہے؛ مگر کتبِ قوم میں یہ دونوں بحیثیت قسیم مستعمل ہیں، جیسے عرفِ عام میں انسان اور حیوان؛ کہ اگرچہ حقیقت میں انسان، حیوان کی ایک نوع ہے، مگر عرفِ عام میں دونوں متقابل معنوں میں بولے جاتے ہیں؛ اس لیے اثباتِ ضعف سے اثباتِ وضع لازم نہیں آتا۔

یوں ہی کسی حدیث کے بارے میں محدثین کے یہ کہہ دینے سے کہ ''یہ صحیح نہیں'' حدیث کا موضوع ہونا تو درکنار، ضعیف ہونا بھی لازم نہیں آتا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ حسن ہو؛ بلکہ بعض ائمۂ نقد نے ''لا یصح'' کو عدم وضع کی دلیل بتایا، اس کی تفصیل یہ ہے:

''صحیح'' اُن کی اصطلاح میں اس حدیث کو کہتے ہیں جس کے تمام رواۃ کا اعلیٰ درجے کا حفظ وضبط پر فائز ہونا ثابت ہو، اُس کی سند متصل اور علتِ شذوذ ونکارت سے خالی ہو، اِن تمام شرائط کا اجتماع اور اس کے خلاف کا ارتفاع بہت کم ہوتا ہے، پھر اِن شرائط کے اثبات میں بڑی دشواریاں ہیں۔ محدثین اِن شرائط میں جہاں کچھ کمی دیکھتے ہیں، فرمادیتے ہیں: یہ حدیث صحیح نہیں، اس کا حاصل صرف یہ ہے کہ صحیح ہونے کے لیے جن جن شرائط کی ضرورت ہے، وہ سب اس میں موجود نہیں۔

صحیح کے بعد حسن کا درجہ ہے، ''لا یصح'' کا مطلب کبھی یہ ہوتا ہے کہ یہ حسن ہے۔

''حسن'' وہ حدیث ہے جس میں صحیح ہونے کے بعض شرائط میں وہ معیار نہ پایا جائے جو صحیح ہونے کے لیے ضروری ہے، فی نفسہٖ اس میں کوئی نقص نہیں ورنہ حسن نہ کہلاتی، ناقص کہلاتی، حدیثِ حسن میں جو تنزل ہے وہ اگر کسی طرح منجبر ہوجائے تو اسے ''صحیح لغیرہٖ'' کہتے ہیں، حدیثِ حسن سیر وفضائل کے علاوہ احکام میں بھی حجت ہے۔

حسن کے بعد ''ضعیف'' کا درجہ ہے جس کی تعریف یہ ہے کہ حدیثِ صحیح وحسن میں جو شرائط معتبر ہیں ان میں سے کل یا بعض مفقود ہوں، اس کے تین درجے ہیں:

''ضعیف بہ ضعفِ اخف'' جس میں راوی پر اختلاط وسوء حفظ جیسے ہلکے طعن ہوں۔

پھر ''ضعیف بہ ضعفِ خفیف'' جیسے فسق وکذب وغیرہ شدید جرحوں سے راوی مطعون ہو۔

تیسرے ''ضعیف بہ ضعفِ شدید'' کہ اصلاً حدیث ہی نہ ہو؛ بلکہ کسی بے باک کی من گھڑت ہو یہی موضوع ہے۔

''ضعیف بہ ضعفِ اخف'' جابر سے قوت پاکر ''حسن لغیرہٖ'' بلکہ ''صحیح لغیرہٖ'' کی منزل تک پہنچ جاتی ہے، یہ کل سات قسمیں ہوئیں۔

① صحیح لذاتہ ② صحیح لغیرہ ③ حسن لذاتہ،
④ حسن لغیرہ ⑤ ضعیف بہ ضعف اخف،

⑥ ضعیف بہ ضعف ⑦ خفیف موضوع۔

پہلی چار قسمیں احکام، سیر و مغازی و فضائل و مناقب سب میں لائق احتجاج ہیں۔

پانچویں قسم شواہد و متابعات وغیرہ میں مقبول اور جابر سے قوت پا کر حسن لغیرہ یا صحیح لغیرہ کے رتبے کو پہنچ جائے تو احکام میں بھی معتمد۔

چھٹی قسم احکام میں غیر مقبول ہے، مگر سیر و مغازی و فضائل و مناقب میں بالا جماع مستند ہے۔

ساتویں قسم نہ حدیث ہے نہ اس کا کہیں اعتبار ہے۔

ہر منصف فیصلہ کرے کہ ''لا یصح'' کہنے سے صحیح کی نفی ہوئی۔ صحیح اور موضوع کے مابین پانچ قسمیں ہیں۔ یہ کسی عاقل کی سمجھ میں آ سکتا ہیں کہ اعلیٰ کی نفی سے سب سے ادنیٰ کا اثبات ہو گیا؟

اسی بنا پر علما نے تصریح کی ہے:

بَیْنَ قَوْلِنَا لَا یَصِحُّ وَ بَیْنَ قَوْلِنَا مَوْضُوْعٌ بَوْنٌ کَبِیْرٌ فَاِنَّ الْوَضْعَ ۔ اِثْبَاتُ الْکِذْبِ وَالْاِ خْتِلَاقِ وَ قَوْ لُنَا لَمْ یَصِحُّ لَا یَلْزِمُ مِنْهُ الْعَدْمُ اِنَّمَا هُوَ اِخْبَارٌ عَنْ عَدْمِ الثُّبُوتِ وَفَرْقٌ بَیْنَ الْاَمْرَیْنِ.

(کتاب النکت علی ابن الصلاح للعلامۃ الزرکشی، تنزیہ الشریعہ، لألی مصنوعۃ، خاتمۃ مجمع بحار الانوار)

ہمارے ان دونوں قول میں:

''یہ صحیح نہیں'' اور ''یہ موضوع ہے'' بہت بُعد ہے، اس لیے کہ وضع جھوٹ اور من گھڑت ثابت کرنا ہے۔

اور ہمارے اس کہنے سے کہ ''صحیح نہیں''، حدیث نہ ہونا لازم نہیں آتا، یہ تو صرف عدم ثبوت کو بتاتا ہے اور دونوں میں بہت فرق ہے۔

اسی عبارت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ محدثین کے یہ فرمانے سے کہ ''ثابت نہیں''، ثبوت وضع نہیں ہوتا۔

حلیہ شرح منیہ میں ہے:

قَوْلُ التِّرْمِذِیْ لَمْ یَصِحَّ مِنَ النَّبِیِّ ﷺ فِیْ ھٰذَا الْبَابِ شَیْءٌ. انتھی، لایُنَافِیْ وُجُوْدَ الْحَسَنِ وَ نحوَہٗ وَ الْمَطْلُوْبُ لَا یَتَوَقَّفُ ثُبُوْتُہٗ عَلَی الصَّحِیْحِ؛ بَلْ کَمَا یَثْبُتُ بِہٖ یَثْبُتُ بِالْحَسَنِ.

ترمذی کا یہ فرمانا کہ اس باب میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کچھ نہیں، یہ قولِ حسن کے وجود کی نفی نہیں کرتا، اور مطلوب کا ثبوت صرف صحیح پر موقوف نہیں؛ بلکہ جیسے صحیح سے ثابت ہوتا ہے، حسن بھی ثابت ہوتا ہے۔

صواعق محرقہ میں امام ابنِ حجر مکی فرماتے ہیں:

قَوْلُ اَحْمَدَ أَنَّہٗ حَدِیْثٌ لَا یَصِحُّ اَیْ لِذَاتِہٖ، فَلَا یُنَافِیْ کَوْنَہٗ حَسَنًا لِغَیْرِہٖ، اَلْحَسَنُ لِغَیْرِہٖ یُحْتَجُّ بِہٖ کَمَا بُیِّنَ فِی الْحَدِیْثِ.

امامِ احمد کا یہ قول کہ یہ حدیث صحیح نہیں یعنی صحیح لذاتہٖ نہیں ہے، یہ حسن لغیرہٖ کی نفی نہیں [کرتا] اور حسن لغیرہٖ حجت ہے، جیسا کہ علمِ حدیث میں بیان کیا گیا ہے۔

سند الحفاظ علامہ ابنِ حجر عسقلانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ''اذکارِ امام نووی'' کی تخریجِ احادیث میں فرماتے ہیں:

مِنْ نَفْیِ الصِّحَّۃِ لَا یَنْفِی الْحَسَنُ.

صحت [صحیح] کی نفی سے حسن کی نفی نہیں ہوتی۔

موضوعات کبیر میں ہے۔

لَا یَصِحُّ لَا یُنَافِی الْحَسَنَ.

لایصح کہنا حسن کے منافی نہیں۔

علامہ زرقانی فرماتے ہیں:

نَفْیُ الصِّحَّۃِ لَا یُنَافِیْ اَنَّہُ الْحَسَنُ، کَمَا عُلِمَ.

صحیح ہونے کی نفی، اس کے حسن ہونے کی منافی نہیں ہے، جیسا کہ معلوم ہے۔

ان ارشاداتِ علما سے جہاں یہ معلوم ہوا کہ حدیثِ حسن احکام میں بھی مستند اور لائق

احتجاج ہے، وہیں یہ بھی ثابت ہو گیا کہ ''لا یصح'' کہنے سے حسن کی بھی نفی نہیں ہوتی، چہ جائے کہ ثبوتِ وضع ہو۔ ایسا بہت ہوتا ہے کہ ناقدین یہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح نہیں اور وہ حسن ہوتی ہے۔

''لا یصح'' کہنے سے ثبوتِ وضع تو بہت دور ہے، ادنیٰ ضعف بھی لازم نہیں آتا؛ بلکہ بعض علما نے ''لا یصح'' کو موضوع نہ ہونے کی دلیل بتایا۔

موضوعاتِ کبیر میں ہے:

حدیث:

''اَلْبَطِیْخُ قَبْلَ الطَّعَامِ یَغْسِلُ الْبَطَنَ غَسْلًا وَیُذْھِبُ الدَّاءَ اَصْلاً.''

کے متعلق ابنِ عساکر کا قول: ''لا یصح'' نقل کر کے فرماتے ہیں:

ھُوَ یُفِیْدُ اَنَّہٗ غَیْرُ مَوْضُوْعَۃٍ کَمَا لَا یَخْفٰی.

''لا یصح'' کہنا یہ فائدہ دیتا ہے کہ یہ حدیث موضوع نہیں جیسا کہ پوشیدہ نہیں۔

ظاہر ہے کہ اگر یہ حدیث موضوع ہوتی تو صاف صاف فرما دیتے: ''یہ موضوع ہے۔'' صرف ''لا یصح'' پر اکتفا نہیں کرتے۔

ناظرین غور کریں! آج کسی حدیث کے بارے میں ''لا یصح'' کہیں مل گیا تو بغیر یہ تحقیق کیے ہوئے کہ ''لا یصح'' کہنے والا کون ہے؟ اور اس کا مطلب کیا ہے؟ اور حقیقت بھی وہی ہے جو قائل نے کہی ہے یا اس کے برعکس ہے؟ حدیث کو پوری بے دردی کے ساتھ مردود و مطرود کر دیتے ہیں اور خود ''لا یصح'' کہنے والے اس کا مطلب یہ بتا رہے ہیں کہ ''لا یصح'' کہنے سے حدیث کا ضعیف ہونا لازم نہیں آتا، حدیثِ حسن کو بھی ''لا یصح'' کہہ دیتے ہیں، اسے مستند و معتمد بتاتے ہیں؛ بلکہ ''لا یصح'' کو موضوع نہ ہونے کی دلیل بتاتے ہیں اور یہ سخن فہم لوگ اس کا صرف یہی مطلب لیتے ہیں کہ یہ غیر مقبول ہیں، غیر مستند ہے، مردود ہے، مطرود ہے۔

اسی طرح آپ کو جگہ جگہ ملے گا کہ ذرا سا کسی روایت کے بارے میں معلوم ہوا، بس اسے رد کر دیا۔ حالاں کہ سند میں کسی راوی کا مجہول ہونا، صحتِ حدیث میں قادح ہونا علما میں مختلف فیہ ہے، اور اگر ہے بھی تو اس حد تک کہ مورثِ ضعف ہے، نہ کہ موجب وضع، اس کی توضیح یہ ہے کہ

مجہول کی تین قسمیں ہیں: مستور، مجہول العین، مجہول الحال۔

مستور: وہ ہے جس کی عدالت ظاہری معلوم ہو، باطنی کی تحقیق نہ ہو۔

مجہول العین: وہ ہے جس سے صرف ایک شخص نے روایت کی ہو۔

مجہول الحال: وہ ہے جس کی عدالت ظاہری ہو اور باطنی کسی کی تحقیق نہ ہو۔

مستور کی روایت جمہور محققین کے نزدیک مقبول ہے اور قطعاً مُخِلِّ صحت نہیں۔ چناں چہ صحیح مسلم میں اس قسم کے راویوں کی کثیر روایتیں موجود ہیں، فتح المغیث میں ہے:

قَبِلَهُ اَبُوْ حَنِيْفَةَ خِلَافًا لِّلشَّافِعِيِّ.

مستور کی روایت امام ابوحنیفہ نے قبول فرمائی، امام شافعی کا اس میں اختلاف ہے۔ امام نووی نے اس کی تصحیح فرمائی، امام عمرو بن صلاح نے اس کو مختار فرمایا۔ یعنی مستور کی روایت کے مقبول ہونے کو۔

مجہول الحال کو بھی بعض اکابر لائق حجت جانتے ہیں، البتہ جمہور محدثین اس کو ضعیف مانتے ہیں؛ بلکہ امام نووی نے مجہول العین کے بھی مقبول ہونے کو محققین کی طرف منسوب کیا، مقدمۂ منہاج میں فرماتے ہیں:

اَلْمَجْهُوْلُ اَقْسَامٌ: مَجْهُوْلُ الْعَدَالَةِ ظَاهِرًا وَّ بَاطِنًا وَ مَجْهُوْلُهَا بَاطِنًا مَعَ وُجُوْدِهَا ظَاهِرًا وَّ هُوَ الْمَسْتُوْرُ وَ مَجْهُوْلُ الْعَيْنِ، فَاَمَّا الْاَوَّلُ فَالْجُمْهُوْرُ عَلٰى اَنَّهٗ لَا يُحْتَجُّ بِهٖ وَ اَمَّا الْاٰخَرَانِ فَاحْتَجَّ بِهِمَا كَثِيْرُوْنَ مِنَ الْمُحَقِّقِيْنَ.

مجہول کی چند قسمیں ہیں:

ایک وہ جس کی عدالت ظاہری و باطنی دونوں نہ معلوم ہو۔

دوسرے وہ کہ عدالت ظاہری معلوم ہو باطنی نامعلوم ہو، یہ مستور ہے۔

تیسرے مجہول العین۔

اول تو جمہور کے نزدیک لائق احتجاج نہیں۔ رہ گئے اخیرین تو اکثر محققین اُن سے احتجاج کرتے ہیں۔

عارف باللہ امام ابوطالب مکی نے اسی کو اولیاے کرام اور فقہا کا مسلک بتایا۔ ''قوت

القلوب‘‘میں فرماتے ہیں:

بَعْضُ مَا اُضْعِفَ بِهٖ رُوَاةُ الْحَدِيْثِ وَ تُعَلَّلُ بِهٖ اَحَادِيْثُهُمْ لَا يَكُوْنُ تَعْلِيْلًا وَ لَا جَرْحًا عِنْدَ الْفُقَهَاءِ وَلَا عِنْدَ الْعُلَمَاءِ بِاللّٰهِ تَعَالٰى ،مِثْلَ اَنْ يَّكُوْنَ الرَّاوِيْ مَجْهُوْلًا لِإِيْثَارِهِ الْخُلُوَّ وَ قَدْ نَدُبَ اِلَيْهِ وَ لِقِلَّةِ الْاِ تِّبَاعِ لَهٗ إِذْ لَمْ يَقَعْ لَهُمُ الْاَثَرَةُ عِنْدِيْ.

بعض وہ باتیں جن سے رواۃ اور احادیث کی تضعیف وتعلیل کی جاتی ہے، فقہا اور اولیا کے نزدیک طعن و جرح نہیں۔ جیسے راوی کا مجہول ہونا؛ کیوں کہ اس نے گم نامی پسند کی اور یہ شریعت میں پسندیدہ بھی ہے۔ یا اس کے تلامذہ کم ہونے کی وجہ سے، اس بنا پر لوگوں کو اس سے روایت کا موقع کم ملا۔

المختصر اس میں اختلاف ہے کہ جہالتِ راوی سرے سے وجودِ طعن میں سے ہے بھی یا نہیں۔ اور جو لوگ اسے طعن مانتے ہیں وہ بھی صرف مورث ضعف بتاتے ہیں، موجب وضع کوئی نہیں کہتا۔ بلکہ اگر کسی نے جہالتِ راوی کی بنا پر حدیث کو موضوع کہا تو علما نے اس کی تردید فرمائی۔

امام بدرالدین زرکشی نے لآلی مصنوعہ میں فرمایا:

لَوْ ثَبَتَتْ جَهَالَتُهُ لَمْ يَلْزَمْ اَنْ يَّكُوْنَ الْحَدِيْثُ مَوْضُوْعًا مَا لَمْ يَكُنْ فِيْ اِسْنَادِهٖ مَنْ يُّتَّهَمُ بِالْوَضْعِ.

اگر مجہول ہونا ثابت بھی ہو جائے تو اس سے حدیث کا موضوع ہونا لازم نہیں آتا، جب تک اس کی اسناد میں کوئی متہم بالوضع نہ ہو۔

علامہ زرقانی فرماتے ہیں:

قَالَ السُّهَيْلِيُّ فِيْ اِسْنَادِهٖ مَجَاهِيْلُ وَهُوَ يُفِيْدُ الضُّعْفَ فَقَطْ.

سہیلی نے کہا اس کی سند میں مجہول ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ ضعیف ہے اور بس۔

یوں ہی راوی پر جن وجوہ سے طعن ہوتا ہے، ان میں کذب ووضع کے علاوہ جتنے وجوہ ہیں، سب زیادہ سے زیادہ مورثِ ضعف ہیں۔ مثبتِ وضع صرف کذب ہے؛ کہ معاذ اللہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھا۔ جس بے باک نے ایک دفعہ بھی عمر میں یہ جرأت کی مدۃ العمر اس کی

حدیث مقبول نہ ہوگی، اگر چہ توبہ کرلے۔ کذب کے علاوہ تمام طعن-سوءحفظ، بدعت، جہالت، مخالفتِ ثقات، وہم، فسق، غفلت، کثرت غلط، حتیٰ کہ تہمتِ کذب تک- سے وضع پر استدلال فاسد، یوں ہی حدیث میں طعن کے جتنے وجوہ ہیں-مثلاً اضطراب، ادراج، تدلیس، نکارت، شذوذ، ارسال، انقطاع وغیرہ-سب کی حدیہ کہ حدیث ضعیف ہوگی۔

پھر ناقدین میں سے بعض بعض بہت متشدد اور مفرط ہوئے ہیں۔ان کا طعن، ان کا حکمِ وضع، لائقِ اعتبار نہیں، مثلاً ابنِ جوزی، ابنِ تیمیہ، ابنِ قیّم وغیرہ۔

ابن جوزی کے بارے میں علما متفق ہیں کہ یہ حدیث کو موضوع کہنے میں بہت جلد باز ہیں، کتنی صحیح احادیث کو موضوع کہہ دیا ہے، حضرت شیخ عبد الحق دہلوی رحمۃ اللہ علیہ مقدمۂ اشعۃ اللمات میں فرماتے ہیں:

ابنِ جوزی را کتابے است در موضوعاتِ حدیث کہ افراط کردہ است در انجا در نسبتِ وضع باحادیث وحکم کردہ است بر بسیارے از احادیث بمجرد توہم ومخالفت انچہ نزدِ وے بود از علم۔ و شیخ ابن حجر عسقلانی در بسیارے از مواضع بروے بحث کردہ وگفتہ اعتماد نیست بروے در نسبت وضع باحادیث۔

ابن جوزی کی موضوعاتِ حدیث میں ایک کتاب ہے، اس کتاب میں احادیث کو موضوع کہنے میں بہت غلو کیا ہے اور بہت سی احادیث کو محض وہم کی بنا پر موضوع کہہ دیا۔اور بہت کو اس بنا پر کہ انھیں جو معلوم تھا اس کے مخالف تھیں، شیخ ابن حجر عسقلانی نے بہت جگہ اس پر بحث کی ہے اور فرمایا کہ ابن جوزی کے کسی حدیث کو موضوع کہنے کا اعتبار نہیں۔

اِن سے کئی ہاتھ آگے ابنِ تیمیہ اور ابنِ قیم ہیں، علماے محتاطین بھی بہر حال انسان تھے۔انھوں نے ہزاروں چھان بین تحقیق وتفتیش کے بعد کسی حدیث کو موضوع کہا؛ مگر بھول چوک کس سے نہیں ہوتی، اس لیے کسی کا کسی حدیث کو موضوع کہنا اور بات ہے۔اور واقع میں اس کا موضوع ہونا اور بات ہے۔

جہاں حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جھوٹ باندھنا استحقاقِ نار کا مُوجب ہے، وہیں قول رسول کو یہ کہنا کہ یہ قول رسول نہیں اسی درجے کا جرم ہے، درحقیقت یہ بھی جھوٹ باندھنا ہے۔اس کو یوں

سمجھیے کہ غیر قرآن کو قرآن کہنا اور قرآن کے کسی جز کو قرآن نہ ماننا دونوں یکساں طور پر کفر ہیں یوں ہی غیر حدیث کو حدیث کہنا اور حدیث کو حدیث نہ ماننا ایک درجے پر ہے۔ اس لیے کسی حدیث کو موضوع کہنے میں جلدی کرنا عندالشرع محمود نہیں ہے۔

اس بارے میں بڑی احتیاط، کامل تتبع اور استقصا کے بعد ہی کسی حدیث کے بارے میں یہ حکم لگایا جا سکتا ہے کہ یہ موضوع ہے۔ وہ بھی برسبیلِ ظن، یہاں یقینی حکم بہت مشکل ہے۔ فَاِنَّ الْکَذُوْبَ قَدْ یَصْدُق۔

حضرت شیخ مقدمہ اشعۃ اللمعات میں فرماتے ہیں:

وحکم بوضع وافترا بحکم ظنِ غالب است، وقطع ویقین را بداں راہ نیست، فان الکذوب قد یصدق۔

وضع وافترا کا حکم ظنِ غالب سے ہے، قطعی یقین کی یہاں کوئی صورت نہیں، اس لیے کہ پکا جھوٹا بھی کبھی سچ بولتا ہے۔

اور حقیقت میں یہ کام ہمارا آپ کا نہیں علماے محدثین نے ہمیں اس سے مستغنی فرما دیا، اس راہ میں سوائے ان کی تقلید کے کوئی چارہ نہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے ایک ناقد نے کسی ایک سند کو سامنے رکھ کر ایک حدیث کو موضوع یا ضعیف کہا، مگر اسی حدیث کی ایک یا زیادہ سندیں ایسی ہوتی ہیں، جن میں خلل نہیں ہوتا اور اس سند سے وہ حسن یا صحیح ہوتی ہے؛ اس لیے اگر کسی ناقد نے کسی حدیث کو موضوع یا ضعیف کہا ہے تو آنکھ بند کر کے اس پر یقین کرنا درست نہیں، دوسرے ناقدین کی رائیں اور دوسرے طُرُق تلاش کرنا ضروری ہے اگر مل جائے تو اس کے مطابق فیصلہ کرنا چاہیے۔

مثلاً ایک طریقے سے وہ موضوع ہے، مگر دوسرے طریقے سے صحیح یا حسن ہے تو اس کو صحیح یا حسن ہی مانیں گے۔ یہ نہیں کے دوسرے طریقوں کے ہوتے ہوئے جو وضع وقدح سے خالی ہیں اس کو موضوع ہی کہیں۔ یوں ہی کسی ناقد نے کسی حدیث کو موضوع کہا، دوسرے اس کو صحیح یا حسن کہتے ہیں یا ضعیف کہتے ہیں، تو دونوں ناقدین کی حیثیت، رتبہ، امت میں اعتبار و اعتماد، دلائل و قرائن کی قوت پر فیصلہ ہوگا۔ یہ نہیں کہ فلاں نے موضوع کہہ دیا تو وہ موضوع ہی ہے، خواہ ساری

امت اسے حدیث مانے، اسے قبول کر لے، یہ وہ اہم اور لطیف نکتے ہیں جن سے غفلت کی وجہ سے لوگ قدم قدم پر ٹھوکریں کھا رہے ہیں اور امت میں انتشار و افتراق کے باعث بن رہے ہیں۔

خلاصۂ ابحاث

ہماری اس کتاب میں مندرجہ ذیل امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، جنھیں تفصیل کے ساتھ اوپر بیان کر آئے۔

① سیر و معازی فضائل و مناقب کے وہ ابواب جو قطعی نہیں، ان میں علاوہ موضوع کے، ہر حدیث اور ہر روایت مستند ہے۔ اِسی پر تمام امت اور علما سیر و معازی کا عمل ہے۔

② عقائد و احکام میں البتہ موضوعات کے ساتھ ضعاف بھی غیر معتمد ہیں، اگر چہ وہ سیر و فضائل کا جز ہوں۔

③ جب تک علماے معتمدین و محتاطین۔ جن پر امت کو اطمینان ہے۔ یہ تصریح نہ کریں کہ یہ حدیث موضوع یا ضعیف ہیں، کسی غیر محتاط متغالی یا متہوّر کے موضوع کہ دینے سے موضوع نہیں ہوگی۔

④ کسی حدیث یا روایت پر کسی محدث کا طعن اسکے ساقط الاعتبار ہونے کے لیے کافی نہیں۔ جب تک اس کی چھان بین نا کر لی جائے۔''

⑤ ''لا یصح، لا یثبت، صحیح نہیں، ثابت نہیں ہے، مجہول ہے، شاذ ہے، منکر ہے، منقطع ہے، مرسل ہے، مدلس ہے، معضل ہے، مضطرب ہے، مدرج، معلل ہے، غریب ہے، اس قسم کی اور جرحیں سیر و مغازی و فضائل و مناقب میں مستند ہونے میں مخِل نہیں؛ بلکہ ان میں سے بعض احکام میں بھی معتمد ہیں۔

⑥ ہاں! تعارض کے وقت کتابُ اللہ، پھر احادیثِ صحاح [و] حسان کو ہمیشہ ترجیح ہوگی۔

⑦ روایتِ مقبولہ کے ہوتے ہوئے محض اپنی راے اور قیاس سے مزاحم ہونے کی وجہ سے کسی مروی کو رد نہیں کیا جا سکتا، ہماری عقل خواہ کتنا ہی اِبا [وانکار] کر لے۔

❁❁❁

نسب نامہ

شَجَرَۃٌ طَیِّبَۃٌ اَصْلُھَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُھَا فِی السَّمَآءِ

محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بن عبداللہ، بن عبدالمطلب، بن ہاشم، بن عبدمناف، بن قصی، بن کلاب، بن مرہ، بن کعب، بن غالب، بن فہر، بن مالک، بن نضر، بن کنانہ، بن خزیمہ، بن الیاس، بن مضر، بن نزار، بن معذ، بن عدنان۔

عدنان تک سلسلۂ نسب متفق علیہ ہے؛ اس لیے علماے محتاطین نے اسی پر اکتفا فرمایا ہے۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنا نسبِ پاک عدنان تک بیان فرما کر خاموش ہوجاتے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ حضرتِ آدم تک سلسلۂ نسب بیان کرنے والوں کے خلاف اس آیت سے استدلال کرتے۔

﴿اَلَمْ یَاْتِکُمْ نَبَاُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ وَ الَّذِیْنَ مِنْ بَعْدِھِمْ لَا یَعْلَمُھُمْ اِلَّا اللّٰہُ ؕ﴾

(سورۂ ابراہیم: ۱۳)

کیا تم لوگوں کے پاس ان لوگوں کی خبر نہیں آتی جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں، جیسے قومِ نوح، عاد، ثمود اور ان کے بعد کی اقوام جن کو سوائے اللہ کے اور کوئی نہیں جانتا۔

اور فرمایا کرتے تھے:

کذب النسابون.

نسّاب جھوٹے ہیں۔

یوں ہی حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''عدنان تک تو معلوم ہے آگے کا پتہ نہیں۔''

حضرت عمر فرماتے ہیں:

''مجھے کوئی ایسا نہیں ملتا جو عدنان کے آگے سلسلۂ نسب جانتا ہو۔''

ایک شخص اپنا نسب نامہ حضرتِ آدم تک بیان کرتا تھا، اس کے بارے میں امام مالک رضی اللہ عنہ سے جب سوال کیا گیا تو امام مالک نے فرمایا:

''اس کو کس نے بتایا ہے؟''

حضراتِ انبیاے علیہم السلام کے نسب کو حضرتِ آدم علیہ السلام تک پہچانے سے امام مالک نے بھی منع فرمایا ہے۔

ظاہر ہے کہ حضرتِ آدم تک تمام اشخاص کے نام معلوم کرنے میں کوئی خاص فائدہ نہیں ہے اور اختلافات کی کثرت کی وجہ سے ناموں میں خلط ملط اور ردو بدل کا قوی اندیشہ ہے؛ لہٰذا ہمیں بھی عدنان پر اکتفا کرنا چاہیے۔ البتہ علماے انساب کا اس پر اتفاق ہے کہ آباے کرام میں عدنان کے آگے حضرت اسماعیل، حضرت ابراہیم، حضرتِ نوح، حضرتِ ادریس، حضرتِ شیث، حضرتِ آدم بالضرور ہیں۔ سلام اللہ علیہم اجمعین۔

''عدنان'' سے حضرت اسماعیل تک امام بخاری نے اپنی تاریخ میں چھ، علامہ عینی نے شرح بخاری میں آٹھ، کسی نے سات، کسی نے پندرہ، کسی نے انتیس، کسی نے تیس، نام گنائے ہیں؛ لیکن صحیح یہ ہے کہ درمیان میں چالیس پشت ہے۔

اسی طرح ''روضۃ الاحباب'' کے حاشیے میں ابن جوزی کی کتاب ''**انساب**'' سے نقل کیا ہے کہ عدنان سے اوپر حضرتِ آدم تک صرف تیس پیڑھیاں ہیں؛ لیکن یہ بھی صحیح نہیں؛ اس لیے کہ علامہ سہیلی نے ''**روض الانف**'' میں تحریر فرمایا ہے کہ عدنان اور حضرتِ اسماعیل کے مابین جو زمانہ ہے وہ اتنا طویل ہے کہ اس میں کسی طرح چالیس پشت سے کم نہیں ہوسکتی۔

یوں ہی علامہ طبری نے تحریر کیا ہے کہ بعض نسب دانوں سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ بعض علماے نسب نے معد سے حضرت اسماعیل تک چالیس نام گنائے ہیں اور وہ اس کی تائید عرب کے اشعار سے کرتے ہیں اور اہل کتاب کی تحقیق بھی یہی ہے۔

علامہ موصوف، ابو یعقوب نامی ایک نومسلم یہودی - تدمر کے باشندے - کا بیان نقل کرتے ہیں کہ میرے پاس ایک نسب نامہ ہے جو ارمیا پیغمبر کے منشی کا تحریر کردہ ہے، اُس میں بھی عدنان سے حضرت اسماعیل تک چالیس پشت ہے۔ تو یہ کیسے باور کیا جائے کہ عدنان سے حضرت

آدم تک تیس ہی پشت ہے۔

عدنان کے نسب نامے میں اتنی کمی بیشی اس وجہ سے ہے کہ اہل عرب عدنان تک نسب علی الاتصال پہنچاتے تھے اور عدنان کا حضرت اسماعیل کی اولاد سے ہونا، چوں کہ امر مسلم تھا، اس لیے عام طور پر اوپر جا کر مشہور مشہور نام گنا دینا کافی سمجھتے ہیں۔

عام نسب ناموں میں چوں کہ عدنان سے حضرت اسماعیل تک صرف آٹھ نو نام ہیں اور زمانہ بہت طویل ہے؛ اس لیے بعض عیسائیوں نے اس سے انکار کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت ابراہیم کی نسل سے ہیں۔

لیکن اس کے برخلاف بیسیوں یوروپین اور یہودی مؤرخین اس پر متفق ہیں کہ قریش، بلکہ تمام شمالی عرب وحجاز حضرتِ ابراہیم علیہ الصلاۃ والسلام کی اولاد ہیں۔ چوں کہ تمام آبائے کرام کے احوال معلوم نہیں، اس لیے صرف مشاہیر کے احوال قلم بند ہوں گے:

وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ، عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ.

ابوالانبیاء سیدنا ابراہیم علیہ السلام

﴿مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ﴾

تمھارے باپ ابراہیم کی ملت انھوں نے ہی پہلے تمھارا نام مسلمان رکھا۔ (سورۂ حج: ۷۸)

حضرتِ آدم کے تین ہزار تین سو بتیس سال (۳۳۳۲) اور طوفانِ نوح کے ایک ہزار دو سو پینتالیس (۱۲۴۵) سال بعد، عراق عجم کے مشہور شہر بابل میں نمرود بن کنعان کی زبردست سلطنت قائم تھی۔ اس مغرور نے اپنی شاہانہ تمکنت کے زعم میں خدائی کا دعوی کر دیا تھا، رب العالمین نے خدائی میں شرکت کے مدعی کے سرکوبی کے لیے اپنے خلیل ابوالانبیاء سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو مبعوث فرمایا۔

ولادت

حضرتِ ابراہیم کی ولادت سے قبل نمرود نے خواب دیکھا کہ ایک ستارہ ایسا طلوع ہوا ہے جس کی تابش کے آگے شمس وقمر ماند پڑ گئے ہیں۔ اُس نے اپنے دربار کے نجومیوں سے اِس

خواب کی تعبیر پوچھی۔ انھوں نے بتایا کہ تیری قلمرو میں ایک ایسا لڑکا پیدا ہوگا جو تیری حکومت کو برباد کر ڈالے گا۔ اس تعبیر کے سننے کے بعد اس نے اپنی پوری حدود سلطنت میں حکم نافذ کر دیا کہ تمام نومولود بچے قتل کر دیئے جائیں اور لوگ عورتوں سے الگ رہیں اور ایک محکمہ قائم کر دیا جو اس کی دیکھ بھال کرے۔

قدرتِ ایزدی؛ کہ جب ابراہیم علیہ السلام بطنِ مادر میں قرار پائے تو اُن کی والدۂ محترمہ کی عمر شریف کم تھی۔ اُن کی طرف کسی کا ذہن نہ گیا، حمل پہچانا نہ جا سکا۔ آپ کے والدِ محترم نے ایک تہ خانہ شہر کے باہر کھود رکھا تھا، ولادت کے وقت آپ کی والدۂ محترمہ اسی تہہ خانے میں چلی گئیں۔ اللہ کا خلیل اُسی تہ خانے میں اُس ظلمت کدۂ عالم کو روشن کرنے کے لیے تشریف لایا۔ سلام اللہ علیہ و صلاتہ.

حضرتِ ابراہیم اُسی تہ خانے میں رہتے، آپ کی والدۂ ماجدہ روزانہ آ جا کر دودھ پلاتیں اور تہہ خانے کو پتھر سے بند کر دیتیں۔ آپ کی والدہ جب جاتیں تو آپ کو اُنگلی کا سرا چوستے پاتیں اور ملاحظہ کرتیں کہ انگلیوں سے دودھ جاری ہے۔ حضرتِ ابراہیم کی نشوونما غیر معمولی تھی، عادتاً بچے سال بھر میں جتنا بڑھتے [ہیں]، آپ ایک مہینہ میں بڑھتے۔

انبیا علیہم السلام اپنی ابتدائے ہستی سے معصوم اور عارف باللہ ہوتے ہیں، اسی کے زیرِ اثر ایک دن آپ نے اپنی والدہ سے پوچھا:

''میرا رب کون ہے؟''

انھوں نے سمجھا: پرورش کرنے والے کو پوچھ رہے ہیں، جواب دیا:

''میں۔''

پھر حضرتِ ابراہیم نے پوچھا:

''اور تمھارا رب کون ہے؟''

جواب دیا:

''تمھارے والد۔''

پھر دریافت کیا:

''اوران کارب کون ہے؟''

اب والدہ محترمہ لاجواب ہوگئیں، اس کا تذکرہ اُن کے والد سے کیا اور بتایا کہ جس بچے کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ سب کا دین بدل دے گا وہ یہی ہے۔

''بابل'' میں بت پرستی کے ساتھ ساتھ ستارہ پرستی کا رواج عام تھا، حضرتِ ابراہیم کی بعثت کا بنیادی مقصد غیرُ اللہ کی پرستش کی بیخ کنی تھی؛ اس لیے ابتدا ہی سے آپ کے قلبِ پاک پر غیرُ اللہ کی اُلوہیت کے بطلان کے دلائل فائض ہونے لگے۔ تہ خانے میں آپ نے کسی دن زہرہ یا مشتری کو چمکتے ہوئے ملاحظہ فرمایا، قوم کے اعتقاد پر طنز کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''یہ میرا رب ہے۔''

لیکن جب یہ ستارہ ڈوب گیا تو فرمایا:

''میں ڈوبنے والوں سے رشتۂ محبت نہیں رکھتا۔''

پھر جب چاند نکلا اور اس کی چمک دمک دیکھی تو فرمایا:

''یہ میرا رب ہے۔''

پھر جب وہ بھی غروب ہوگیا تو فرمایا:

''اگر میرا رب ہدایت نہ دیتا، تو میں اِنھی گمراہوں کے زمرے میں داخل ہوتا۔''

پھر جب سورج کو جگمگاتے ہوئے دیکھا تو فرمایا:

''(اچھا!) یہ میرا رب ہے، یہ ان سب سے بڑا ہے۔''

لیکن جب ستارہ پرستوں کا یہ سب سے بڑا دیوتا بھی زردرو ہوکر ڈوب گیا اور ان احمقوں کے پاس اب کوئی ایسا نہ رہا جسے حضرتِ ابراہیم کے سامنے پیش کرتے، تو آپ نے نہایت اطمینان کے ساتھ فرمایا:

''اے قوم! مَیں تمھارے معبودوں سے بیزار ہوں، میں نے سب سے اپنا منہ موڑ کر اُس کی طرف پھیر لیا جس نے زمین و آسمان بنائے اور میں مشرک نہیں ہوں۔''

حضرتِ ابراہیم کی بیان فرمودہ یہ وہ برہانِ قاطع ہے، جو ہزار ہا سال سے آج تک لاجواب ہے، آج کی فلسفی اور سائنسی دنیا کے پاس بھی اس کا کوئی جواب نہیں۔

حضرت ابراہیم علی الاختلاف ۷، ۱۳، ۱۷، برس تہ خانے میں رہے۔

تبلیغ توحید

تہ خانے سے باہر نکلے تو دیکھا کہ اُن کا پرورش کنندہ چچا آزر بت تراش اور پوری قومِ بت پرست اور ستارہ پرست ہے، دوسری طرف نمرود خدائی کا دعوے دار ہے، قوم کی اس گم راہی کو دیکھ کر خلیل اللہ کا دل تڑپ اٹھا چچا آزر سے کہا:

''یہ کیا حماقت ہے؟ رب العالمین کو چھوڑ کر اِن بتوں کو معبود بتاتے ہو۔''

اور قوم سے سوال کیا:

''یہ کیسی مورتیاں ہیں جن کے آگے آسن جمائے رہتے ہو؟''

اُن سفہا کے قلوب میں اُن مورتیوں کی اُلوہیت کا ڈھونگ ایسا رچا ہوا تھا کہ انھیں اِس کا وہم بھی نہ تھا کہ کوئی اس سے منکر ہو سکے گا۔ جب اس مردِ حق آگاہ کا سوال سنا تو بوکھلا گئے اور بولے:

''ہم کچھ نہیں جانتے، ہم نے اپنے آبا و اجداد کو اِن کی پوجا کرتے دیکھا ہے، ہم بھی کر رہے ہیں۔''

حضرتِ ابراہیم نے نعرۂ حق بلند فرمایا:

''تم اور تمھارے بُت پرست آبا و اجداد سب گمراہ تھے۔''

قوم کی جرأت اور بڑھی پوچھا:

''اے ابراہیم! تم واقعی بات کہتے ہو یا مذاق کرتے ہو۔''

حضرتِ ابراہیم نے جواب دیا:

''یہ مذاق نہیں واقعہ ہے، تم سب کا رب وہی ہے جو آسمانوں اور زمینوں کا رب ہے، جس نے انھیں بنایا ہے اور میں اِس پر گواہ ہوں۔''

بت شکنی

اہلِ بابل کا ایک سالانہ میلہ لگتا تھا، میلہ جانے سے پہلے یہ بتوں کو سنوارتے سجاتے اور

ان کے سامنے عمدہ عمدہ کھانے رکھ دیے جاتے، دن بھر میلے میں رنگ رَلیاں مناتے اور واپسی پر اُن کھانوں کو بطور پرشاد کھاتے۔ اتفاق کی بات حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کی سابقہ گفتگو کے ایک دن بعد میلہ تھا، اُن لوگوں نے کہا:

''کل عید ہے، تم بھی عیدی میلے کی بہار دیکھنے چلو!''

حضرتِ ابراہیم نے ستاروں پر ایک نظر ڈالی اور توریۃً فرمایا:

''میں بیمار ہونے والا ہوں۔''

قوم علمِ نجوم کی بڑی معتقد تھی، اُس نے سمجھا کہ شاید اِسی علم سے انھیں اپنے بیمار ہونے کا علم ہو چکا ہے؛ اس لیے وہ لوگ آپ کو چھوڑ کر میلہ میں چلے گئے۔ جب یہ لوگ میلے میں جانے لگے تو حضرتِ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا:

'' تم لوگ جاؤ! میں تمھارے بتوں کی خبر لوں گا، جس کو کچھ لوگوں نے سن لیا۔''

یہ لوگ میلے میں عید منانے گئے اور اللہ کا خلیل چپکے سے طبر لے کر بت خانہ گیا، بتوں کے سامنے عمدہ عمدہ کھانے دیکھ کر فرمایا:

''تم لوگ اِن پرشادوں کو کھاتے کیوں نہیں؟''

جب کچھ جواب نہ ملا تو فرمایا:

''ارے! تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ بولتے کیوں نہیں؟''

جب اُن بے جان مورتیوں کے منہ سے کوئی جواب نہیں نکلا تو جلال آ گیا اور داہنے ہاتھ میں طبر [کلہاڑی] لے کر ان سبھوں کو مار مار کر چور کر دیا، صرف بڑے بت کو باقی رکھا اور طبر اس کی گردن پر رکھ دیا۔

جب قوم کو اپنے معبودوں کی تباہی کا علم ہوا تو دوڑے ہوئے آئے اور پوچھنے لگے کہ کس نے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ ظلم کیا؟ جن لوگوں نے حضرتِ ابراہیم کی دھمکی سنی تھی بتایا کہ ابراہیم سے اُن کی برائی کرتے سنا ہے، غالباً یہ اسی کی حرکت ہے۔ قوم نے کہا کہ اس کو پکڑ کر سب کے سامنے لاؤ۔ جب لائے گئے تو قوم نے آپ سے پوچھا:

''کیا تم نے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ حرکت کی ہے؟''

آپ نے جواب دیا:

''یہ حرکت اُن کے بڑے کی ہے، اگر بول سکتے تو اُس سے پوچھ لو۔''

اب قوم کی بولتی بند ہوگئی اور دل میں کہنے لگے کہ سچی بات وہی ہے جو ابراہیم کہتے ہیں، ہم ہی لوگ ظالم ہیں؛ لیکن برسہا برس کی گھٹی میں پلائی ہوئی بتوں کی عظمت نہ جاسکی، دھاندلی سے بولے:

''آپ تو جانتے ہیں کہ یہ بولتے نہیں۔''

خلیل اللہ نے فوراً جواب دیا:

''پھر تمھیں کیا ہوگیا ہے کہ اللہ کو چھوڑ کر اِن ناتوانوں کو پوجتے ہو، جو تمھیں نہ نفع پہنچا سکے نہ نقصان؟ تم پر اور تمھارے جھوٹے معبودوں پر تف ہو۔ تم لوگ کتنے بے سمجھ ہو۔''

جب قوم ہر طرح سے عاجز ہوگئی تو غالباً اسی وقت یا آگ میں ڈالنے کے بعد نمرود سے شکایت کی، نمرود نے حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کو طلب کر کے پوچھا:

''تمھارا رب کون ہے؟''

آپ نے جواب دیا:

جو مارتا اور جلاتا ہے۔

نمرود بولا:

''میں بھی مارتا اور جلاتا ہوں۔''

اس نے قید خانے سے دو ملزموں کو بلایا اور ایک کو قتل کرا دیا اور دوسرے کو چھوڑ دیا اور حضرتِ ابراہیم علیہ السلام سے بولا:

''دیکھو میں بھی مارتا اور جلاتا ہوں۔''

حضرتِ ابراہیم علیہ السلام نے اُس کی بے وقوفی دیکھ کر اُس سے واضح حجت پیش فرمائی اور فرمایا:

''میرا رب وہ ہے جو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے، اگر تو خدا ہے تو ذرا مغرب سے نکال دے۔''

اب نمرود کے منہ پر ہوائیاں اڑنے لگی اور وہ مبہوت ہو کر رہ گیا۔

آتش کدۂ نمرود

فیضِ جلیل، خلیل سے پوچھو
آگ میں باغ لگاتے یہ ہیں

اہلِ بابل میں حق قبول کرنے کی استعداد ہوتی تو اِن مناظروں میں ساکت و عاجز ہو جانے اور اپنے دیوتاؤں کی بے چارگی، بربادی کو آنکھوں سے دیکھنے کے بعد، یقیناً قبول کر لیتے؛ لیکن وہ بدنصیب اپنی ذاتی طاقت اور نمرود کی سلطنت کی آڑ لیتے ہوئے، اپنی اِن ناکامیوں اور بتوں کی بربادیوں کا بدلہ لینے کے لیے اِس پر آمادہ ہوئے کہ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں جلا کر ہمیشہ کے لیے اس نعرۂ حق کو خاموش کر دیا جائے۔

چناں چہ نمرود کے حکم سے حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کو ''کوثی'' میں قید کر دیا گیا اور تیس گز لمبا، بیس گز چوڑا سنگین دیواروں کا آتش کدہ تعمیر ہوا۔ آتش کدے کو لکڑیوں سے بھر کر آگ لگا دی گئی، ایک مہینہ تک بھڑکائی گئی، جب اُس کے شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے تو اللہ کے خلیل کو گوپھن (منجنیق) سے اس میں ڈال دیا گیا۔

روح الامین نے سدرہ سے دیکھا کہ اللہ کے خلیل کے پائے استقامت میں لغزش اور دل میں ہراس کیا معنی؟ زبان پر حرفِ التجا تک بھی نہیں آیا، اُن سے نہ دیکھا گیا، حاضرِ خدمت ہوئے اور پوچھا کوئی ضرورت ہے؟

فرمایا: ''ہاں ہے؛ لیکن تم سے نہیں۔''

جبریل نے عرض کیا:

''تو جس سے ہے اسی سے عرض کیجیے۔''

فرمایا:

عِلْمُهٗ بِحَالِي، كَفَانِيْ عَنْ سُؤَالِيْ.

وہ حال جانتا ہے، دعا کی حاجت نہیں۔

اپنا پیغام پہنچانے کے جرم میں آگ میں جانے والے کو دیکھ کر اُس قادرِ قیوم نے حکم

فرمایا:

يَانَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ.

اے آگ! خبردار! ابراہیم کا بال بیکا نہ ہو، ٹھنڈی ہو جا۔ اور ان کے لیے سلامتی کا سامان بن جا۔ (سورۂ انبیا:۶۹)

قدرتِ خداوندی کا کتنا حیرت انگیز نظارہ ہے کہ وہی شعلے۔ جس کے پاس کوئی پھٹک نہیں سکتا تھا، پرندے پر نہیں مار سکتے تھے۔ دفعتاً سرد ہو گئے، بندشیں جل گئیں؛ لیکن حضرتِ ابراہیم علیہ السلام پر آنچ بھی نہیں آئی۔

اہلِ بابل پر حجتِ الٰہیہ تمام ہو چکی تھی۔ قوم نے حق قبول کرنے کے بجائے آوازِ حق بلند کرنے والے کو نیست و نابود کرنے کی امکانی کوشش ختم کر لی تو اب وقت آ گیا کہ صفحۂ ارض کو ان کے وجود سے پاک کیا جائے۔ لہٰذا حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کو ہجرت کا حکم ہوا، آپ اپنے چچا زاد بھائی **لوط بن ہاران** کو لے کر شام چلے آئے۔ حضرتِ ابراہیم فلسطین میں اور لوط موتفکہ میں آباد ہوئے۔

نمرود اور قومِ نمرود کی بربادی

اللہ عزوجل نے نمرود اور اہلِ بابل پر عذاب نازل فرمایا، مچھروں کی ایک فوج آئی، پوری قوم کے خون کے ساتھ گوشت بھی چٹ کر گئی۔ ایک مچھر نمرود کے دماغ میں گھس گیا، اس کے مغز کو چاٹ کر ہلاک کر دیا اور اللہ کے خلیل کو آگ میں ڈالنے والی قوم کا نام صفحۂ ہستی سے اس طرح مٹا دیا کہ کوئی ان پر آنسو بہانے والا تک نہ رہا۔

﴿فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ.﴾

نہ ان پر آسمان رویا نہ زمین روئی۔ (سورۂ دخان:۲۹)

❁❁❁

مصر کا سفر

بابل سے آنے کے بعد ایک مدت تک حضرتِ ابراہیم علیہ السلام شام میں رہے۔ اتفاقاً شام میں ایک بار قحط پڑا، غلہ لینے کے لیے مصر گئے۔ (عینی، جلد:۶)

ساتھ میں آپ کی اہلیہ حضرتِ سارہ بھی تھیں، وہ آپ کے چچا کی لڑکی تھیں۔ (لمعات)

اُن سے آپ نے نکاح کر لیا تھا، اُن دنوں مصر پر اولادِ فراعنہ حکمراں تھا۔

(اس کے نام کے بارے میں اختلافِ کثیر ہے، کسی نے سنان بن علوان، کسی نے عمرو بن امرء القیس، کسی نے سفیان بن علوان بن قتیبہ صاروف لکھا ہے، اور یہ بھی لکھا ہے کہ یہ واقعہ اردن میں پیش آیا تھا۔ عینی، ج:۶، ص:۱۷)

اِس ظالم کی عادت تھی کہ شادی شدہ عورتوں کو جبراً لے لیا کرتا تھا۔

حضرتِ ابراہیم علیہ السلام مصر پہنچے تو کسی نے فرعونِ مصر کو اطلاع دی کہ ایک صاحب مصر میں آئے ہیں، ان کے ہمراہ ایک حسین ترین عورت ہے۔ فرعونِ مصر نے بلوا کر پوچھا:

''تمھارے ساتھ کون عورت ہے؟''

آپ نے فرمایا:

''وہ میری بہن ہے۔''

آپ نے واپس آ کر حضرتِ سارہ سے بیان فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ میں نے اس تاویل سے کہ اس سرزمین پر سوائے ہم دونوں کے اور کوئی مسلمان نہیں، تمھیں بہن بتایا، تم سے اگر پوچھے تو اس کے خلاف مت کہنا۔

اس پر بھوت سوار تھا، اس کے باوجود کہ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام نے حضرتِ سارہ کو بہن بتایا تھا، اُس نے حضرتِ سارہ کو بلایا۔ حضرتِ سارہ اُدھر گئیں۔ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام نے ناموس کو معرضِ خطر میں دیکھ کر وضو کیا اور نماز شروع کر دی۔

حضرتِ سارہ کو دیکھ کر اُس خبیث نے دست درازی کرنی چاہی، قدرتِ ایزدی سے اس کا گلا گھٹ گیا اور وہ زمین پر گر کر ایڑیاں رگڑنے لگا۔ جب جان جاتی دیکھی تو اس نے حضرتِ سارہ سے کہا کہ دعا کرو میں ٹھیک ہو جاؤں، اب تم سے کوئی تعرض نہیں کروں گا۔ حضرتِ سارہ نے یہ دعا کی:

اَللّٰھُمَّ اِنْ کُنْتَ تَعْلَمُ اِنِّیْ اٰمَنْتُ بِکَ وَبِرَسُوْلِکَ وَ اَحْصَنْتُ فَرْجِیْ اِلَّا عَلٰی زَوْجِیْ ،فَلَا تُسَلِّطْ عَلَیَّ الْکَافِرَ. اَللّٰھُمَّ اِنْ یَمُتْ ،فَیُقَالُ ھِیَ قَتَلَتْہُ.

اے معبود! اگر تو یہ جانتا ہے کہ میں تجھ پر اور تیرے رسول پر ایمان لائی ہوں اور میں نے اپنے ناموس کو محفوظ رکھا ہے تو اِس کافر کو مجھ پر قابو مت دے۔ اے معبود! اگر یہ مر گیا تو لوگ کہیں گے اِسی نے قتل کیا ہے۔

(بخاری، کتاب البیوع)

دعا کرتے ہی وہ ٹھیک ہو گیا۔ ٹھیک ہونے کے بعد پھر نیت بگڑی اور ہاتھ بڑھایا، پھر وہی گت ہوئی، پھر حضرتِ سارہ کی دعا سے ٹھیک ہو گیا۔ پھر نہیں مانا، تیسری بار ہاتھ بڑھایا تو پہلے سے سخت درگت ہوئی۔ پھر دعا کی التجا کی، دعا کے بعد ٹھیک ہو گیا۔

بار بار کے تجربے سے سمجھ چکا تھا کہ اس عفیفہ کی پشت پر کوئی غیبی قوت ہے۔ اب ہمت نہ ہوئی۔ دربان سے بلا کر کہا:

''تم بجائے انسان کے شیطان کو لائے ہو، اسے میرے ملک سے نکال دو اور اس کی خدمت کے لیے ہاجرہ کو دے دو۔''

(عینی، ج:۷، ص:۳۵۷- بخاری، کتاب البیوع)

حضرتِ سارہ، ہاجرہ کو لے کر حضرتِ ابراہیم کے خدمت میں حاضر ہوئیں۔ دیکھا کہ آپ نماز پڑھ رہے ہیں، حضرتِ ابراہیم نے ہاتھ کے اشارے سے پوچھا:

''کیا حال ہے؟''

عرض کیا:

''اللہ نے بدکار کا مکر اُسی کے منہ پر دے مارا، اس نے ایک باندی خدمت کے لیے دی

ہے۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام

﴿فَبَشَّرْنَاهُ بِغُلَامٍ حَلِيمٍ.﴾

پس ہم نے اسے ایک بردبار بچے کی بشارت دی۔ (سورۂ صٰفّٰت: ۱۰۱)

اس واقعے کے بعد حضرت ابراہیم پھر شام واپس آئے، حضرتِ سارہ نے حضرت ہاجرہ، حضرتِ ابراہیم کو ہبہ کر دیا۔

حضرت ہاجرہ اصل میں کسی قبطی بادشاہ کی بیٹی تھیں، جسے فرعونِ مصر نے قید کر کے باندی بنا لیا تھا؛ لیکن قسمت میں دین و دنیا کی ملکہ ہونا لکھا تھا۔ اِس لیے قدرت نے اُنھیں اپنے خلیل کی خدمت میں بھیج دیا، کچھ دنو میں اللہ عزوجل نے حضرتِ ہاجرہ کی آغوش حضرت اسماعیل علیہ السلام سے پر کی۔ حضرتِ اسماعیل اگرچہ شام میں پیدا ہوئے تھے؛ لیکن قدرت نے اُنھیں کوئی اور ہی بستی بسانے کے لیے منتخب فرمایا تھا۔

حضرتِ سارہ کو امید تھی کہ خدا اُنھیں کوئی اولاد دے گا جو نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سرفراز ہو گی۔ حضرتِ اسماعیل کی پیشانی میں اُس نور کی تابش دیکھ کر حضرتِ سارہ کو رشک ہوا، اور یہ رشک اِس حد تک پہنچا کہ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ ہاجرہ اور اُس کے بیٹے کو میری نظروں سے اوجھل کیجیے اور کسی ایسی جگہ چھوڑ آیئے جہاں آب و دانہ نہ ہو۔ حضرتِ ابراہیم من جانب اللہ حضرتِ سارہ کی دل جوئی کے مامور تھے۔ اس لیے اُن کی خواہش رد نہ کر سکے۔ ادھر وحی آئی کہ حضرتِ اسماعیل اور اُن کی ماں کو اُس سرزمین میں چھوڑ آیئے جسے میں نے قبلۂ توحید بنانے کے لیے روزِ ازل سے ہی سے چن لیا ہے۔

ماں بیٹے اور وادیِ غیر ذی زرع

﴿رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ.﴾

اے ہمارے رب! میں نے اپنی کچھ اولاد نا قابل کاشت میدان میں بسائی ہے،

تیرے عزت والے گھر کے پاس؛ تاکہ یہ لوگ نماز پڑھیں۔

حضرتِ سارہ کی خواہش کے مطابق حضرتِ ابراہیم علیہ السلام ماں اور دودھ پیتے بچے کو براق پر سوار کر کے لے چلے اور جہاں اب کعبہ ہے وہاں لائے، زم زم کے پاس ایک اونچے درخت کے نیچے لے جا کر اتارا، ایک توشے دان میں کھجوریں اور ایک مشک پانی رکھ کر پلٹے۔

اِس وقت وہاں ببول وغیرہ کا جنگل تھا، نہ آبادی تھی نہ پانی کے لیے ایک کنواں یا چشمہ وغیرہ تھا۔ اِس سنسان میدان میں اکیلے چھوڑ کر اپنے سرتاج کو واپس ہوتے ہوئے دیکھ کر، حضرتِ ہاجرہ بے تاب ہوگئیں۔ پوچھا:

''اِس چٹیل میدان میں کس کے سہارے چھوڑے جاتے ہیں؟''

حضرتِ ابراہیم جواب نہ دیا اور نہ مڑ کر دیکھا۔ حضرتِ ہاجرہ نے بار بار پوچھا جب کچھ جواب نہ ملا تو عرض کیا:

''کیا آپ کو خدا نے اس کا حکم دیا ہے؟''

فرمایا: ہاں۔

اب اطمنان ہوا، بولیں:

ایسا ہے تو وہ ہمیں ضائع نہیں کرے گا، ہماری حفاظت کرے گا۔

جب حضرتِ ابراہیم علیہ السلام چلتے چلتے پہاڑ کی گھاٹی کے قریب پہنچے تو اکلوتے بیٹے کی بے کسی پر شفقتِ پدری جوش میں آئی کعبہ کی نشانات کی طرف منہ کر کے رقت انگیز دعا کی۔

﴿رَبَّنَا اِنِّیۡۤ اَسۡکَنۡتُ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ بِوَادٍ غَیۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَیۡتِکَ الۡمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ فَاجۡعَلۡ اَفۡئِدَۃً مِّنَ النَّاسِ تَہۡوِیۡۤ اِلَیۡہِمۡ وَارۡزُقۡہُمۡ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّہُمۡ یَشۡکُرُوۡنَ.﴾ (سورۂ ابراہیم: ۳۷)

اے ہمارے رب میں نے اپنی کچھ اولاد ایک ناقابلِ کاشت میدان میں تیرے عزت والے گھر کے پاس چھوڑا، اے ہمارے رب! اس لیے کہ یہ نماز پڑھیں، کچھ لوگوں کے قلوب اُن کی طرف مائل کر دے اور یہ لوگ تیرا احسان مانیں گے۔

بیرزم زم کا اُبلنا

حضرتِ ہاجرہ وہ کھجوریں کھاتیں اور جب تک مشک میں پانی تھا پیتی رہیں۔ جب پانی ختم ہو گیا تو سخت پریشان ہوئیں، یہاں تک کہ پیاس کی زیادتی سے وہ وقت بھی آ پہنچا کہ دودھ خشک ہو گیا اور بچے کی جان پر آ بنی، شدتِ کرب سے بچہ تڑپ تڑپ کر ایڑیاں رگڑنے لگا۔ مامتا کی ماری ماں سے یہ جان کاہ منظر دیکھا نہ گیا۔ بے تحاشا اٹھیں قریب ترین پہاڑ صفا تھا، اُس پر چڑھ کے درمیانی میدان پر نظر دوڑائی کہ شاید کوئی مددگار ہو؛ لیکن وہاں کون تھا۔ نیچے اتریں، جب نشیب میں پہنچیں تو کپڑے سمیٹ کر نالہ پار کر کے موت و زیست کی کش مکش میں مبتلا لختِ جگر کے پاس جا کر ایک نظر ڈالی۔ پھر مروہ پر چڑھیں، وہاں سے بھی نظر دوڑائی کہ شاید کوئی کہیں ہو۔ مایوس ہو کر پھر نیچے آئیں اور اُسی طرح دوڑ کر وادی پار کی اور بچے کے پاس جا کر ایک نظر ڈالی اور پھر صفا پر گئیں۔ اِسی طرح سات پھیرے لگائے۔ ساتویں بار جب بچے کے پاس آئیں، تو دیکھا بچہ جاں بلب ہے۔ اب کی بار مروہ پر پہنچیں، تو انھیں ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کہیں سے کوئی آواز آ رہی ہے۔ چونک گئیں اور ہمہ تن متوجہ ہو کر آواز پر کان رکھا، اب آواز صاف سنائی دی۔ کوئی اسماعیل کے پاس کھڑا ہے، اور آواز دے رہا ہے۔ ڈھارس بندھی بولیں:

''اے غمگسار تیری آواز میں نے سنی، کیا تیرے پاس مجھ دُکھیاری کی چارہ سازی کا کچھ سامان ہے؟

یہ جبریلِ امین تھے، اپنی ایڑی زمین پر ماری جس سے زمین پھٹ گئی اور چشمہ ابل پڑا، اس ڈر سے کہ کہیں پانی بہہ کر ضائع نہ ہو جائے اردگرد سے دھول اٹا کر حوض کی طرح بناتی جاتیں اور کہتی جاتیں: جم جم۔ (تھم تھم) اور کچھ پانی چلو سے مشک میں بھر لیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ اسماعیل کی ماں پر رحم فرمائے۔ اگر وہ زم زم کو چھوڑ دیتیں تو وہ ایک بہتا ہوا چشمہ ہوتا۔ حضرتِ ہاجرہ نے پانی پیا بچے کو پلایا، جس سے اُن دونوں کی بھوک و پیاس زائل ہو گئی۔

آبِ زم زم کی یہ خاصیت ہے کہ وہ کھانے پینے دونوں کے کام دیتا ہے۔

حضرتِ جبریلِ امین نے حضرتِ ہاجرہ کو تسلی دی کہ گھبراؤ نہیں پانی ختم نہ ہو گا، یہ بچہ

اور اِس کے باپ یہاں اللہ کے گھر کی تعمیر کریں گے۔ یہاں کے باشندوں کو اللہ ضائع نہیں کرے گا۔

بنی جرہم کی آمد

حضرتِ ابراہیم علیہ السلام نے جس چٹیل میدان میں اپنی اہلیہ کو چھوڑا تھا اس کے قریب ہی یمن کا ایک قبیلہ جرہم آباد تھا۔ اُن کی ایک جماعت شام کو جاتے ہوئے اِس میدان کے زیریں حصے میں اتری، اُنھوں نے بطنِ وادی میں پرندوں کو چکر کاٹتے ہوئے دیکھ کر سمجھ لیا کہ وہاں پانی ہے۔ خبر لانے کے لیے کچھ آدمیوں کو بھیجا، تصدیق کے بعد حضرتِ ہاجرہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اجازت کے بعد وہیں آباد ہو گئے؛ لیکن حضرتِ ہاجرہ نے چاہِ زمزم شریف کو اپنی ہی ملکیت میں رکھا۔

حضرتِ ابراہیم کا دستور تھا کہ ہر ماہ بُراق پر سوار ہو کر حضرتِ ہاجرہ اور حضرتِ اسماعیل کی دیکھ بھال کے لیے آیا کرتے، زمین اُن کے لیے سمیٹ دی جاتی تھی، صبح کو فلسطین سے چلتے اور مکہ آ کر اُن لوگوں سے مل کر واپس ہوتے اور قیلولہ کے وقت پھر فلسطین واپس پہنچ جاتے۔

شادی

قدرت نے بنی جرہم کو بھیج کر غیب سے حضرتِ ہاجرہ کی موانست کا مستقل سامان پیدا کر دیا۔ حضرتِ اسماعیل علیہ السلام انھی میں پلے بڑھے اور انھی سے عربی زبان سیکھی، عربی زبان کی ایجاد کا سہرا اسی قبیلے کے جدِ اعلیٰ جرہم اور اس کے بھائی قطور کے سر ہے، اس وقت اس قبیلے کا سردار مضاض بن عمرو تھا، حضرتِ اسماعیل جب شادی کے قابل ہو گئے تو مضاض کی لڑکی سے شادی کر لی۔

جنگلی جانوروں کے شکار اور زم زم کے پانی پر اُن کا گزارا تھا۔ ایک روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مویشی چراتے تھے، تیر و کمان بھی ساتھ رکھتے تھے، کوئی شکار مل جاتا تو کر لیا کرتے تھے۔ حضرتِ اسماعیل علیہ السلام نے اسی قبیلے میں دو شادیاں کیں۔

پہلی عورت کچھ ناشکری تھی، اپنے باپ کے حکم سے اسے طلاق دے کر دوسری شادی کر لی، جو پہلی کے برخلاف سلیقے مند شکر گزار تھی۔ اس کی سلیقہ مندی سے خوش ہو کر حضرتِ ابراہیم علیہ السلام نے اسے برقرار رکھنے کا حکم فرمایا۔ اس کی تفصیل بخاری وغیرہ میں یہ ہے:

ایک بار حضرتِ ابراہیم علیہ الصلاۃ والتسلیم تشریف لائے اور حضرتِ اسماعیل کی اہلیہ سے پوچھا:

''اسمٰعیل کہاں ہیں؟''

انھوں نے بتایا:

''شکار کرنے گئے ہیں۔''

''پھر دریافت فرمایا کہ تم لوگوں کی زندگی کیسے گزرتی ہے؟''

اُس نے کہا:

''ہم بری حالت میں ہیں، تنگی اور شدت میں ہیں۔''

فرمایا:

''جب تمھارے شوہر آجائیں تو ان سے سلام کہنا اور کہنا کہ اپنے دروازے کی چوکھٹ بدل دیں۔''

جب حضرتِ اسماعیل واپس آئے تو انھیں ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی آیا تھا، پوچھا:

''کیا کوئی آیا تھا؟''

ان کی زوجہ نے بتایا:

''ہاں ایک بزرگ ایسے ایسے آئے تھے۔ ہماری ان کی یہ یہ بات چیت ہوئی اور وہ آپ کو سلام کہہ گئے ہیں اور کہہ گئے ہیں کہ اپنے دروازے کی چوکھٹ بدل دیں۔''

حضرت اسماعیل نے بتایا کہ وہ میرے والد تھے اور انھوں نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تجھ کو الگ کر دوں تم اپنے اہل میں چلی جاؤ اور اسے طلاق دے دیا۔

پھر حضرتِ اسماعیل علیہ السلام نے بنی جرہم ہی میں دوسری شادی کی۔ کچھ دنوں کے بعد حضرتِ ابراہیم علیہ السلام پھر تشریف لائے۔ اس وقت بھی حضرتِ اسماعیل موجود نہیں تھے، ان کی

بیوی سے ان کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا شکار کرنے گئے ہیں۔ دریافت فرمایا:

''تم لوگ کیسے ہو؟ اور کیسے زندگی گزر رہی ہے؟''

اُس نے عرض کیا:

''ہم بہت اچھی طرح ہیں اور آسائش میں ہیں۔''

اُس نے حضرتِ ابراہیم سے عرض کیا:

''سواری سے اتریئے! کچھ کھا پی لیجیے۔''

دریافت فرمایا:

''تمھارا کھانا پینا کیا ہے؟''

بتایا: ''گوشت اور پانی۔''

حضرتِ ابراہیم نے دعا کی:

''اے اللہ انھیں گوشت میں برکت دے اور پانی میں۔''

فرمایا:

''جب تمھارے شوہر آجائیں تو ان کو سلام کہنا اور ان سے کہنا اپنے دروازے کی چوکھٹ باقی رکھیں۔''

حضرتِ اسماعیل واپس آئے تو انھوں نے کچھ بو محسوس کی۔ پوچھا:

''کوئی آیا تھا؟''

اہلیہ نے عرض کیا:

ہاں! ایک بزرگ بہت شان دار تشریف لائے تھے، آپ کے بارے انھوں نے پوچھا۔''

پھر اس نے ساری گفتگو سنا دی۔ دریافت فرمایا:

''کچھ حکم دے گئے ہیں؟''

اس نے بتایا:

''آپ کو سلام کہہ گئے ہیں اور حکم دیا ہے کہ اپنے دروازے کی چوکھٹ باقی رکھیں۔''

فرمایا:

''وہ میرے والد صاحب تھے اور انھوں نے حکم دیا ہے کہ تم کو اپنی زوجیت میں باقی رکھوں۔'' (بخاری، ج:۱،ص:۴۷۵-۴۷۶)

انقیاد و ایثار کا عظیم امتحان

﴿یَا اِبْرَاهِیْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْیَا اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ.﴾

اے ابراہیم تم نے خواب کو سچ کر دکھایا، ہم نیکو کاروں کو ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں۔

(سورہ صٰفّٰت:۱۰۵)

حرمِ الٰہی کی تعمیر ہونے والی تھی، اُس کی پاسبانی کے لیے ایک ایسے ایثار پسند انسان کی حاجت تھی، جو اپنے فرض کی ادائیگی میں جان و مال سے دریغ نہ کرے۔ قدرت کو خوب معلوم تھا کہ کون ہے؛ لیکن دنیا والوں کو بھی اُس کا جذبۂ قربانی تسلیم کرانے کے لیے امتحان گاہ میں لانے کی ضرورت تھی۔

اس لیے جب حضرتِ اسماعیل پندرہ سال کے ہوئے تو حضرتِ ابراہیم کو خواب میں حکم ہوا کہ اپنے بڑھاپے کی اکلوتی اولاد جو تمھاری یادگار ہے، میرے نام پر قربان کرو۔ اقلیمِ تسلیم و رضا کا شہنشاہ فرمانِ ایزدی اپنے نوجوان لختِ جگر کو سناتا ہے:

﴿یٰبُنَیَّ اِنِّیْۤ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْۤ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی.﴾

بیٹا میں نے خواب دیکھا ہے کہ تجھے ذبح کر رہا ہوں، بولو تم کیا کہتے ہو؟

(سورہ صٰفّٰت:۱۰۲)

پیکرِ ایثار و صبر عرض کرتا ہے:

﴿یٰۤاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ.﴾

اے باپ! تعمیل حکم کیجیے ان شاء اللہ آپ مجھے صابر پائیں گے۔ (سورہ صٰفّٰت:۱۰۲)

حضرتِ ابراہیم نے چھری لی اور حضرتِ اسماعیل کو لے کر منیٰ آئے، حضرتِ اسماعیل کو

ماتھے کے بل لٹایا۔قدرت کی بے نیازی کا اس سے بڑھ کر حیرت انگیز منظر دنیا نے کم دیکھا ہوگا، ایک طرف نوے سال کا بوڑھا باپ اپنے ہاتھ میں چھری لیے اُس نورِ نظر کو ذبح کرنے کے لیے بڑھ رہا ہے جو تنہا وارثِ نبوت وحکمت تھا، دوسری طرف ماں باپ کے لاڈ و پیار کا خوگر نوجوان باپ کے قاتلانہ اقدام کو دیکھ کر بھی اطمینان سے سرِ نیاز جھکائے ہوئے ہے۔

حضرتِ ابراہیم علیہ السلام نے بیٹے کی گردن پر چھری رکھ کر پوری قوت سے چلایا، ارض و سما، دشت وجبل لرز اٹھے، ملائکہ معصومین کانپ گئے؛ لیکن باپ بیٹے کے پائے استقلال میں ادنیٰ سی لرزش بھی نہیں آئی۔

آخر امتحان لینے والے کو رحم آ گیا، اُس نے اِس محیر العقول ایثار کو قبول کرتے ہوئے پکارا:

﴿یٰاِبْرَاهِیْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْیَا اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ، اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِیْنُ.﴾

اے ابراہیم! تم نے خواب کو سچ کر دکھایا، ہم نیکوکاروں کو ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں۔ یہ ایک عظیم الشان امتحان ہے۔(سورۂ صٰفّٰت: ۱۰۴۔۱۰۵)

حضرتِ اسماعیل علیہ السلام کے بجائے جنت سے ایک جانور (بکری یا مینڈھا) آیا اس کی قربانی ہوئی۔ حضرتِ اسماعیل قربان ہونے سے بچ گئے؛ لیکن اُن کے ایثار واخلاص کی یادگار میں ان کے پیروکاروں پر قیامت تک رسمِ قربانی واجب کر دی گئی۔

﴿وَتَرَكْنَا عَلَیْهِ فِی الْاٰخِرِیْنَ.﴾(سورۂ صٰفّٰت: ۱۰۸)

برزمینے کہ نشانِ کفِ پائے تو بود
سالہا سجدۂ صاحب نظر خواہد بود

مرکز توحید کی تعمیر

﴿اِذْ یَرْفَعُ اِبْرَاهِیْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ.﴾

یاد کرو جب ابراہیم واسماعیل بیت اللہ کی کرسی بلند کر رہے تھے، اے ہمارے رب!

ہماری جانب سے قبول کرنا بے شک تو سنتا اور جانتا ہے۔ (سورۂ بقرہ:۱۲۷)

امتحان ہو چکا، اب وقت آ پہنچا کہ امتحان میں کامیاب ہونے والے کو اُس کا منصب عطا کیا جائے۔

حضرتِ ہاجرہ کے انتقال کے بعد حسبِ دستور ایک بار حضرتِ ابراہیم حضرتِ اسماعیل کو دیکھنے کے لیے تشریف لائے تو دیکھا کہ حضرتِ اسماعیل زمزم کے قریب ایک بڑے درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے، تیر درست کر رہے ہیں۔ حضرتِ اسماعیل نے پدر بزرگ وار کو دیکھا تو بڑھے اور مصافحہ و معانقہ و دست بوسی کی۔ (عینی جلد ۷)

کعبہ کی تعمیر سب سے پہلے حضرتِ آدم علیہ السلام نے کی تھی۔ طوفانِ نوح میں وہ عمارت اٹھالی گئی، سرخ ٹیلے کی شکل میں اس کے نشانات باقی رہ گئے تھے، اس ٹیلے کی جانب اشارہ کر کے حضرتِ ابراہیم علیہ السلام نے حضرتِ اسماعیل علیہ السلام سے فرمایا:

''اللہ عزوجل نے اس جگہ اپنا گھر بنانے کا حکم دیا ہے، کیا تم میری مدد کرو گے؟''

سعادت مند بیٹے نے جواب دیا:

بسر و چشم باپ بیٹے نے مل کر اول خانۂ الٰہی کعبے کی بنیاد ڈالی، حضرتِ اسماعیل پتھر لا لا کر دیتے تھے اور حضرتِ ابراہیم علیہ السلام دیوار چنتے تھے، جب دیواریں بلند ہو گئیں تو ایک اونچے پتھر پر کھڑے ہو کر کام کرنے لگے۔ یہ پتھر آج بھی بطور یادگار کے مقام ابراہیم کے نام سے وہاں رکھا ہوا ہے۔ جس پر مٹتے مٹاتے آج بھی نشانِ قدم موجود ہیں۔

جب عمارت تیار ہو گئی تو حضرتِ اسماعیل علیہ السلام سے فرمایا ایک اچھا پتھر تلاش کر کے لاؤ، یہاں لگا دو جس سے لوگ طواف کا شمار کر سکیں، حضرتِ اسماعیل نے ماندگی کا عذر کیا، مگر قبول نہ ہوا، مجبوراً جانا پڑا، پتھر تلاش کر کے لائے تو دیکھا کہ وہاں حجرِ اسود نصب ہے۔ پوچھا:

یہ کہاں سے آیا ہے؟

فرمایا:

وہ دے گیا ہے جو تیرے سہارے نہیں۔

حجرِ اسود کے بارے میں ایک روایت یہ ہے کہ حضرتِ آدم کے ساتھ جنت سے

آیا تھا، پہلے وہ سفید وشفاف تھا، بوسہ دینے والوں کے گناہوں کو جذب کرتے کرتے سیاہ ہو گیا۔
جب باپ بیٹے یہ چوکور خانۂ توحید تیار کر چکے تو رقتِ قلب کے ساتھ دعائیں کیں۔

﴿رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَ اَرِنَا مَنَا سِكَنَا وَ تُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۔﴾ (سورۂ بقرہ)

اے رب ہماری طرف سے قبول فرما، تو سنتا اور جانتا ہے۔ اے رب ہم دونوں کو فرماں بردار رکھ اور ہماری اولاد میں سے ایک گروہ کو فرماں بردار بنا اور ہمیں عبادت کے قاعدے بتا اور ہماری توبہ قبول فرما۔ بے شک تو، توبہ قبول فرمانے والا مہربان ہے۔ اور انھی میں سے ایک رسول بھیج، جو اُن پر تیری آیتوں کو تلاوت کرے اور انھیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے اور معصیت سے پاک کرے۔ تو غالب حکمت والا ہے۔ (سورۂ بقرہ: ۱۲۷۔۱۲۸۔۱۲۹)

یہ عمارت بغیر چھت کی تھی، ایک دروازہ تھا لیکن اس میں کواڑ، چوکھٹ، بازو، وغیرہ نہ تھے۔ دروازہ کے پاس ایک گڑھا تھا جس میں نذرانے کی رقم جمع ہوتی تھی۔ اس عمارت کا طول و عرض یہ تھا۔

بلندی: ۹ رگز۔
طول: رکنِ شامی سے حجرِ اسود تک ۳۲ رگز۔
عرض: رکنِ شامی سے عربی تک ۲۲ رگز۔

وفات

تورات میں ہے کی حضرتِ اسماعیل کی عمر ۱۳۷ رسال کی ہوئی، (پیدائش، ۱/ ۲۵) یہ عرب، حجاز، یمن، حضرموت، کے نبی تھے۔ اِن کو بارہ فرزند عطا ہوئے، جن کے نام آگے آتے ہیں۔ ایک صاحب زادی کا پتا چلتا ہے۔ جو عیسو بن اسحاق سے بیاہی گئیں۔

پہلے اُن کی والدہ کا وصال ہوا اور آج جہاں مطاف ہے وہاں مدفون ہوئیں۔ بعد میں حضرتِ اسماعیل کا وصال ہوا یہ بھی ماں کے پہلو مین مدفون ہوئے۔ ایک قول کی بنا پر ان کی قبریں

حطیم میں ہیں۔

اہلِ کتاب کی ہفوات کا رد

اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے یہ اہلِ عرب کی روایات سے ماخوذ ہے۔ کلماتِ الٰہیہ میں تحریف کے پُرانے عادی اہلِ کتاب نے جوشِ تعصب میں سرے سے اُن تمام حقائق کا انکار کیا ہے۔ اُن کا خیال ہے:

- نہ تو حضرتِ اسماعیل علیہ السلام عرب میں آباد ہوئے۔
- اور نہ اہلِ عرب حضرتِ اسماعیل کی اولاد ہیں۔
- اور نہ حضرتِ اسماعیل ذبیح ہیں۔
- اور نہ مقام ذبح مکہ ہے۔

اُن کا خیال ہے:

- حضرتِ اسماعیل فلسطین کے جنوبی صحرا میں آباد ہوئے۔
- اور ذبیح حضرتِ اسحاق ہیں۔
- اور مقام ذبح شام ہے۔

اس انکار سے اُن کا مقصد صرف یہ ہے کہ بانی اسلام جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا [نسب] نسلِ ابراہیمی سے اور ملت اسلام کا ملت ابراہیمی ہونا ثابت نہ ہو سکے۔

ہم اِن تمام مختلف فیہ مسائل پر الگ الگ بحث کرنے سے پہلے، ناظرین کی توجہ فنِ تاریخ کی اصل کلی کی جانب مائل کرنا چاہتے ہیں، جس کی صحت میں کسی ماہر تاریخ کو انکار نہیں ہو سکتا، اور جو تاریخ کی بنیاد ہے۔

①

تاریخ کی تدوین سے قبل جو قومیں گزر چکی ہیں، اُن کے حالات معلوم کرنے کے لیے صرف دو ہی ذریعے ہیں۔ ایک تو زبانی روایات، دوسرے علمِ آثار۔

اگر زبانی روایات متعارض ہوں، تو ترجیح اُسی روایت کو حاصل ہوگی جس کی تائید علم آثار سے ہوتی ہے۔

(۲)

ہر اجنبی کے حسب ونسب اور آبا واجداد کے وطن کے بارے میں اس کا قول بہ نسبت دوسروں کے زیادہ مقبول ہوتا ہے، جب تک کہ دوسرا اس کی تردید نا قابلِ انکار دلائل سے نہ کر دے۔

یہاں امور متنازع فیہ چار ہیں۔

۞ حضرتِ اسماعیل عرب میں آباد ہوئے کہ نہیں؟

۞ عرب اُن کہ اولاد ہیں کہ نہیں؟

۞ ذبیح یہ تھے کہ حضرتِ اسحاق؟

۞ مقامِ ذبح عرب تھا کہ شام؟

اِن میں پہلی دو باتیں اہلِ عرب کے حسب ونسب اور مورثِ اعلیٰ کے وطن سے متعلق ہیں، اہل عرب بتاتے ہیں کہ ہم حضرتِ اسماعیل کی اولاد ہیں اور ان کا وطن مکہ تھا۔ اس کی تردید میں بنی اسرائیل کے پاس سنے سناتے افسانوں کے سوا کچھ نہیں لہٰذا اپنے حسب ونسب اور اپنے مورثِ اعلیٰ کے وطن کے بارے میں اہلِ عرب جو کچھ کہتے ہیں ماننا پڑے گا۔

اِسی طرح چاروں امور میں بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل کی روایتیں متعارض ہیں۔ لہٰذا غیر جانب دارانہ صورت پر ترجیح اُنھی روایات کو دی جائے گی کی جن کی تائید آثار سے ہوتی ہو۔

آگے چل کر ہم بتائیں گے کہ علم الآثار کی ساری تائیدات بنی اسماعیل ہی کو حاصل ہے؛ لہٰذا ایک منصف مجبور ہے کہ بنی اسرائیل کے مقابلے میں بنی اسماعیل کی روایات کو صحیح مانے۔

اب ہم تفصیل کے ساتھ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ تحریف کے بعد بھی اہلِ کتاب کے صحائف میں ضمنی طور پر ایسی باتیں موجود ہیں، جن سے اہلِ عرب ہی کی تائید ہوتی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ علم الآثار کی تائیدات بھی نقل کرتے جائیں گے۔

۞۞۞

پہلا مسئلہ

حضرتِ اسماعیل کہاں آباد ہوئے؟

تورات میں ہے:

اسماعیل فاران کے بیابان میں رہا۔

(سفرِ پیدائش، باب:۲۱)

معجم البلدان میں تصریح ہے کہ عرب کے جغرافیہ دانوں کا اس پر اتفاق ہے کہ 'فاران 'عرب کے پہاڑ کا نام ہے۔ عیسائی کہتے ہیں کہ 'فاران' عرب کے پہاڑ کا نام نہیں؛ بلکہ فلسطین کے جنوب میں جو صحرا واقع ہے، اُس کا نام ہے۔ عیسائی اس صحرا کے باشندے نہیں اور عرب والے عرب کے باشندے ہیں۔ اہلِ وطن کی شہادت دشت وجبل کے نام کے بارے میں دوسروں کے مقابلے میں یقیناً قابل ترجیح ہوگی؛ لہٰذا اس میں کسی عقل مند کو شک نہیں ہوسکتا کہ فاران عرب کے پہاڑ کا نام ہے۔ رہ گیا اِس صحرا کا نام فاران ہے یا نہیں؟ اس کے بارے میں وہاں کے باشندوں کی کوئی شہادت نہیں۔ صرف غیروں کا دعویٰ ہے اور اُس میں بحث کی بہت کچھ گنجائش ہے۔

تورات میں ہے کہ حضرتِ اسماعیل کے یہ بارہ بیٹے تھے:

نبیت - قدار - اوئیبل - مبسام - سمعا - دومہ - مشا - حدد - تیما - طور - نفیس - قدحہ۔

(پیدائش، ۲۵-۱۳)

تورات میں یہ بھی ہے کہ یہ سب اپنی اپنی قوم کے رئیس تھے اور اُنھوں نے اپنی بستیوں اور قلعوں کے نام اپنے ناموں پر رکھے تھے۔ یہ نزولِ تورات کے زمانے کی بات ہے، امتدادِ زمانہ سے کتنی بستیاں ناپید ہوگئیں، کتنے نام ردوبدل ہوگئے؛ لیکن تلاش وتتبع کے بعد عرب کی متعدد بستیاں اُن ناموں کے ساتھ بہت کچھ مناسبت رکھتی ہیں۔

'نبیت' 'ینبوع' کے متصل ایک بستی کا نام ہے۔

'الخصیر' - نبیت کے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک شہر کا نام ہے۔ ظنِ غالب ہے کہ یہ نام 'قدار' کی تصغیر 'القدیر' کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔

'مبسام' کے آثار نجد میں ہیں۔

'دومہ' شام اور مدینہ کے مابین ایک مشہور بستی ہے، عہدِ رسالت میں یہاں عیسائیوں کی ریاست تھی اور 'دومۃُ الجندل' کے نام سے مشہور تھی۔

'مسا' یمن میں اس نام کے مناسب 'موسیٰ' نام کی بستی موجود ہے۔

'حدر' جنوبی عرب میں 'حدیدہ' نام کا شہر موجود ہے۔ 'بنی حدر' ایک قبیلے کا نام بھی ہے۔

'تیما' فدک کے قریب خیبر کے راستہ میں 'تیما' نام کی بستی اب تک موجود ہے۔

'قدمہ' مسعودی نے قومِ قدمان کو بنی اسماعیل میں بتایا ہے، یہ لوگ 'یمن' میں رہتے ہیں۔

دوسرا مسئلہ

قربانی کس کی ہوئی؟

یہ مسئلہ بھی اہلِ کتاب اور اہل اسلام میں بڑی ہی معرکۃ الآرا ہے کہ قربانی کا حکم حضرت اسحاق علیہ السلام کے لیے ہوا تھا یا حضرتِ اسماعیل علیہ السلام کے لیے؟

اہلِ کتاب اس بات پر متفق ہیں کہ قربانی کا حکم حضرتِ اسحاق علیہ السلام کے لیے ہوا تھا اور جمہور اہلِ اسلام اس کے قائل ہیں کہ یہ حکم حضرتِ اسماعیل علیہ السلام کے لیے ہوا تھا۔ البتہ بعض مفسرین قلّتِ تتبع کی بنا پر اس کے قائل ہیں کہ قربانی کا حکم حضرتِ اسحاق کے لیے تھا؛ اس لیے ہم اس بحث کے دو حصے کرتے ہیں۔

ایک حصے میں روئے سخن اہلِ کتاب سے ہوگا۔

دوسرے میں اہلِ اسلام سے۔

بحث اول:

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہود کی خرد برد کی بنا پر تورات کے مُصَرَّحات سے یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ قربانی کا حکم حضرتِ اسماعیل کے لیے تھا؛ لیکن تورات کا دقتِ نظر سے مطالعہ کرنے کے بعد یہ امر واضح ہو جائے گا کہ یہ حکم حضرتِ اسماعیل ہی کے لیے تھا، نہ کہ حضرتِ اسحاق کے لیے۔

①

تورات میں ایک جگہ مذکور ہے کہ قربانی اسی انسان یا جانور کی ہوتی تھی جو پہلوٹا ہو تا[ہے]، الفاظ یہ ہیں:

لِاَنَّ لِیْ کُلُّ بِکْرٍ فِیْ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ مِنَ النَّاسِ وَالْبَھَائِمِ.

اس لیے کہ میرے لیے اسرائیل میں ہر پہلا بچہ ہے انسانوں کا اور چوپایوں کا۔

(عدد ۸۔۱۷)

یہ حکم بنی اسرائیل کے ساتھ خاص نہ تھا؛ بلکہ تمام شرائع سابقہ میں یہی حکم تھا، اسی بنا پر ہابیل نے جس مینڈھے کی قربانی کی تھی وہ بھی پہلوٹا تھا۔

②

حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کو جس بیٹے کی قربانی کا حکم ہوا تھا، اس کے بارے میں تصریح تھی کہ وہ اکلوتا اور محبوب ہو۔

(تورات تکوین-اصحاح: ۲۲، آیت: ۱۲)

③

توریت کے احکام کی رو سے جو بیٹا پہلوٹا ہوتا[ہے] وہ بہر حال افضل ہوتا[ہے] خواہ وہ اُسی بیوی سے ہو جو کمتر درجہ کی ہو۔

فَإِنَّهٗ أَوَّلُ قُدْرَتِهٖ وَلَهٗ حَقُّ الْبُكُوْرِيَةِ.

اس لیے کہ وہ اس کی پہلی قدرت ہے اور اس کو ہی تقدم حاصل ہے۔

(سفر تثنیہ، اصحاح: ۱۲، آیت: ۱۵-۱۷)

④

انسان کی فطرت کا بھی یہی تقاضا ہے کہ پہلونٹے بیٹے خصوصاً اکلوتے سے زیادہ محبت ہوتی ہے۔ خصوصاً وہ اولاد جو برہا برس کی مایوسی کے بعد ہزاروں دعاؤں اور التجاؤں کے بعد پیدا ہو۔

⑤

اِسی پر بس نہیں، تورات میں اِس کی تصریح ہے کہ حضرتِ ابراہیم علیہ الصلاۃ والتسلیم نے جس بیٹے کی قربانی کی تھی وہ اکلوتا تھا۔ تورات میں قربانی کے تذکرے میں ہے کہ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام نے بیٹے کی قربانی کرنی چاہی تو فرشتے نے ندا دی ہاتھ روک لو۔

اس کے الفاظ یہ تھے:

خدا کہتا ہے چوں کہ تو نے ایسا کام کیا اور اپنے اکلوتے بیٹے کو بچانے کی کوشش نہ کی، میں تجھ کو برکت دوں گا اور تیری نسل کو آسمان کے ستاروں اور ساحل بحر کی ریتی کی طرح پھیلا دوں گا۔

(توراۃ تکوین، اصحاح: ۲۲، آیت: ۱۵)

تورات کے اِن اقتباسات سے واضح ہو گیا کہ قربانی اُسی اولاد کی ہوئی جس میں یہ تین خصوصیات ہوں:

پہلونٹا ہو، اکلوتا ہو، محبوب ہوں۔

آؤ خود تورات کی روشنی میں تلاش کرو! یہ اوصاف مجموعی طور پر حضرتِ اسماعیل میں ہیں یا حضرتِ اسحاق؟ تورات میں بالتصریح یہ مذکور ہے کہ ہزاروں دعاؤں، تمناؤں کے بعد پہلے حضرتِ اسماعیل پیدا ہوئے، اس لیے یہی پہلونٹے بھی ہوئے، اکلوتے بھی ہوئے، افضل ترین بھی ہوئے، محبوب بھی ہوئے، برخلاف حضرتِ اسحاق علیہ السلام کے؛ کہ یہ بعد میں پیدا ہوئے؛ اس لیے نہ یہ پہلونٹے ہوئے، نہ اکلوتے ہوئے، نہ افضل ہوئے، نہ بنسبت حضرتِ اسماعیل علیہ السلام کے محبوب؛ اِس لیے توراۃ پر ایمان رکھنے کے دعوے داروں کو یہ تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ ذبیح حضرتِ اسماعیل تھے نہ کہ حضرتِ اسحاق۔

اس سلسلہ کے چند اقتباسات تورات کے اور ملاحظہ کریں:

❁ حضرتِ ابراہیم کو جب خدا نے حضرتِ اسحاق کی خوش خبری دی تو حضرتِ ابراہیم نے اُس وقت بھی حضرتِ اسماعیل کو یاد کیا۔

❁ حضرتِ اسحاق خدا کے وعدہ اور عہد کے مظہر ہیں۔

(تکوین، ۱۷-۱۸)

❁ حضرتِ اسماعیل دعوتِ ابراہیم ہیں۔ یعنی حضرتِ ابراہیم کی دعا اور خواہش سے پیدا ہوئے۔ اِسی بنا پر خدا نے ان کا نام 'اسماعیل' رکھا؛ کیوں کہ عبرانی زبان میں 'اسماعیل' دو لفظوں سے بنا ہے: 'اسمع' اور 'ایل'۔ 'اسمع' کا معنیٰ 'سننے' کے اور 'ایل' کے معنی خدا کے ہیں۔ یعنی خدا نے حضرتِ ابراہیم کی دعا سن لی۔

(تکوین اصحاح: ۱۵-۱۷-۱۸)

❁ خدا نے حضرتِ ابراہیم سے کہا کہ اسماعیل کے بارے میں، میں نے تیری سن لی۔

حضرتِ اسحاق کی بشارت سن کر حضرتِ ابراہیم نے حضرتِ اسماعیل کو یاد کیا۔ یہ دلیل ہے کہ حضرتِ اسماعیل پہلے پیدا ہو چکے تھے، حضرتِ اسماعیل دعوتِ ابراہیم ہیں؛ اِسی لیے ان کا نام اسماعیل ہے۔ یہ ثبوت ہے اِس بات کا کہ یہ دعا سے پیدا ہوئے؛ اِس لیے اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں؛ کہ حضرتِ اسماعیل پہلونٹے بھی ہیں، اکلوتے بھی ہیں، تو یہی حسب احکام تورات افضل بھی ہیں اور محبوب ترین بھی ہیں۔ اس لیے لازم ہے کہ قربانی انھی کی ہوئی۔

(۶)

جو اولاد خدا کی نظر ہو جاتی اسے باپ کا متروکہ مال نہیں ملتا، تورات میں مذکور ہے:

فِيْ ذٰلِكَ الْوَقْتِ اَفْرَزَ سِبْطَ اللَّاوِيِّ لِيَحْمِلُوْا تَابُوْتَ عَهْدِ الرَّبِّ وَ لِكَيْ يَقِفُوْا اَمَامَ الرَّبِّ لِيَخْدِمُوْهُ وَ يُبَارِكُوْا بِاسْمِهٖ اِلٰى هٰذَا الْيَوْمِ لِأَجْلِ ذٰلِكَ لَمْ يَكُنْ لِلَّاوِيِّ قِسْمٌ أَوَّلًا نَصِيْبٌ مَعَ اِخْوَتِهٖ الرَّبُّ هُوَ نَصِيْبُهٗ.

(تورات تکوین، اصحاح: ۱، آیت: ۸-۹)

تب خدا نے لاوی کی اولاد کو اِس لیے مخصوص کر لیا کہ خدا کے عہد کا تابوت اٹھائے اور تا کہ خدا کے آگے کھڑا ہو؛ تا کہ وہ خدا کی خدمت کریں اور اُس کے نام سے آج تک برکت لیں۔

یہی وجہ ہے کہ لاویوں کو اپنے بھائیوں کے ساتھ حصہ اور ترکہ نہیں ملا؛ کیوں کہ اس کا حصہ خدا ہے۔

اب تورات اٹھا کر دیکھو! آپ کو صاف ملے گا کہ حضرتِ ابراہیم نے اپنا تمام اثاثہ حضرتِ اسحاق کو دیا اور حضرتِ اسماعیل کو سوائے ایک پانی کی مشک (مشکیزہ) اور چند کھجوروں کے اور کچھ مال نہ ملا؛ لہٰذا ہر منصف کو یہ ماننا پڑے گا کہ قربانی حضرتِ اسماعیل ہی کی ہوئی، نہ کہ حضرتِ اسحاق کی۔

⑦

جو خدا کی نذر ہوتا ہے اس کے لیے ''خدا کے سامنے'' کا لفظ بولا جاتا۔

(تورات، سفر، عدد: ۶۷، تکوین: ۱۷، تثنیۃ تکوین: ۱۷۸، تثنیۃ: ۸-۱۰)

⑧

تورات میں ہر جگہ سامنے زندہ رہنا، قربانی اور نذر ہی کے معنی میں بولا گیا ہے۔

⑨

تورات میں ہے کہ جب خدا نے حضرتِ ابراہیم کو حضرتِ اسحاق کی خوش خبری دی تو حضرتِ ابراہیم نے کہا:

''لَیْتَ اِسْمَاعِیْلَ یَعِیْشُ اَمَامَكَ.''

کاش اسماعیل تیرے سامنے زندہ رہتا۔

تورات میں قربانی کے لیے جو لفظ خاص ہے وہ حضرتِ اسماعیل کے لیے وارد ہوا، حضرتِ اسحاق کے لیے نہیں آیا۔ یہ دلیل ہے کہ ذبیح یہ تھے نہ کہ اسحاق۔

⑩

اِن شواہد کے علاوہ سب سے بڑی ناقابل انکار شہادت حضرتِ اسماعیل کے ذبیح ہونے کی یہ ہے کہ اُن کی نسل، اُن کی ملت کے متبعین میں قربانی کی متعدد یادگاریں آج تک باقی ہیں اور بنی اسرائیل کے پاس کوئی یادگار نہیں۔ اگر ذبیح حضرتِ اسحاق تھے تو اِن کی نسل ان کی اتباع کے دعوے داروں میں کوئی نشانی باقی رہتی۔ یہ کیا راز ہے کہ اُن کے حریفوں کے یہاں متعدد یادگار اور اِن کے یہاں ایک بھی نہیں۔

وہ یادگار کیا ہے سنیں:

۞ جو شخص خدا کی نذر کر دیا جاتا، وہ سر کے بال چھوڑ دیتا تھا اور معبد کے پاس جا کر اتارتا تھا۔تورات میں ہے:

فَهَا اِنَّكَ تَحْمِلِيْنَ وَ تَلِدِيْنَ اِبْنًا وَلَايعل مُوسىٰ رَأْسَهُ لِاَنَّ الصَّبِيَّ يَكُوْنُ نَذِيْرًا اِللّٰهِ.

یعنی اب تو حاملہ ہوگی اور بچہ جنے گی اور اس کے سر پر استرہ پھیرا نہ جائے گا؛ کیوں کہ یہ بچہ خدا کے لیے نذر کیا جائے گا۔ (تورات، قضا اصحاح: ۱۳-۱۴)

حج وعمرہ میں احرام باندھنے کے وقت سے لے کر تمام مناسک سے فارغ ہونے تک بال منڈوانا، کتروانا، اکھاڑنا ممنوع ہے۔مناسک سے فراغت کے بعد بال منڈوانے، بال کتروانے کی اجازت ہے ارشاد ہے:

﴿وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ.﴾

(سورۂ بقرہ:۱۹۶)

اپنے سروں کو نہ منڈواؤ جب تک قربانی کے جانور اپنی جگہ (یعنی حرم) میں نہ پہنچ جائیں۔

۞ حضرتِ ابراہیم کو جب خدا نے بیٹے کی قربانی کا حکم دینا چاہا تو پکارا:

''اے ابراہیم! حضرتِ ابراہیم نے کہا میں حاضر ہوں۔''

(تورات، تکوین اصحاح، آیت:۲۲)

حج یا عمرہ کا احرام باندھتے ہی ہر حاجی پکارتا رہتا ہے:

لَبَّيْكَ لَبَّيْكَ. حاضر ہوں، حاضر ہوں۔

یہ اُسی سنت ابراہیم کی اتباع ہے۔

۞ شریعتِ ابراہیمی کے مطابق جسے خدا کی نذر کرتے وہ بار بار معبد، قربان گاہ کے گرد گھومتا۔

حج وعمرہ میں کعبہ کا طواف اور صفا و مروہ کی سعی اُسی یادگار کی نشانی ہے۔

۞ حضرتِ ابراہیم نے بچے کو ذبح کرنا چاہا تو انھیں روک کر اس کے عوض دنبہ ذبح ہوا۔
عیدالاضحیٰ میں ہر ذی استطاعت مسلمان اور حج میں حاجی جانوروں کی قربانی کرتا ہے؛ بلکہ یہ بہ شرائط واجب ہے، یہ سنت ابراہیمی کی پیروی ہے۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے:

سُنَّةُ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ.

قربانی تمھارے باپ ابراہیم کی سنت ہے۔

اِن یادگاروں کو دیکھ کر ہر ذی فہم یہ ماننے پر مجبور ہوگا کہ قربانی کا حکم حضرتِ اسماعیل کے لیے تھا، جن کی نسل اور متبعین میں ان کی متعدد یادگاریں آج تک باقی ہیں۔ نہ کہ حضرتِ اسحاق کے لیے، جن کی نسل اور پیروانِ ملت میں قربانی کی کوئی یادگار نہیں پائی جاتی۔

بحث دوم:

قرآنِ کریم کی روشنی میں حضرتِ اسماعیل کا ذبیح ہونا متعین ہے۔ یہاں کوئی صورت ہی نہیں کہ حضرتِ اسحاق کا ذبیح ہونا ثابت ہو سکے۔

قربانی کا واقعہ ''سورۂ صٰفٰت'' میں یوں مذکور ہے:

﴿وَقَالَ اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ۝ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ۝ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ۭ قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۡ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ۝ وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۝ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰۗؤُا الْمُبِيْنُ ۝ وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ۝ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۝ سَلٰمٌ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ۝ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝﴾ (سورۂ صٰفٰت: ۹۹ تا ۱۱۲)

''اور اس (ابراہیم) نے کہا:

میں اپنے رب کی طرف جانے والا ہوں، اب وہ مجھے راہ دے گا، الٰہی مجھے لائق اولاد دے۔

تو ہم نے اسے خوش خبری سنائی ایک بردبار لڑکے کی، پھر جب وہ اس کے ساتھ کام کے قابل ہو گیا، کہا:

اے میرے بیٹے! میں نے خواب میں تجھے ذبح کرتے ہوئے دیکھا، اب تو دیکھ تیری کیا رائے ہے؟

اس نے کہا:

اے میرے باپ! جس بات کا آپ کو حکم ہوا ہے، کیجیے۔ خدا نے چاہا تو آپ مجھے صابر پائیں گے۔

تو جب اُن دونوں نے ہمارے حکم پر گردن رکھ دی اور باپ نے بیٹے کو ماتھے کے بل لٹایا (اس وقت کا حال نہ پوچھو) اور ہم نے اسے ندا فرمائی:

اے ابراہیم! بے شک تو نے خواب سچ کر دکھایا۔

ہم ایسا ہی صلہ دیتے ہیں نیکوں کو، بے شک یہ روشن جانچ تھی اور ہم نے ایک بڑا ذبیحہ اُس کے فدیے میں دے کر اسے بچا لیا۔ اور ہم نے پچھلوں میں اُس کی تعریف باقی رکھی، سلام ہو ابراہیم پر، ہم ایسا ہی صلہ دیتے ہیں نیکوں کو، بے شک وہ ہمارے اعلیٰ درجے کے کامل الایمان بندوں میں ہے، اور ہم نے اسے خوش خبری دی اسحاق کی جو غیب کی خبریں بتانے والا نبی، ہمارے قرب خاص کی سزاواروں میں ہوگا۔''

❁ ان آیات میں حضرتِ ابراہیم کے دو فرزندوں کا تذکرہ ہے، ایک وہ جو دعا سے پیدا ہوئے اور ذبیح ہوئے جن کا نام مذکور نہیں۔ دوسرے حضرتِ اسحاق جن کی ولادت کی بشارت ہے۔ اور یہ بالکل واضح ہے کہ اگر ذبیح حضرتِ اسحاق ہوتے تو جب ''فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ'' فرمایا جا چکا ہے تو اب بعد میں ''فَبَشَّرْنٰهُ بِإِسْحٰقَ'' بالکل لغو ہو جاتا ہے؛ اس لیے ماننا پڑے گا کہ ذبیح حضرتِ اسحاق نہیں؛ بلکہ حضرتِ اسماعیل ہیں۔

❁ دوسرے یہ کہ اس آیت میں جو لڑکا ذبیح ہے اس کو ''غُلٰمٍ حَلِيْمٍ'' فرمایا گیا،

برخلاف اس کے حضرتِ اسحاق کی بشارت، اس کے علاوہ دو جگہوں میں اور ہے ان کو وہاں ''غُلٰمٍ عَلِیْمٍ'' فرمایا گیا۔ سورۂ حجر میں ہے:

﴿إِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ.﴾

فرشتوں نے کہا: ہم آپ کو علم والے بچے کی بشارت دیتے ہیں۔ (سورۂ حجر: ۵۳)

﴿وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ.﴾

فرشتوں نے انھیں علم والے بچے کی بشارت دی۔ (سورۂ ذٰریٰت: ۲۸)

ہر جگہ حضرتِ اسحاق کی صفت ''علیم'' فرمانا اور ذبیح کا وصف ''حلیم'' فرمانا، اِس امر کی کھلی دلیل ہے کہ ذبیح حضرتِ اسحاق نہیں، اسماعیل ہیں۔ ورنہ کیا وجہ ہے دیگر بشارتوں کے موقع پر اُن کو ''علیم'' کہا جائے اور یہاں نیا وصف ''حلیم'' لایا جائے۔

❁ تیسرے یہ کہ اِن آیات سے معلوم ہوا کہ حضرتِ ابراہیم کے دونوں فرزند دو مختلف طور سے پیدا ہوئے تھے۔ ایک دعا کے بعد، دوسرے بغیرِ دعا کے اور قربانی اسی لڑکے کی ہوئی تھی جو دعا سے پیدا ہوئے تھے۔

تورات میں ہے:

''اسماعیل دعوتِ ابراہیم ہیں''، یعنی ابراہیم کی دعا اور خواہش سے پیدا ہوئے۔ اسی لیے ان کا نام ''اسماعیل'' پڑا۔ عبرانی زبان میں 'اسمع' کے معنیٰ سننے کے ہیں۔ اور 'ایل' کے معنیٰ 'خدا' کے ہیں۔ اب لفظِ اسماعیل کا ترجمہ ہوا: 'خدا نے حضرتِ ابراہیم کی دعا سنی'۔

(تکوین۔ اصحاح: ۱۷-۱۸)

دوسری جگہ یہ ہے:

حضرتِ ابراہیم سے خدا نے کہا: ''اسماعیل کے بارے میں میں نے تیری سن لی۔''

ایک اور جگہ ہے:

حضرتِ اسحاق خدا کے وعدہ اور عہد کا مظہر ہیں۔'' (تورت تکوین: ۱۷-۱۸)

ان عبارت سے واضح ہے کہ حضرتِ ابراہیم کی دعا سے حضرتِ اسماعیل پیدا ہوئے تھے۔ لہٰذا ذبیح وہی ہوں گے نہ کہ حضرتِ اسحاق، جن کا وجود ایفاے عہد کی تکمیل تھا۔

❁ چوتھے یہ کہ قربانی پر باپ بیٹے کی آمادگی کا نقشہ جن الفاظ میں کھینچا گیا وہ یہ ہے:

﴿فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَ تَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ.﴾

تو جب اُن دونوں نے ہمارے حکم پر گردن رکھی۔ (سورۂ صٰفّٰت: ۱۰۳)

'اسلما' کا مصدر 'اسلام' ہے جس کے معنیٰ کسی کے بات ماننے کے ہیں۔ اس تسلیم وانقیاد کے بعد اللہ نے حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کے پیروانِ ملت کا نام مسلم رکھا، ارشاد ہے:

﴿مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ.﴾

(سورۂ حج: ۷۸)

تمھارے باپ ابراہیم کا مذہب، اُس نے پہلے تمھارا نام مسلمان رکھا۔

دستور یہی ہے کہ عظیم کارکردگی کے صلے میں ملا ہوا اعزاز نسلاً بعد نسلٍ چلتا رہتا ہے؛ لہٰذا یہ بات کھلی ہوئی ہے کہ قربانی کے اعزاز میں ملا ہوا خطاب جس کے وارثین کا ہو وہی ذبیح یقینی طور پر ہوں گے۔

وارثینِ حضرتِ اسحاق نے اپنے آپ کو بنی سرائیل، یہود، نصاریٰ، ابن اللہ اور احباء اللہ وغیرہ وغیرہ الفاظ سے مشہور کیا؛ لیکن اس میں سے کسی نے اپنے کو 'مسلم' نہیں کہا۔ برخلاف وارثینِ حضرتِ اسماعیل کے کہ وہ صبحِ قربان سے لے کر الی یومنا ہذا اپنے آپ کو مسلمان کہنے میں فخر محسوس کرتے ہیں؛ لہٰذا ثابت ہو گیا کہ مسلمانوں کے مورثِ اعلیٰ، حضرتِ اسماعیل ہی ذبیح ہیں۔

''مواہب اللدنیہ'' میں مذکور ہے:

عمر بن عبد العزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک یہودی عالم سے دریافت فرمایا کہ ذبیح کون تھا؟

تو اس نے جواب دیا:

''امیر المومنین! یہودی یقیناً خوب جانتے ہیں کہ اسماعیل ذبیح ہیں اور از راہِ حسد ان کے ذبیح ہونے سے انکار کرتے ہیں اور حضرتِ اسحاق کو ذبیح بتاتے ہیں۔''

علامہ جلال الدین سیوطی نے تحریر فرمایا ہے کہ حضرتِ اسحاق کو ذبیح کہنا اہلِ کتاب کی تحریفات سے ہے۔

تیسرا مسئلہ

قربانی کہاں ہوئی؟

اِس میں اختلاف ہے کہ قربانی کہاں ہوئی تھی، شام میں کہ عرب میں؛ لیکن یہ اختلاف ذبیح کے اختلاف کی فرع ہے۔ اہلِ کتاب حضرتِ اسحاق کو ذبیح مانتے ہیں؛ لہٰذا وہ اِس کا موقع شام مانتے ہیں اور اہلِ اسلام چوں کہ حضرتِ اسماعیل کو ذبیح مانتے ہیں؛ لہٰذا اس کا موقع عرب بتاتے ہیں اور جب ہم نے دلائلِ قاہرہ سے ثابت کر دیا کہ ذبیح حضرتِ اسماعیل ہیں تو ماننا پڑے گا کہ مقامِ قربانی عرب ہی ہے۔

اس کے علاوہ بحثِ اول میں گزرا کہ جس کی قربانی کی جاتی وہ اپنے بال چھوڑ دیتا جو قربان گاہ پر اتارا جاتا، قربان ہونے والا قربان گاہ کے پھیرے کرتا۔ شام میں کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں کسی مذہب والے اِس قسم کی رسم ادا کرتے ہوں۔ نیز حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کی اصل یادگار جانوروں کی قربانی ہے۔ قربان گاہ شام میں ہوتی تو اس یادگار کی تکمیل اسی قربان گاہ پر ہونی چاہیے تھی، نہ کہ عرب میں۔

علاوہ ازیں ''تورات'' میں قربان گاہ ''مریا'' بتائی گئی ہے۔ مریا کون سی جگہ ہے؟ اس کے تعین میں یہود و نصاریٰ خوب دست بگریباں ہیں۔

یہودی کہتے ہیں: یہ وہ جگہ ہے جہاں ہیکل سلیمانی تھا۔

عیسائی کہتے ہیں: نہیں یہ وہ جگہ ہے جہاں حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کو سولی دی گئی۔

تیسرا گروہ کہتا ہے: یہ دونوں غلط ہیں، یہ مقام ''حریزیم'' کے پہاڑ پر ہے۔

اختلافات آگے بڑھے تو کچھ لوگوں نے کہا:

''مریا'' قربان گاہ کا نام نہیں؛ بلکہ اس کا وصف ہے۔

مترجمین نے اِس کے مختلف ترجمے کیے؛ لیکن اِن میں کے محققین نے اس کا ترجمہ نہیں کیا۔ پھر کچھ زمانے کے بعد یہ لفظ ''مریا'' سے ''مورہ'' ہو گیا۔ جس کی وجہ یہ ہوئی کہ دونوں لفظ کا املا، عبرانی زبان میں قریب قریب ہے۔

’مورہ‘‘ کے بارے میں تورات میں تصریح ہے کہ عرب میں ہے:

وَكَانَ جَيْشُ الْمَدْيَانِيِّينَ شِمَالَهُمْ عِنْدَ ’’مورہ‘‘ فِي الوادی.

اور مدیانیوں کی فوج شمال کی جانب ’’مورہ‘‘ پہاڑ پر وادی میں تھی۔

’’مدیان‘‘ عرب میں واقع ہے اور عرب میں ’’مورہ‘‘ نام کی کوئی پہاڑی نہیں۔ البتہ ’’مروہ‘‘ نام کی ایک پہاڑی ہے؛ لہٰذا یہ بات بالکل قرین قیاس ہے کہ ’’مورہ‘‘ وہی پہاڑی ہے جو اب ’’مروہ‘‘ کے نام سے مشہور ہے۔ جس کے دامن میں ’’وادیِ غیر ذی زرع‘‘ ہے۔

’’مؤطا امام مالک‘‘ میں ہے:

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مروہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ قربان گاہ یہ ہے اور مکہ کی تمام پہاڑیاں اور گھاٹیاں قربان گاہ ہیں۔

تورات میں ’’مریا‘‘ یا ’’مورہ‘‘ اور حدیث میں ’’مروہ‘‘ کو قربان گاہ بتانا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ یہ ایک ہی لفظ کے مختلف تلفظ ہیں۔

علاوہ ازیں ’’یسعا‘‘ نبی کی کتاب میں ہے:

اونٹنیاں تجھے آ کر چھپا لیں گی ’’مدیان‘‘ اور ’’عیفا‘‘ کے اونٹ وہ سب جو ’’سبا‘‘ کے ہیں۔ آئیں گے وہ سونا اور لوبان لائیں گے اور خداوند کو بشارت سنائیں گے۔ قیدار کی ساری بھیڑیں ترے پاس جمع ہوں گی۔ نبیت کے مینڈھے تیری خدمت میں حاضر ہوں گے۔ وہ میری منظوری کے واسطے مرے مذبح پر چڑھائے جائیں گے اور میں اپنی شوکت والے گھر کو بزرگی دوں گا۔‘‘

(باب: ۶۰، درس: ۶-۷)

اس سے کوئی ذی انصاف انکار نہیں کر سکتا کہ ’مدیان‘ ’عیفا‘ ’سبا‘ بنی قتورہ باشندگان یمن کے اونٹ، ’قیدار‘ کی بھیڑیں، ’نبیت‘ کے مینڈھے جس مذبح پر چڑھائے جاتے ہیں اور جو خدا کا مذبح ہے، جس سے خدا کے عظمت والے گھر (بیت الحرام) کو بزرگی حاصل ہوتی ہے، وہ مکہ میں ہی ہے۔ شام میں کوئی مذبح نہیں جسے خدا کا مذبح کہا جائے اور جہاں اہلِ یمن اور اہل عرب کی قربانیاں چڑھائی جاتی ہوں اور جس سے خدا کی شوکت والے گھر کی بزرگی ظاہر ہوتی ہو۔

خلاصۂ کلام یہ کہ مذبح اور مذبح کی تعیین میں بنی اسرائیل اور اہلِ عرب کی روایات متعارض ہیں۔ اصولِ تنقید کی رو سے، ایک ناقد روایات کے تعارض کے وقت درایت سے کام لینے پر مجبور ہوتا ہے۔

درایتاً بنی اسرائیل کے پاس اپنی روایات کی تائید میں کوئی شہادت نہیں۔ برخلاف اہلِ عرب کے؛ کہ اُن کی روایات کی تائید میں متعدد شہادتیں مل رہی ہیں۔ لہذا ایک منصف مجبور ہے کہ وہ بنی اسرائیل کے مقابلے میں اہل عرب کی روایات کو صحیح مانے۔

عدنان

سیدنا اسماعیل علیہ الصلاۃ والتسلیم کے بارہ بیٹوں میں قیدار نے حجاز میں بود و باش اختیار کی۔ اللہ عزوجل نے انھیں عزت و شہرت عطا کی۔ یہی حضور سیدِ عالم ﷺ کے جد ہیں۔ قیدار کے بعد بنی جرہم کے تغلب کی وجہ سے دیگر اجداد کو وہ شہرت نہ حاصل ہو سکی۔ آگے چل کر شجرۂ پاک میں جو ہستی نمایاں ہوئی وہ عدنان کی تھی۔

عدنان بچپن ہی سے اعدا کی نظروں میں کھٹکتے تھے' پیشانی میں نورِ نبوت دیکھ کر دشمن انھیں قتل کر ڈالنا چاہتے تھے، مگر حفاظت الٰہی کے مقابلے میں دشمن ناکام رہے۔ حضرتِ ابن عباس نے فرمایا:

عدنان۔ معد۔ سبیعہ۔ خزاعہ اور اسد ملت ابراہیم پر تھے، انھیں ہمیشہ خیر سے یاد کرنا، انھوں نے حدودِ حرم کے پتھر نصب کرائے۔

ایک قول پر انھیں نے سب سے پہلے کعبے پر چمڑے کا غلاف چڑھایا۔ بخت نصر نے جب عرب پر حملہ کیا یہ قتل ہوئے اور ان کے صاحب زادے معد باقی ماندہ اشخاص کے ساتھ گرفتار ہوئے۔ ان کے دو فرزند تھے۔ معد اور عک۔ عک نے یمن میں بود و باش اختیار کی وہیں اپنی سلطنت قائم کی۔

معد:

'ارمیا' پیغمبر علیہ السلام اور ان کے کاتب 'برخیا' اُنھیں [معد کو] بخت نصر کی قید سے چھڑا کر عرب لائے۔ غالباً انھی سے دریافت کر کے اُن کے کاتب نے وہ شجرہ مرتب کیا تھا جس کا ذکر طبری نے کیا ہے کہ تدمر کے ایک یعقوب نامی نومسلم نے - جو پہلے یہودی تھا - بتایا کہ عدنان کا ایک نسب نامہ میرے پاس ارمیا پیغمبر کے منشی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، جس میں عدنان سے حضرتِ اسماعیل تک چالیس اشخاص ہیں۔

یہ جب عرب واپس ہوئے تو انھوں نے بنی جرہم کی تلاش کی۔ بڑی مشکل سے جرہم بن حلیمہ کا پتہ چلا، یہ اُن سے ملے اور اُن کی صاحب زادی سے شادی کی۔ انھی سے 'نزار' پیدا ہوئے۔ یہ بڑے جری بہادر جنگجو تھے۔ اِن کی یہودیوں سے بارہا جنگیں ہوئیں جس میں یہ ہمیشہ غالب رہے۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ 'نزار' اور 'قنص'۔

نزار:

اِن کی کنیت 'ابو ربیعہ' ہے۔ اِن کی والدہ کا نام 'معانہ' یا 'ناعمہ' تھا۔ یہ جب پیدا ہوئے تو نورِ نبوت ان کی پیشانی پر درخشاں تھا۔ جسے دیکھ کر ان کے والد بہت خوش ہوئے۔ خوشی میں اونٹ ذبح کر کے قوم کو کھلایا اور کہا کہ یہ سب اس بچے کے حق میں تھوڑا ہے۔ تھوڑے کی عربی نزار ہے؛ لہٰذا اُن کا نام 'نزار' پڑ گیا۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا سلسلۂ نسب اُن سے ملتا ہے، اُن کے چار فرزند تھے: مضر، ایاد، ربیعہ، انمار۔ نزار نے اپنے ترکے سے مضر کو اونٹ اور سرخ خیمہ اور ربیعہ کو اسپ و سلاح اور انمار کو حمار دیئے تھے۔ مضر اور ربیعہ کی نسل وسط عرب میں، انمار کی نجد اور اطرافِ حجاز میں، ایاد کی سرحدی علاقے میں پائی جاتی ہے۔ نزار نے دو شادیاں کیں، ایک سودہ بنت عک سے جن سے مضر اور ایاد ہیں، دوسری خدالہ بنت وجلان جرہمی سے جن سے ربیعہ اور انمار ہیں۔

مضر:

اِن کی والدہ کا نام سودہ یا خیبہ تھا۔ اِن کا لقب 'مضر الحمراء' تھا۔ یہ سفید رنگ، شیریں آواز تھے۔ حدی خوانی کے موجد یہی ہیں۔ ملتِ ابراہیم کے پابند تھے۔ انھیں کھٹا دودھ بہت پسند تھا۔ بنی عدنان میں سب سے زیادہ صاحبِ ثروت تھے۔ باپ نے انھیں سرخ چیزیں، سرخ اونٹ، سرک خیمہ، سرخ دینار دیا تھا؛ اس لیے 'مضر الحمراء' کہلائے۔

الیاس:

اِن کی والدہ کا نام 'ام الرباب' تھا جو معد کی پوتی تھیں۔ یہ اپنے پشت میں نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تلبیہ (لبیک لبیک) پڑھنے کی آواز سنتے تھے۔

اِن کے کارہائے نمایاں یہ ہیں:

حج کے موقع پر قربانی کے لیے اونٹوں کو بھیجنے کی سب سے پہلے رسم انھوں نے قائم کی۔ بنی اسماعیل نے خانۂ کعبہ میں ردوبدل کر کے مقام ابراہیم کو اپنی جگہ سے ہٹا دیا تھا، رکن کو بیت اللہ سے نکال کر جبل ابوقبیس میں ڈال آئے تھے، اِنھوں نے وہاں سے لا کر بیت اللہ شریف میں نصب کیا۔

علامہ سہیلی نے ایک حدیث نقل کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

الیاس کو برا مت کہو وہ مومن تھے۔

اِن کے تین بیٹے تھے: مدرکہ، طانجہ، قیس عیلان۔ اِنھی کی نسل سے، عرب کے یہ مشہور و معروف قبائل: بنو اشجع، ذبیان، غطفان، ہوازن، بنو سلیم ہیں۔

مدرکہ:

اصل نام عامر یا عمرو تھا۔ چوں کہ آبا و اجداد کے فضل و کمال حاصل کر لیے تھے؛ اس لیے مدرکہ کا نام پڑا۔ اصل لفظ 'مدرک' ہے 'ۃ' معنیٰ وصفی سے اسم کی جانب نقل کے لیے ہے۔ مدرکہ کے معنیٰ عربی میں پانے والے کے ہیں۔ ارباب سیر نے مدرکہ نام رکھنے کی وجہ یہ بھی لکھی ہے کہ ایک بار اونٹ یا خرگوش کا تعاقب کر کے پکڑ لیا تھا۔ باپ نے شاباشی کے طور پر کہا مدرکہ اور وہ مشہور ہو گیا۔

ان کے دو بیٹے تھے: خزیمہ اور ہذیل۔ حضرتِ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہذیل کی نسل سے ہیں۔

خزیمہ:

اِن کی کنیت ابوالاسد تھی۔ تین بیٹے تھے: کنان، اسد، ہون۔ عضل اور قارہ، ہون ہی کی نسل سے ہیں۔ ام المومنین حضرتِ زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا بنی اسد سے ہیں۔

کنانہ:

کنانہ کی کنیت 'ابوالنفر' تھی۔ ماں کا نام 'غوریہ بنت سور بن قیس' تھا۔

چھ بیٹے تھے: نضر، مالک، عبدِ مناف، عمر، احابیش، عامر۔

نضر:

قیس نام، ابو مخلد کنیت، لقب نضر تھا۔ نضر، زرِ سرخ کو کہتے ہیں، یہ نہایت حسین تھے۔ چہرے کی آب و تاب کی وجہ سے نضر مشہور ہو گئے۔ ماں کا نام 'برہ بنت لہز' تھا [جو] مدرکہ کے بھائی طانجہ کی پڑپوتی تھیں۔

اکثر علما کا قول ہے کہ قریش اِنھی کا خطاب ہے۔ قریش کی وجہ تسمیہ میں اہلِ لغت نے عجیب عجیب موشگافیاں کی ہیں۔ کسی نے کہا کہ قریش ویل (مچھلی) کو کہتے ہیں جو سمندری جانوروں میں سب سے بڑی ہوتی ہے، چوں کہ یہ قبیلہ تمام قبائلِ عرب سے زیادہ طاقتور تھا اور ذی شوکت تھا؛ اس لیے اس کا نام قریش پڑ گیا چناں چہ ایک شاعر کہتا ہے:

وَ قُرَيْشُ الَّذِيْ يَسْكُنُ الْبَحْرَ	بِهَا سُمِّيَتْ قُرَيْشٌ قُرَيْشًا
وہ قریش (ویل) جو سمندر میں رہتی ہے	اس کے نام پر قریش کا قریش نام پڑ گیا
سَلَّطَتْ بِالْعُلُوِّ فِيْ لَجَّةِ الْبَحْرِ	عَلٰى سَاكِنِ الْبُحُوْرِ جُيُوْشًا
سمندر کی گہرائی میں	ساکنانِ سمندر پر غالب آتی ہے
تَأْكُلُ الْغَثَّ وَ السَّمِيْنَ لَا تَتْرُكُ	فِيْهَا الَّذِيْ الْجَنَاحَيْنِ رِيْشًا
دبلا ہو یا فربہ سبھی کو کھا جاتی ہے	پر تک نہیں چھوڑتی
هٰكَذَا فِي الْاَنَامِ حَيُّ قُرَيْشٍ	يَأْكُلُوْنَ الْبِلَادَ اَكْلًا كَمِيْشًا
یوں ہی مخلوق میں قبیلۂ قریش ہے	مخلوق کو بہت جلد چٹ کر جاتے ہیں
وَ بِهٖ اٰخِرُ الزَّمَانِ نَبِيٌّ	يُكَثِّرُ الْقَتْلَ فَهُمُوْا خَمُوْشًا
انھی میں نبی آخر الزماں ہوگا	جو انھیں کفر کی قرار واقعی سزا دے گا
يَمْلَأُ الْاَرْضَ خَيْلُهٗ وَ رِجَالٌ	يَحْشُرُوْنَ اَلْمَطِيَ حَشْرًا كَثِيْشًا
ان کے سوار اور پیادے زمین کو بھر دیں گے	سواریوں کو ہر طرف سے جمع کر دیں گے

کسی نے کہا:

قریش 'تَقَرُّش' سے بنا ہے، تَقَرُّش کے معنی جمع ہونے کے ہیں۔ چوں کہ یہ قبیلہ

متفرق ہونے کے بعد اکٹھا ہوا ہے: لہٰذا اس کو قریش کہتے ہیں۔

کسی نے کہا:

قریش کے معنی کمانے اور جمع کرنے کے ہیں۔ یہ قبیلہ تجارت پیشہ تھا؛ اس لیے ان کو قریش کہنے لگے۔

کسی نے کہا:

قریش، تقریش سے بنا ہے۔ تقریش کے معنی تفتیش کے ہیں؛ چوں کہ ایامِ حج میں فقرا کو تلاش کر کر کے ان کی مدد کیا کرتے تھے؛ اس لیے ان کو قریش کہتے ہیں۔

مالک:

ان کی کنیت ابوالحارث تھی۔ ماں کا نام حارثہ بنت عدوان تھا۔

دو اولادیں تھیں: ایک فہر دوسرے حارث۔

فہر:

امام زہری نے فرمایا:

اِن کی ماں نے اِن کا نام قریش رکھا اور باپ نے فہر۔

اِن کے وقت میں حسان- حاکمِ یمن- کی نیت خراب ہوئی، اُس نے چاہا کی کعبہ ڈھا کر اس کی جگہ یمن میں دوسرا کعبہ تعمیر کرے؛ اس کے لیے وہ ایک فوج لے کر مکے پر چڑھ آیا۔ فہر نے اپنے بھائیوں کو لے کر اُس کا مقابلہ کیا، حسان گرفتار ہوا، اُس کی فوج شکست کھا گئی، بیس سال قید میں رہا، آزادی کے بعد واپس جاتے جاتے راستہ میں مر گیا۔ اِس سے فہر کا رعب تمام عرب پر چھا گیا۔

علماے سیر کی ایک جماعت اس کی قائل ہے کہ قریش اِنھی کا لقب ہے۔

زین عراقی کہتے ہیں:

اَمَّا قُرَیْشٌ فَالْاَصَحُّ فِهْرٌ جِمَاعُهَا وَالْاَکْثَرُوْنَ النَّضْرُ .

صحیح ترین قول یہی ہے کہ فہر ہی قریش ہیں اور بہتوں کا قول ہے کہ قریش نضر کا لقب

ہے۔

اِن دونوں اقوال کا حاصل ایک ہے۔ کیوں کہ نضر کی نسل صرف مالک سے چلی اور مالک کی صرف فہر سے اس لیے فہر کی اولاد کے علاوہ نضر کی اولاد کا وجود نہیں۔

غالب:

'ابو ہیتم' اِن کی کنیت تھی۔ ماں کا نام لیلیٰ بنت حارث تھا۔ دو صاحبزادے تھے۔ ایک کا نام لُوَیّ، دوسرے کا نام ہیتم تھا۔

لُوَیّ:

اِن کی ماں کا نام عاتکہ تھا۔ یہ نضر بن کنانہ کی پوتی، مخلد کی بیٹی تھیں۔

ان کے چار بیٹے تھے: (۱) کعب (۲) عوف (۳) عامر (۴) حارث۔

کعب:

بڑے دبدبے والے اور ذی شان تھے۔ یہاں تک کہ واقعۂ فیل تک چار صدی کے لگ بھگ اِن کا سنۂ وفات جاری رہا۔ یہی وہ بزرگ ہیں جنھوں نے جمعہ کے دن قوم کو اکٹھا کر کے خطبہ پڑھنے کا رواج قائم کیا۔ اِن کا دستور تھا کہ ہر جمعہ کو جس کو- یہ لوگ ''یومِ عروبہ'' کہتے تھے- قوم کو جمع کر کے خطبہ پڑھا کرتے تھے اور قوم کو بتاتے تھے کہ میری اولاد میں ایک پیغمبر آخر الزماں تشریف لائیں گے، تم سب اِن پر ایمان لانا اور اِن کی اتباع کرنا، یہ نور انھی کا ہے۔

يَالَيْتَنِيْ كُنْتُ شَاهِدًا فَحْوٰى دَعْوَتِهٖ اِذَا قُرَيْشٌ تَنْفِيْ الْحَقَّ خَذْلَانًا

اے کاش میں اُن کی دعوت کے وقت موجود رہتا، جب کہ قریش حق کو جلا وطن کریں گے۔

ان کی کنیت ابوالہُصیص تھی، ان کے پانچ بیٹے تھے:

(۱) مرہ (۲) ہصیص (۳) مسہم (۴) حمح (۵) عدی۔

مرہ:

اِن کی کنیت ابو یقطعہ تھی۔ ماں کا نام نخیتہ یا وحشیہ تھا۔ یہ شیبان بن مہارب بن فہر کی بیٹی تھیں۔ ان کے تین بیٹے تھے: (۱) کلاب (۲) تیم (۳) مخزوم۔

کلاب:

حکیم نام تھا۔ ابوزہرہ کنیت تھی۔ ماں کا نام ہندہ بنت سریر تھا۔ شکار کا شوق بہت تھا۔ اِس کے لیے شکاری کتے پال رکھے تھے۔ اِسی لیے کلاب کے نام سے مشہور ہو گئے۔ کلاب، کلب کی جمع ہے۔ کلب کا معنی کتے کے ہیں۔

اہلِ عرب کی عادت تھی کہ اولاد کا نام ثعلبہ یا صخر وغیرہ رکھتے تھے اور غلاموں کے نام رباح، اَیمن وغیرہ (اچھے نام) رکھتے تھے۔

کسی نے پوچھا تو ایک عربی نے جواب دیا:

عَبِیْدُنَا لَنَا وَ اَبْنَائُنَا لِاَعْدَائِنَا.

غلاموں کے نام اپنے لیے رکھتے ہیں اور اولاد کے نام دشمنوں کے لیے۔

ان کے دو بیٹے تھے: (۱) قصی (۲) زہرہ۔

قُصَیّ:

نام زید تھا، قصی لقب تھا۔ اس لقب سے مشہور ہونے کی وجہ یہ ہوئی کہ عہدِ طفولیت میں اِن کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا، ماں نے بنی عذرہ کے ایک شخص ربیعہ بن حرام سے شادی کر لی۔ یہ قبیلہ شام کی سرحد پر رہتا تھا، یہ بھی ماں کے ساتھ وہیں رہے، جوان ہونے کے بعد مکہ واپس آ گئے۔

قصی قاص کی تصغیر ہے۔ قاص کا معنی دور ہونے کے ہیں؛ چوں کہ یہ بچپن میں وطن سے دور رہے؛ لہٰذا اُن کو قصی کہنے لگے۔ اِن کی ماں کا نام فاطمہ بنت سود تھا۔ قصی جب مکہ واپس آئے تو اُن کے بڑے بھائی زہرہ نابینا ہو چکے تھے۔ قصی کی آواز باپ کی آواز کے مشابہ تھی، آواز سے شناخت کی اور جائداد سے ان کو حصہ دیا۔ قصی بہت ہی با اقبال انسان تھے، اِن کی وجہ سے قریش

میں چار چاند لگ گئے اور قریش کی دھاک پھر سے سارے عرب پر بیٹھ گئی۔

حضرتِ اسماعیل علیہ السلام کے بعد صدیوں تک خانۂ کعبہ کی تولیت اور مکہ کی حکومت بنی جرہم کے قبضہ میں رہی۔ اِن کے بعد عمالقہ کے قبضہ میں گئی۔عمالقہ کے بعد پھر دوبارہ بنی جرہم قابض ہو گئے۔لیکن کچھ دنوں کے بعد ان کا ہم شیرزاد بھائی ابن لحی خزاعی- جو عرب میں بت پرستی کا بانی مبانی تھا- بنی جرہم کو مکہ سے نکال کر خود قابض ہو گیا۔ جب قصی مکہ پہنچے تو ابھی تک مکہ پر بنی خزاعہ کا قبضہ بدستور تھا۔

بنی خزاعہ کے سردار حلیل کی بیٹی سے جس کا نام حُبّی تھا اُنھوں نے شادی کر لی۔ حلیل نے بیٹی کو جہیز میں کعبہ کی تولیت دی اور ابوغشیان نامی ایک شخص کو بیٹی کا وکیل مقرر کر دیا۔ جب حلیل کا انتقال ہو گیا تو ابوغشیان نے اپنا حق شراب کے ایک مشکیزے کے عوض قصی کے ہاتھ بیچ دیا۔اس طرح تقریباً ۴۴۰ء میں ہزاروں سال کے بعد تولیت کا حق، حقدار کو پہنچا۔

بنی خزاعہ نے جب دیکھا کہ یہ شرف ہمارے ہاتھوں سے نکل رہا ہے بہت پیچ و تاب کھائے بالآخر لڑائی کی ٹھان لی۔ بنی خزاعہ کے ساتھ بنی بکر اور قریش کے معاون قضاعہ و کنانہ تھے۔

سخت جنگ ہوئی، لڑائی میں دونوں طرف کے ہزاروں سورما مارے گئے، آخر تھک کر دونوں نے تعمیر بن عوف کنانی کو اپنا حکم مانا۔ اُس نے فیصلہ دیا کہ قصی، بنی خزاعہ کے مقتولوں کا خون بہا دیں۔ بنی خزاعہ مکہ چھوڑ کر باہر نکل جائیں۔ مکہ پر قصی حکومت کریں گے۔ اولاد فہر کی اس وقت بارہ شاخیں عرب کے مختلف نواح میں پھیلی ہوئی تھیں۔

قصی نے مکہ کی حکومت حاصل کرنے کے بعد اُن سب کو مکہ آباد کر کے منتشر شیرازے کو اکٹھا کر دیا؛ اس لیے قصی کو مجمع بھی کہتے ہیں۔

قُصَیٌّ لِعَمْرِیْ کَانَ یُدْعٰی مُجَمِّعًا بِہٖ جَمَعَ اللّٰہُ الْقَبَائِلَ مِنْ فِھْرِ

قصی ہی کو مجمع کہا جاتا ہے؛ اس لیے کہ ان کے ذریعہ اللہ نے فہر کے قبائل کو اکٹھا کر دیا۔

قصی کو مولا عزوجل نے دوررس دماغ عطا فرمایا تھا جس کی بدولت انھوں نے بڑے بڑے کام انجام دیے۔ دنیا میں قصی ہی پہلے شخص تھے جنھوں نے جمہوری طرز کی ۴۴۰ء میں

حکومت کی بنیاد ڈالی۔ مکہ کا مشہور دارالمشورہ 'دارالندوہ' انھی کا قائم کیا ہوا ہے۔ جہاں اہلِ مکہ اپنے خصوصی کاموں کے لیے جمع ہوتے تھے۔ جنگ کی تیاری، قافلۂ تجارت کی روانگی، نکاح خوانی کے رسوم اِسی عمارت میں سرانجام پاتے۔ ایامِ حج مین حجاج کو پانی کی سخت دشواری پیش آتی تھی، اِنھوں نے اس کا بہت معقول بندوبست کیا، چرمی حوض بنوائے۔ حج کے ایام میں اُن حوضوں کو پانی سے بھر دیتے تھے جسے بلا روک ٹوک ہر شخص پیتا۔ حجاج میں کھانا تقسیم کرنے کے لیے ''رِفادہ'' کا محکمہ قائم کیا۔

قریش کی تمام شاخوں کو جمع کر کے تقریر کی:

''حجاج کوس ہا کوس سے بیت اللہ شریف کی زیارت کے لیے آتے ہیں۔ اُن کی مہمانی ہم پر واجب ہے۔''

جس سے سب متأثر ہوئے اور سالانہ ایک رقم مقرر کر لی جس سے مکہ اور منیٰ میں حج کے ایام میں لنگر بٹتا۔ حج کے دنوں میں مشعرِ حرام پر چراغ جلانے کی رسم اِنھی کی ایجاد ہے۔ حجابت، خانۂ کعبہ کی کلید برداری، قیادت، کمانڈری، لڑائیوں میں لوا، انھی کی ایجاد ہے۔

اِنھی جلیل خدمات کی بدولت قصی کا سارے عرب میں رسوخ پیدا ہو گیا تھا اور قریش کو غیر فانی شہرت حاصل ہو گئی۔

قصی کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں: (۱) عبد مناف (۲) عبدالدار (۳) عبدالعزی عبد بن قصی۔ لڑکیاں: (۱) تخمیر (۲) برہ

مرتے وقت قصی نے قریش کے تمام مناصب اپنے بڑے بیٹے عبدالدار کو دیے جس کی وجہ سے اُن کی اولاد میں جذبۂ رقابت کے تحت نفاق کی بنیاد پڑ گئی۔

قصی کو مرنے کے بعد ''حجون'' میں دفن کیا گیا۔ بعض لوگوں نے کہا کہ قصی ہی کا لقب قریش ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں، روافض کی من گھڑت ہے؛ تاکہ حضرتِ صدیق و فاروق کا قریشی ہونا ثابت نہ ہو سکے۔

عبدِ مناف:

اصل نام مغیرہ تھا، مشہور عبدِ مناف کے ساتھ ہوئے۔ حسن و جمال میں یکتا تھے؛ اِس

لیے ان کو 'قمر البطحاء' بھی کہتے تھے۔ کنیت ابوعبد شمس ہے۔ ماں کا نام حی بنت خلیل ہے۔

کتبِ سیر میں عبد مناف کی وجہ تسمیہ یہ لکھی ہے کہ اِن کی ماں نے انھیں مناف نامی بت کی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا؛ اس لیے عبدِ مناف سے مشہور ہو گئے؛ لیکن یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے؛ اس لیے کہ حجاز میں جتنے بت تھے، سب کی فہرست موجود ہے، اِن میں مناف نام کا کوئی بت نہیں، جب اِس نام کا کوئی بت نہیں تو اُس کی خدمت کے لیے تقرر کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

قصی نے سب بھائیوں میں بڑا ہونے کی وجہ سے سرداری عبد الدار کو دے تھی؛ مگر وہ اپنی نا اہلی کی وجہ سے اسے نباہ نہ سکا۔ اس لیے قریش کی سیادت باپ کے بعد عبد مناف کو ملی۔

عبدِ مناف اُن نیک بختوں میں ہیں جو جاہلیت کے دور میں بھی لوگوں کو خدا ترسی، حق شناسی کی تلقین کیا کرتے تھے۔

علامہ زرقانی نے موسیٰ بن عقبہ کے حوالے سے ذکر کیا ہے کہ ایک کُتُبہ پر یہ لکھا ہوا پایا گیا ہے:

اَنَا الْمُغِیْرَۃُ بْنُ قُصَیٍّ اٰمُرُ بِتَقْوَی اللّٰہِ	وَ صِلَۃِ الرَّحِمِ وَاِیَّایَ عَنِّی الْقَائِلُ.
کَانَتْ قُرَیْشٌ بَیْضَۃً فَتَقَلْقَلَتْ	فَالْمُخُّ خَالِصَۃً بِعَبْدِ مَنَافٍ

میں مغیرہ بن قصی ہوں اللہ سے ڈرنے اور صلہ رحمی کا حکم کرتا ہوں میرے ہی بارے میں شاعر نے کہا ہے:

قریش انڈا ہیں تو مغز، خالص عبد مناف ہے۔

اِن کے پاس نزار کا جھنڈا اور حضرتِ اسماعیل علیہ السلام کی کمان تھی۔ نورِ محمدی کے اثر سے بے مثال حسین تھے۔ ان کے چھ بیٹے تھے:

(۱) ہاشم (۲) مطلب (۳) عبد شمس (۴) نوفل (۵) ابومرہ (۶) ابوعبیدہ۔

اور چھ ہی بیٹیاں تھیں:

(۱) غاضرہ (۲) مرہ (۳) حنہ (۴) ہالہ (۵) قلابہ (۶) ریطہ۔

اِن کا انتقال شام کے مشہور شہر غزہ میں ہوا۔

ہاشم:

عبدِ مناف کے بیٹوں میں اپنی گونا گوں خوبیوں کی وجہ سے ہاشم اور اُن کا مد مقابل ہونے کی وجہ سے اُمیہ نے غیر معمولی شہرت حاصل کی۔ بعض روایات میں ہے کہ ہاشم اور اُمیہ کا باپ عبدِ شمس جڑواں پیدا ہوئے۔ ہاشم کا پاؤں عبد شمس کی پیشانی میں چپکا ہوا تھا، علاحدہ کرنے کی کوشش کی گئی؛ مگر نا کامی ہوئی؛ بالآخر تلوار استعمال کرنی پڑی۔ اس پر کسی نے کہا تھا کہ اِن کی اولاد میں ہمیشہ تلوار چلتی رہے گی۔ بنی ہاشم و بنی امیہ کی کش مکش اور کشت وخون کی یہ پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی۔ مگر یہ روایت سخت محلِ نظر ہے، اس لیے کہ جو جڑواں بچے ایک ساتھ پیدا ہوں یہ عادۃً محال ہے۔ ایک بچے کی پیدائش میں ماں کی جان پر بن آتی ہے۔ رحم کا منہ اتنا تنگ ہوتا ہے کہ دو بچے ایک ساتھ پیدا ہو ہی نہیں سکتے۔ تجربہ شاہد ہے کہ جڑواں بچے باری باری پیدا ہوتے ہیں۔

ہاشم کا نام عمرو تھا۔ مگر 'عمرو العلاء' کے نام سے مشہور ہوئے۔ ایک بار مکہ میں قحط پڑا، لوگ بھوکوں مرنے لگے، اُس وقت ہاشم شام بہ سلسلۂ تجارت گئے ہوئے تھے۔ واپسی میں اونٹوں پر آٹا اور روٹیاں لا دلائے۔ روٹیوں کو شوربے میں توڑ کر لوگوں کو کھلایا۔ جب تک قحط دور نہ ہوا، ان کا دستر خوان نہ اٹھا۔ جب سے ہاشم کے نام سے مشہور ہوئے۔ ''ہشم'' کے معنی چورا کرنے کے ہیں۔ ان کی مدح میں ایک شاعر کہتا ہے۔

عَمْرُو الْعُلَاءِ هَشَمَ الثَّرِيْدَ لِقَوْمِهٖ وَرِجَالُ مَكَّةَ وَمَسْتَنِيْنٌ عِجَافٌ

عمرو العلاء نے ثرید بنا کر اپنی قوم کو کھلایا، ایسی حالت میں کہ مکہ کے لوگ قحط زدہ دبلے تھے۔

ماں کا نام عاتکہ بنت مرہ بن حلیل ہے۔ عاتکہ سے یہ اور عبد شمس اور مطلب تھے۔ عبد مناف کی بقیہ اولاد واقدہ بنت عمرو مُزَنِیَّہ سے تھیں۔ ہاشم بھی اپنے باپ کی طرح بہت حسین وجمیل تھے۔ نورِ محمدی کی کرنیں اُن کے چہرے سے پھوٹتی تھیں۔ اتنے بارعب تھے کہ احبار اِن کو دیکھتے تو بے ساختہ اِن کے ہاتھ کو بوسہ دیتے۔

علامہ زرقانی نے یہاں تک لکھا ہے کہ جس چیز کے قریب سے گزرتے، وہ انھیں سجدہ کرتی، سیر چشم، ہر دل عزیز، مرجع خلق تھے۔ عبدِ مناف کے مرنے کے بعد باپ کی نیابت کے لیے اِن میں اور عبدِ شمس میں اختلاف ہوا۔ جب اختلاف شدت اختیار کر گیا تو عسقلان کے ایک کاہن کے پاس فیصلے کے لیے گیے۔ اس نے ہاشم کے حق میں فیصلہ دیا۔

قصی نے تمام مناصب اپنے بڑے لڑکے عبدالدار کو دے دیے تھے، مگر وہ اپنی نااہلی کی وجہ سے کما حقہ تمام کام سرانجام نہیں دے پایا۔ یہ ہاشم جیسے اولوالعزم غیور کو گراں گزرتا، اِنھوں نے بنی عبدالدار سے تمام مناصب حاصل کرنے پر اپنے بھائیوں کو آمادہ کیا۔ مطالبہ پر بنی عبدالدار نے انکار کیا۔ کش مکش اتنی بڑھی کہ دونوں طرف جنگ کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ آخر صلح اس پر ہوئی کہ سقایا و رفادہ، ہاشم کو دے دیے جائیں۔ بقیہ مناصب بنی عبدالدار کے پاس رہیں۔ ہاشم بڑی مستعدی سے اپنی متعلقہ خدمت انجام دیتے۔ ایامِ حج میں بڑے حوصلے کے ساتھ حجاج کو کھانا کھلاتے۔ زم زم کے پاس اور منیٰ میں چمڑوں کے حوضوں میں پانی بھر کر رکھتے۔

اپنی پس ماندہ قوم کو ترقی دینے کا جذبہ بہت زیادہ تھا، اس سلسلے میں بہت کام انجام دیے۔ خط و خطابت کر کے قیصر روم وجبش کے نجاشی سے قریش پر سے تجارت کا ٹیکس معاف کرا دیا۔

اہلِ عرب کا کاروانِ تجارت جاڑوں میں یمن اور گرمیوں میں شام و انقرہ تک جاتا۔ انقرہ قیصر روم کا پایۂ تخت تھا، جب قریش وہاں جاتے تو قیصر اُن کی بہت آو بھگت کرتا۔ عرب کے بادیہ نشین لوٹ کھسوٹ میں کسی کے ساتھ رعایت نہ کرتے۔ ہاشم نے قبائلِ عرب میں دورہ کر کے اُن سے معاہدہ کر لیا تھا کہ ہمارے قافلے کے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہ کریں۔ قریش اُن کی ضرورت کی چیزیں لے کر خود ان کے گھر پہنچ جایا کریں گے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کاروانِ قریش ہمیشہ لوٹ مار سے محفوظ رہا۔

اِن کے چار بیٹے تھے: (۱) عبدالمطلب (۲) صفی (۳) اسد (۴) فضیلہ۔

اور پانچ بیٹیاں تھیں: (۱) رضیہ (۲) ضعیفہ (۳) شفا (۴) خالدہ (۵) حسنہ۔

حسبِ عادت تجارت کے لیے شام گئے۔ غزہ میں انتقال ہو گیا، ابھی عبدالمطلب کی پیدائش بھی نہیں ہوئی تھی۔

عبدالمطلب:

شیبہ یا عامر نام تھا۔ شیبۃ الحمد اور عبدالمطلب سے مشہور ہوئے۔ پیدائشی طور پر کچھ سر کے بال سفید تھے۔ شیبہ کے معنی بڑھاپے کے ہیں، موے سفید بڑھاپے کی نشانی ہے، اِسی لیے شیبہ نام پڑا۔ عبدالمطلب نام پڑنے کی وجہ یہ ہوئی کہ اِن کے والد ہاشم ایک بار شام تجارت کے لیے جارہے تھے، راستے میں مدینۂ طیبہ میں اتر پڑے، مدینہ کے مشہور و معروف قبیلۂ بنی نجار کے مہمان رہے، اُسی قبیلہ کی ایک لڑکی ''سلمٰی'' سے شادی کرلی، واپسی میں سلمٰی کو مکہ لائے۔ اخیر مرتبہ جب شام جانے لگے تو سلمٰی کو بھی ساتھ لے گئے، مدینہ پہنچ کر سلمٰی کو ان کے باپ کے گھر چھوڑا، خود شام چلے گئے۔ قضاے الٰہی، ہاشم تو وہیں سے دارالبقاء کو سدھارے، سلمٰی حاملہ تھیں، دن پورے ہونے عبدالمطلب پیدا ہوئے۔ شیبہ نام رکھا گیا۔ یہ آٹھ سال ننہال میں رہے۔ ان کے چچا مطلب کو اپنے بھتیجے کی واپسی کا خیال ہوا، تو مدینہ پہنچے اور کسی طرح اُن کو لے کر مکہ آئے۔ جب مکہ میں داخل ہو رہے تھے، عبدالمطلب اپنے چچا کے پیچھے میلے کچیلے کپڑے پہنے بیٹھے تھے، لوگوں نے سمجھا یہ مطلب کے غلام ہیں اور انھیں عبدالمطلب کہنا شروع کر دیا۔ یہ نام ایسا زباں زد ہوا کہ اصل حال معلوم ہونے پر بھی زبان سے نہ اترا۔

بعض روایتوں میں یہ ہے کہ اُن کی خستہ حالی کی بنا پر خود مطلب نے شرم کی وجہ سے پوچھنے والوں کو یہ نہیں بتایا کہ یہ میرا بھتیجا ہے؛ بلکہ یہ کہا ''ھٰذا عبدی'' یہ میرا غلام ہے اور عبدالمطلب مشہور ہو گئے۔

بعضوں نے کہا کہ چوں کہ اِن کی پرورش مطلب نے کی تھی جو چچا تھے، اہلِ عرب کی عادت تھی کہ یتیم کو پرورش کنندہ کا 'عبد' کہا کرتے تھے۔ اِسی لیے عبدالمطلب مشہور ہوئے۔ اس کی صحت محل نظر ہے۔

ہاشم کے بعد مطلب اور مطلب کے بعد عبدالمطلب کو مکہ کی ریاست ملی۔

عبدالمطلب کے مقابلے میں مکہ کی سرداری کا دعوے دار حرب بن اُمیہ حضرتِ امیر معاویہ کا دادا ہوا۔ فیصلے کے لیے حضرت عمر فاروق اعظم کے باپ خطّاب کے پاس معاملہ پہنچا۔ خطاب نے بڑے زور دار طریقے سے فیصلہ عبدالمطلب کے حق میں دیا۔ خطاب نے حرب سے خطاب

کر کے کہا عبدالمطلب عقل وفہم میں، رعب و دبدبے میں تم سے بڑھ چڑھ کر ہیں؛ اس لیے مکے کی سرداری کے وہی لائق ہیں۔

حضرتِ عبدالمطلب بہت وجیہ، جسیم، قدآور، حسین وجمیل تھے، نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انوار پیشانی سے جھلکتے تھے۔ مشک کی خوشبو اِن کے جسم سے اُٹھتی تھی۔ بہت ہر دل عزیز اور ذی رعب تھے۔ اہلِ مکہ اِن کے پورے مطیع ومنقاد تھے، غایتِ تعظیم وتکریم سے پیش آتے تھے۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ اِن کے حکم سے سرتابی کرتا۔ جود وسخا میں یکتائے زمانہ تھے۔ انسان تو انسان چرند و پرند تک اِن کی فیاضی سے متمتع تھے۔ پہاڑ پر اِن کا دسترخوان وحوش وطیور کے لیے بچھا رہتا۔ اِسی لیے اِن کو ''مُطْعِمُ طَیْرِ السَّمَاءِ'' کہتے ہیں۔ مستجاب الدعوات تھے۔ جب اہلِ مکہ پر کوئی افتاد پڑتی تو اِن سے دعا کراتے۔ عرب میں پہلے وہ شخص ہیں جنھوں نے اپنے اوپر شراب حرام کی اور پہلے وہ شخص ہیں جنھوں نے وسمہ کا سیاہ خضاب لگایا۔

شادی

ایک دن مسجدِ حرام میں سوئے اور سو کر اٹھے تو اپنے کو عجیب حال میں پایا۔ آنکھوں میں سرمہ لگا ہوا ہے، بالوں میں تیل پڑا ہوا ہے، بدن میں بیش قیمت جوڑا ہے، جمال وجلال میں چار چاند لگا ہوا ہے، متحیر ہو کر رہ گئے، مطلب انھیں ایک کاہن کے پاس لے گئے۔ اُس نے انھیں اِس حال میں دیکھ کر کہا: ان کی جلد از جلد شادی کر دو۔ مطلب نے ان کی پہلی شادی قیلہ سے کی۔ جن کے بطن سے حارث پیدا ہوئے۔ قیلہ کی وفات کے بعد ہندہ بنت عمرو سے نکاح کیا۔ آخر میں ہالہ بنت وہیب - سید الشہداء اسد اللہ حضرتِ حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی والدہ - سے نکاح ہوا۔

چاہِ زم زم کی دوبارہ کھدائی

حضرتِ اسماعیل علیہ الصلاۃ والتسلیم جب تک حیاتِ ظاہری میں رہے، کعبہ کے وہی متولی رہے۔ اُن کے بعد نیابت اُن کے بڑے بیٹے کو یہ منصب ملا۔ عدنان کے بعد ۲۰۷ء میں بنی جرہم نے بنی اسماعیل کو مکہ سے نکال دیا [اور] خود کعبہ کے متولی بن گئے۔ بنی جرہم کا ایک مشہور سردار عمرو بن حارث گزرا ہے، اُس نے اپنے زمانے میں سرداری کے نشے میں بڑے بڑے

مظالم شروع کر دیے، مقیم و مسافر کو ستانے لگا، خانۂ کعبہ کو جو نذرانے بھیجے جاتے تھے خود ہڑپ کر جاتا تھا۔ اُس کے مظالم سے تنگ آ کر قبائلِ عرب اُس کے استیصال کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ عمرو بن لحی خزاعی (بانی بت پرستی) کی سرکردگی میں متحدہ طور پر حملہ کر دیا۔ بنی جرہم کو مقابلے کی تاب نہ تھی، بھاگ کھڑے ہوئے اور یمن کی طرف چلے گئے۔

عمرو بن حارث نے بھاگتے بھاگتے یہ حرکت کی کہ حجرِ اسود کو رکن سے اکھاڑ کر اور غزال الکعبہ (ہرن کا زریں جڑواں مجسمہ جسے اسفندیار فارسی نے کعبہ پر نذر کیا تھا) و دیگر تبرکات مثلاً فدیۂ اسماعیل علیہ السلام کی سینگ، کچھ مخصوص تلواریں، زرہیں سب کو چاہ زم زم میں ڈال کر اُسے پاٹ دیا، کنویں کے نشان تک مٹا دیے۔

حرمِ پاک میں ظلم و عُدوان کی سزا میں اللہ عزوجل نے اُن پر آبلے کی وبا نازل فرمائی، جس سے کتنے ہلاک ہو گئے۔ جب مکہ اُن سے خالی ہو گیا تو بنی اسماعیل پھر تھوڑے تھوڑے آ کر مکہ میں آباد ہو گئے۔

اُس وقت سے لے کر حضرتِ عبدالمطلب کے زمانے تک چاہ زم زم کا پتہ نہ تھا۔ حضرتِ عبدالمطلب کو مسلسل چار دن تک خواب میں چاہ زم زم کھودنے کا حکم ہوا۔ پہلے اشاروں میں، پھر اخیر دن بالتصریح بتایا گیا، خواب میں ہی جگہ کی نشان دہی بھی کی گئی؛ کہ خون اور لید کے درمیان یعنی قربان گاہ پر، جہاں چیونٹی کا سوراخ ہے اور تمھارے سامنے جہاں ایسا کوّا جس کی ایک ٹانگ سفید ہو چونچ مارے، وہیں زم زم ہے۔

یہ اپنے بڑے لڑکے حارث کو لے کر کھودنے گئے۔ اُس وقت سوائے ان کے کوئی اور اولاد نہ تھی۔ وہاں اساف و نائلہ نام کے دو بت نصب تھے، یہیں قریش قربانی کیا کرتے تھے۔ قریش کو یہ گوارا نہ ہوا کہ اُن کی قربان گاہ اور دیوتاؤں کے استھان کھودے جائیں۔ اُنھوں نے روک ٹوک کی، حارث نے سب کو بھگا دیا۔ باپ بیٹے دونوں کام میں لگ گئے۔ تین دن کی محنت کے بعد کنوئیں کے آثار نمایاں ہو گئے۔ جب حضرتِ اسماعیل کی بنوائی ہوئی ''من'' نکلی تو عبدالمطلب نے تکبیر پڑھی، اب قریش دوڑے ہوئے آئے کہ ہمیں بھی اس شرف میں شریک کرو۔ عبدالمطلب اِس پر راضی نہ ہوئے، جھگڑا بڑھا۔ قریش یہ کہتے تھے کہ یہ ہمارے باپ حضرتِ

اسماعیل کا کنواں ہے، اِس میں ہم بھی تمھارے برابر کے حق دار ہیں۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ سعد بن ہذیم کی کاہنہ کے پاس چلیں، وہ جو فیصلہ کرے دونوں فریق مان لیں۔ دونوں طرف کے نمائندے اُس کاہنہ کے پاس چلے۔ حجاز و وشام کے مابین ایک خشک ریگستان میں عبدالمطلب کے ساتھیوں کا پانی ختم ہوگیا۔ جب پیاس کی شدت بڑھی تو اُنھوں نے قریش سے پانی مانگا، انھوں نے یہ بہانہ بنا کر انکار کر دیا کہ اگر قریب میں پانی نہ ملا تو کہیں تمھارے ہی جیسا ہمارا بھی حال نہ ہو۔

عبدالمطلب نے اپنے رفقا کو حکم دیا کہ سب لوگ اپنی اپنی قبریں کھود لیں جو مرتا جائے اُسے دفن کرتے جائیں۔ پورے قافلے کے بے گور وکفن پڑے رہنے سے یہ بہتر ہے کہ ایک دو آدمی کا یہ حشر ہو۔ سب لوگ قبریں کھود کر موت کا انتظار کرنے لگے۔ مگر حضرتِ عبدالمطلب کو پھر یہ خیال آیا کہ یوں پڑے رہنے سے بہتر ہے کہ سفر جاری رکھیں شاید قریب میں کہیں پانی مل جائے، سب کو کوچ کرنے کا حکم دیا۔ حضرتِ عبدالمطلب نے جب اپنی سواری اٹھائی تو دیکھا کہ اس کی کھر کے نیچے سے میٹھے پانی کا چشمہ پھوٹ پڑا ہے۔ سب نے جوشِ مسرت میں نعرۂ تکبیر بلند کیا، سواریوں سے اترے، خود پانی پیا جانوروں کو پلایا، مشکیں بھریں۔ اپنے حریف قریشوں کو بلایا:

''آؤ! اس عطیۂ ربانی سے تم بھی مستفیض ہو۔''

قریش یہ دیکھ کر بول اٹھے:

''عبدالمطلب واپس چلو! اللہ عزوجل نے فیصلہ کر دیا، تم تنہا زم زم کھودو۔

حضرتِ عبدالمطلب واپس آکر زم زم کھودنے میں لگ گئے۔ جب کھودتے کھودتے دفن کردہ کعبہ کے تبرکات غزال زریں وغیرہ ملیں تو پھر قریش نے جھگڑا کھڑا کیا کہ اِن میں ہمارا بھی حق ہے۔ قرعہ اندازی کی بات ٹھہری۔ قرعہ میں غزال زریں کعبہ کے نام اور تلواریں، زرہیں، حضرتِ عبدالمطلب کے نام نکلی۔ قریش کے نام کچھ نہ نکلا۔ حضرتِ عبدالمطلب نے غزالِ زرین اور تلواریں کعبہ کے دروازے میں لگا دیا۔ اِسی لیے کہا گیا ہے کہ پہلے وہ شخص جنھوں نے کعبہ پر سونا چڑھایا، وہ عبدالمطلب ہیں۔

اِن سب جھگڑوں سے نپٹنے کے بعد حضرتِ عبدالمطلب نے کھدائی کا کام پورا کیا۔ اِس طرح سیدنا اسماعیل علیہ السلام کے بعد حضرتِ عبدالمطلب کی محنت سے پھر دنیا چاہِ زم زم سے

سیراب ہونے لگی۔

حضرتِ عبداللہ:

اِن کی کنیت ابواحمد، ابومحمد، ابوقثم ہے۔ قثم بھی حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسمائے مبارکہ میں سے ہے۔ زم زم شریف کی کھدائی کے بعد حضرتِ عبد المطلب ایک دن حرم میں سو رہے تھے، خواب دیکھا:

''ایک درخت اُگا ہے، اتنا بلند و بالا اور تناور کہ اُس کی شاخیں آسمان تک اونچی اور شرق وغرب تک پھیلی ہوئی ہیں۔ آفتاب سے ستر گنا زیادہ روشن، عرب وعجم اُس آگے سرنگوں ہیں، وہ لحظہ بہ لحظہ بڑھتا جاتا اور بلند سے بلند تر ہوتا جاتا ہے۔ اُس کی روشنی میں بھی اضافہ ہو رہا ہے؛ لیکن کبھی چھپ جاتا ہے، کبھی ظاہر ہو جاتا ہے۔ قریش کے کچھ لوگ اس کی شاخیں پکڑ کر لٹک گئے ہیں اور کچھ لوگ اسے کاٹنے کی فکر میں ہیں؛ لیکن اُسے کاٹنے کے ارادے سے جب قریب ہوتے ہیں تو ایک حسین ترین جوان اُنھیں پکڑ کر اُن کی پیٹھ توڑ دیتا ہے، آنکھیں پھوڑ دیتا ہے۔

عبد المطلب کہتے ہیں:

میں نے چاہا کہ اُس کی کوئی شاخ پکڑ لوں؛ مگر جب ہاتھ بڑھایا تو شاخ اونچی ہوگئی۔ میں نے پوچھا یہ کیا معاملہ ہے؟ جواب ملا جس کی قسمت میں شاخوں تک رسائی تھی وہ تم سے سبقت کر گئے۔''

آپ یہ خواب دیکھ کر گھبرا اٹھے۔ قریش کے کاہنوں سے تعبیر پوچھی۔ سب نے بالاتفاق بتایا اگر تم سچ کہتے ہو تو تمھارے نسل سے وہ ہستی عالمِ وجود میں آئے گی جو شرق وغرب کی مالک اور پیشوا ہوگی۔

حضرتِ عبد المطلب کا خیال تھا کہ یہ ابو طالب ہیں، مگر جب حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث ہوئے تو خود ابو طالب کہا کرتے:

''بخدا یہ درخت ابوالقاسم امین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں۔''

اُن سے لوگ پوچھتے کہ پھر ایمان کیوں نہیں لاتے؟ جواب دیتے:

''گالی اور عار کے اندیشہ کی وجہ سے۔''

اِس کے بعد حضرتِ عبد المطلب نے فاطمہ بنت عمرو سے نکاح کیا۔ انھی کے بطن سے نوشیرواں ۴۲ رجلوس میں حضرتِ عبداللہ پیدا ہوئے۔

آفتابِ رسالت طلوع کی قریب ترین منزل پر پہنچ چکا تھا۔ اُس کی کرنیں جبینِ عبداللہ پر سپیدۂ سحرِ رحمت بن کر درخشاں تھیں۔ جس کی کشش سے مہ جبینانِ قریش کے قلوب حضرتِ عبد اللہ کے لیے بے چین رہتے۔ اُن دنوں عرب مین بے حیائی طرۂ ریاست تھا، جس کی رَو میں سے کتنی عورتوں نے حضرتِ عبداللہ کو دعوتِ معصیت دی؛ لیکن اِس پیکرِ عفت نے اُن کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔

ایک بار حضرتِ عبداللہ حرم شریف میں گئے۔ ایک عورت کعبے کے قریب کھڑی تھی، جس کا نام رقیقہ یا قتیلہ تھا۔ اُس نے حضرتِ عبداللہ سے کہا:

''وہ سو اونٹ جو تمھارے فدیے میں ذبح ہوئے تھے، مجھ سے لے لو اور میرا کہا مان لو۔''

ایز دمتعال کی امانتِ کبریٰ کے امین نے جواب میں یہ اشعار پڑھے:

اَمَّا الْحَرَامُ فَالْمَمَاتُ دُوْنَهٗ		وَ الْحِلُّ لَاَحِلُّ فَاسْتَبِيْنُهٗ
حرام سے موت بہتر ہے		حلال کو حلال جانتا ہوں لیکن اعلان چاہتا ہوں
فَكَيْفَ بِالْاَمْرِ الَّذِيْ تَبْغِيْنَهٗ		يَحْمِي الْكَرِيْمُ عِرْضَهٗ وَ دِيْنَهٗ
تو جو چاہتی ہے وہ کیسے ہوسکتا ہے		شریف اپنی آبرو اور دین کو بچائے رکھتا ہے۔

اسی طرح ایک یہودیہ ''فاطمه بنت مر الخثعميه'' نامی نے بھی حضرتِ عبداللہ کو فریب دینا چاہا تھا۔ یہ کاہنہ ہونے کے ساتھ ساتھ حسن و جمال میں یکتا اور دولت و مال میں ممتاز تھی۔ مگر حضرتِ عبداللہ نے جواب دیا:

''باپ کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کرسکتا۔''

اس قسم کی متعدد عورتوں کے بارے میں روایات آئی ہیں؛ مگر ہر موقع پر صیانتِ الٰہیہ نے حضرتِ عبداللہ کو بچالیا؛ کہ نورِ نبوت معصیت سے ملوث نہ ہو۔

سنت ابراہیمی کی تجدید

اَنَا ابْنُ الذَّبِیْحَیْنِ

چاہِ زم زم کی کھدائی سے عبدالمطلب کا تفاخر اوجِ ثریا تک جا پہنچا۔ جوشِ مسرت میں منت مانی:

''اگر دس بیٹوں کو جوان دیکھوں تو خدا کے نام پر ایک کی قربانی کروں گا۔''

فضلِ ایزدی سے وہ دن بھی آیا کہ اِن کے دس بیٹے اِن کی موجودگی میں جوان ہوئے۔ جن میں حضرتِ عبداللہ بھی تھے۔ اتفاق کی بات [کہ] منت یاد نہ رہی۔ ایک دن حرم میں سو رہے تھے، خواب دیکھا، کہنے والا کہتا ہے:

''اے عبدالمطلب! اپنی منت پوری کرو۔''

یہ گھبرا کر اٹھے اور ہانپتے کانپتے کہ سانس لینا دشوار تھا فوراً ایک دنبہ ذبح کر کے فقرا پر تقسیم کر دیا، دوبارہ خواب دیکھا:

''اس سے بڑی قربانی کرو۔''

اب کی بار اُنھوں نے گائے ذبح کی۔ پھر خواب میں کہا گیا:

''اس سے بھی بڑی۔''

دریافت کیا اس سے بڑی قربانی کیا ہے؟ جواب ملا:

''جوان بیٹا، جس کی منت مانی تھی۔

اب خواب سے بیدار ہو کر سخت متفکر تھے۔ مبادا جوان بیٹے اس کے لیے آمادہ نہ ہوں۔ سب کو جمع کیا، خواب سنایا، رگوں میں اسماعیلی خون رکھنے والے سعادت مندوں نے اپنی گردنیں خم کر دیں۔ حضرتِ عبدالمطلب نے قرعہ ڈالا۔ اتفاق کی بات [کہ] قرعہ آپ کی محبوب ترین اولاد حضرتِ عبداللہ کا نام نکلا۔ حضرتِ عبدالمطلب نے بلا چوں و چرا حضرتِ عبداللہ کا ہاتھ تھاما اور چھری لے کر قربان گاہ پہنچ گئے۔ مکے میں شور مچ گیا۔ تمام قریش ٹوٹ پڑے۔ حضرتِ عبداللہ کے ننہال

والے آڑے آئے۔قریش کے روسا نے کہا:

''کیا کر رہے ہیں؟ آپ کی دیکھا دیکھی سب لوگ اپنی اولاد لا کر ذبح کر دیں گے۔''

مگر حضرتِ عبدالمطلب اپنے ارادے سے باز نہ آئے۔حضرتِ عبدالمطلب کا عزمِ محکم دیکھ کر قریش نے ایک تدبیر سوچی،عبدالمطلب سے کہا:

''حجاز کی کاہنہ کے پاس چلو اور وہ جو کہے اس پر عمل کرو۔''

قریش کے اصرار کے آگے عبدالمطلب کو سپر ڈال دینی پڑی۔ اس کاہنہ کے پاس گئے،سب واقعہ بتایا،اس نے کہا:

''کل آنا اپنے مؤکل سے پوچھ لوں۔''

دوسرے دن یہ لوگ جب اس کاہنہ کے پاس پہنچے تو اس نے پوچھا تمھارے یہاں خوں بہا کی کیا مقدار ہے۔؟

قریش نے کہا: دس اونٹ۔

کاہنہ نے کہا:

''دس اونٹ اور عبداللہ پر قرعہ ڈالو،اگر اونٹوں کے نام قرعہ نکلے تو انٹوں کو ذبح کرو،ورنہ دس اور بڑھاؤ۔اسی طرح دس بڑھاتے جاؤ۔جب بجائے عبداللہ کے اونٹوں کا نام نکلے تو سمجھ لو کہ اللہ عزوجل عبداللہ کے بجائے اونٹوں کی قربانی پر راضی ہے۔''

مکہ واپس ہو کر قرعہ اندازی ہوئی۔سو اونٹوں پر جا کر اونٹوں کے نام قرعہ نکلا،اطمینان کے لیے متعدد بار قرعہ اندازی ہوئی،جب بار بار قرعہ اندازی پر اونٹوں کے نام قرعہ نکلا،تب کہیں جا کر حضرتِ عبداللہ کے فدیے میں سو اونٹ ذبح کیے گئے۔

انسانوں کے علاوہ وحوش وطیور نے اس ضیافتِ الٰہیہ میں وافر حصہ پایا۔اُسی وقت سے خوں بہا کی مقدار سو اونٹ ہوگئی۔حضرتِ اسماعیل علیہ السلام کے بعد حضرتِ عبداللہ کی اِسی قربانی پر فخر کرتے ہوئے نور دیدہ عبداللہ نے ارشاد فرمایا:

أَنَا ابْنُ الذَّبِيحَيْنِ.

ایک شبہ کا ازالہ

حضرتِ اسماعیل علیہ السلام کے بعد حضرتِ عبداللہ کی قربانیوں پر آج اعتراض کیا جاتا ہے کہ اولاد کو قتل کرنا انتہائی سفاکانہ و وحشیانہ فعل ہے۔

اِس میں شک نہیں کہ جو لوگ عابد و معبود، خالق و مخلوق کے تعلق سے واقف نہیں وہ اِس تسلیم و رضا کی حقیقت کو ہرگز نہیں سمجھ سکیں گے۔ اُنھیں یہ قربانیاں وحشت و بربریت ہی نظر آئے گی۔ لیکن جو لوگ وجودِ باری کے قائل ہیں اور اپنی حیات و ممات اور اُن کے سارے انقلابات کو ماورائے عقل ایک بالا دست ہستی کے زیرِ تصرف جانتے ہیں، وہ اپنی جان و مال، اہل و عیال اُس کے حکم کے بعد اُس کے نام پر قربانی کرنے کو انسانیت کی معراج سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے اُن تمام مذاہب میں جو وجودِ باری کے قائل ہیں اولاد کی قربانی کسی نا کسی عنوان سے موجود ہے۔ علاوہ مسلمانوں کے یہود و نصاریٰ کو لیجیے تو اُن کے یہاں بھی حضرتِ ابراہیم علیہ الصلاۃ والسلام کا اپنی کسی اولاد کو قربان کرنے کا قصہ فضائلِ ابراہیمی میں موجود ہے۔ افریقہ، یونان، ہندوستان اور چین کے تمام ممالک میں یہ رسم جاری تھی اور ہندوستان میں انگریزوں کی عمل داری تک موجود تھی۔ افریقہ اور نیپال کی بہت سی پہاڑی قوموں میں اب تک باقی ہے۔

اصل راز یہ ہے کہ مذاہب اپنے اندر کتنے ہی اختلاف رکھتے ہوں؛ لیکن ایک تصور سب میں مشترک ہے کہ انسان کی جان و مال، آل و اولاد سب اُس کے معبود کا عطیہ ہے، وہی انسان اور انسان کی کل کائنات کا مالک حقیقی ہے، اُسے اختیارِ کلی حاصل ہے کہ ہماری جان، مال، آل، اولاد کو جب چاہے واپس لے لے اور اُن کا جو چاہے مصرف مقرر فرما دے۔

لَهُ مَا أَخَذَ وَمَا أَعْطٰى. اُسی کا ہے جو لیا اور اُسی کا ہے جو دیا۔

اِسی بنا پر تمام مذاہب میں خیرات، صدقات، دان پُن فریضۂ الٰہی کے طور پر موجود ہے۔ جس طرح اُس مالک علی الاطلاق کو یہ اختیار ہے کہ ہماری کمائیوں سے جتنا چاہے اپنے نام پر لے لے، اُسی طرح اُسے یہ بھی اختیار ہے کہ اپنے نام پر ہماری جان کی بھی قربانی طلب کرے۔ جس طرح مال لٹانا انسان کے لیے باعثِ کمال ہے، اُسی طرح اُس کی رضا جوئی کے لیے اپنی جان قربان کر دینا وحشت و بربریت نہیں مایۂ صد افتخار ہے۔ اسی اعتقاد کے مطابق تمام مذاہب میں مال

کے ساتھ ساتھ جان کی قربانیوں کا دستور قائم ہوا۔

تاریخِ عالم کو اٹھا کر دیکھو! جب کوئی بادشاہ کسی کو سلطنت کا اہم منصب دینا چاہتا ہے تو پہلے اُس کے خلوص و محبت، جذبۂ انقیاد و جاں نثاری کو طرح طرح سے آزماتا ہے۔ اِسی طرح بندگانِ الٰہی کو روحانی عہدے اور مناصب کے لیے بڑے بڑے جانی و مالی امتحانات دینے پڑتے ہیں۔

اِس کی توضیح میں حضرتِ ابراہیم کے علاوہ حضرتِ یوسف، حضرتِ موسیٰ، حضرتِ عیسیٰ علیہم السلام کی سوانح حیات موجود ہیں۔ یہ امتحان ہی تو تھا کہ حضرتِ یوسف علیہ الصلاۃ والسلام کو والدِ ماجد کی مہر پرورش آغوش سے جدا ہو کر چاہِ کنعان میں اور چاہِ کنعان سے مصر کے بازار میں اور مصر کے بازار سے عزیزِ مصر کی غلامی میں مبتلا ہونا پڑا۔ یہ امتحان ہی تو تھا کہ حضرتِ موسیٰ کو پیدا ہوتے ہی دریا کے موجوں سے اور جوان ہوتے ہی ترکِ وطن سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ امتحان ہی تو تھا کہ حضرتِ عیسیٰ کو زندگی بھر کہیں چین نہ ملا، آخر دار و رسن کی نوبت پہنچی۔ اِن امتحانات کے بعد جو مناصب اُنھیں ملے اُن کے مقابلے میں یہ امتحانات ہیچ ہیں۔

حضرتِ ابراہیم کو خُلّت کا عہدۂ جلیلہ دینا تھا تو پیدائش سے پہلے ہی جان خطرے میں ڈال دی۔ عہدِ طفلی میں تہہ خانے میں رہے، قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں، آتش کدۂ نمرود میں جانا پڑا، ترکِ وطن کرنا پڑا، ناموس خطرے میں پڑا۔ اِن سب میں کامیابی کے بعد ابھی ایک منزل باقی تھی، انسان پر بہت سے ایسے مواقع آتے ہیں کہ اپنی جان تک دے دینا آسان سمجھتا ہے؛ لیکن کسی کی رضا جوئی کے لیے جگر پارے کی گردن پر چھری چلانا وہ کٹھن منزل ہے جس پر بہ مشکل قدم جمتا ہے؛ لیکن حضرتِ ابراہیم علیہ الصلاۃ والسلام کا جو منصب تھا وہ اِس کا مقتضی تھا کہ تمام علائق دنیوی سے انقطاعِ کلی کا ثبوت پیش کریں، اس لیے اکلوتی اولاد کی گردن پر چھری چلانے کا حکم ہوا۔ دنیا نے دیکھ لیا کہ اللہ تعالیٰ کا خلیل اس محیر العقول امتحان میں بھی اعلیٰ طور پر کامیاب رہا۔ قدرت حضرتِ اسماعیل علیہ الصلاۃ والسلام کی خون کی طالب نہ تھی؛ بلکہ باپ بیٹے کے جذبۂ تسلیم و انقیاد کو آزمانا چاہتی تھی۔ چناں چہ تسلیم و رضا کے مراحل طے ہوتے ہی اعلان کر دیا:

﴿قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا ۚ إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۝﴾

اے ابراہیم، بس تم نے اپنا خواب پورا کر دکھایا، ہم نیکوکاروں کو ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں۔ امتحان ہو چکا اپنے جلیل عہدے کا پروانہ لو۔ (سورۂ صٰفّٰت: ۱۰۵)

رہ گئے حضرتِ عبدالمطلب، اگرچہ جاہلیت کی ظلمات میں تعلیماتِ ابراہیمی کے انوار چھپ گیے تھے؛ لیکن گھنی گھٹاؤں کے گھر جانے کے بعد بھی آفتاب کی اتنی روشنی تو رہتی ہی ہے کہ انکھیارا رات دن میں تمیز کر لیتا ہے۔ اِن کے دل میں اسوۂ ابراہیمی کی اتباع کا جذبہ کارفرما تھا، تو جیسے وہ امرِ محمود ہے یہ بھی ہے، جیسے وہ موجبِ ستائش ہے باعث صدعز وشرف ہے یہ بھی ہے۔

ایک اور موشگافی

اِس موقع پر بعض لوگوں نے یہ بھی موشگافی کی ہے کہ یہ خواب تمثیلی تھا۔ ذبحِ ابن سے خدمت کعبہ کے لیے وقف کرنا مراد تھا؛ لیکن حضرتِ ابراہیم نے خطاے اجتہادی سے اس خواب کو عینی سمجھا اور بیٹے کو ذبح کرنے پر تل گئے۔ یہی وجہ ہے کہ عین موقع پر اُن کو روک دیا گیا۔

اس تاویل کی تائید میں دو باتیں پیش کی گئی ہیں:

ایک تو یہ کہ انبیا علیہم السلام کو عینی و تمثیلی دونوں طرح کے خواب دکھائے جاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ تورات میں جا بجا قربانی کا لفظ وقف علی المعبد کے معنی میں آیا ہے۔

اِس سے انکار نہیں کہ انبیاے کرام علیہم السلام کو عینی کی طرح تمثیلی خواب بھی دکھائے جاتے ہیں اور نہ اِس سے انکار ہے کہ تورات میں قربانی کا لفظ اس معنی میں آیا ہے، لیکن اس سے ضرور انکار ہے کہ حضرتِ خلیل اللہ کا یہ خواب تمثیلی تھا اور اِس خواب میں ذبح سے خدمتِ کعبہ کے لیے وقف مراد تھا اور یہ انکار مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر ہے:

①

نصوص میں اصل یہ ہے کہ اُس کے حقیقی معنی مراد لیے جائیں، جب تک اُس کے خلاف کوئی قرینۂ صارفہ نہ پایا جائے، ورنہ امان اٹھ جائے، جس کا جی چاہے جہاں چاہے بجاے معنی حقیقی کے مجازی معنی مراد لے کر تمام شریعت کو پامال کر کے رکھ دے۔ یہاں آیت کے سیاق و سباق دیکھنے سے ظاہر ہے کہ معنی حقیقی کے خلاف کوئی قرینہ نہیں، تو بلاضرورتِ داعیہ اِس سے 'وقف علی الکعبہ' مراد لینا تفسیرِ قرآن نہیں، تحریف معنی ہے۔

(۲)

اگر یہ خواب تمثیلی تھا تو ''قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤیَا'' نہ فرمایا جاتا۔ ''قَدْ أَخْطَئْتَ فِیْ فَهْمِ الرُّؤیَا'' فرمایا جاتا۔ بیٹے کی گردن پر چھری چلانے والے سے یہ نہ فرمانا کہ تم نے اپنا خواب سمجھنے میں غلطی کی؛ بلکہ یہ فرمانا کہ تم نے خواب سچ کر دکھایا ہے، اِس بات کی دلیل ہے کہ یہ خواب عینی تھا تمثیلی نہیں۔

(۳)

تورات میں وقف علی المعبد کے معنی میں لفظِ قربانی آیا ہے نہ کہ لفظ ذبح۔ ماہرین لغت جانتے ہیں کہ قربانی اور ذبح میں کتنا فرق ہے۔ قربانی اور وقف علی المعبد میں علاقہ ہے؛ لیکن ذبح اور وقف علی المعبد میں کوئی علاقہ نہیں؛ بلکہ تنافی ہے۔ وقف بقا چاہتا ہے اور ذبح کے لیے فنا لازم ہے۔

(۴)

پھر یہ کہ نظمِ قرآن کی تفسیر محاوراتِ تورات سے کرنا کہاں تک درست ہے؟ اِسے ہر عاقل سمجھ سکتا ہے، وہ بھی اِس صورت میں جب کہ تورات کا اکثر حصہ محرف ہو چکا ہے۔

(۵)

ان سب باتوں سے قطعِ نظر اِس قربانی کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

﴿اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰوءُ الْمُبِیْنُ.﴾

بلاشبہ یہ کھلا ہوا امتحان ہے۔ (سورۂ صٰفّٰت: ۱۰۶)

ظاہر ہے کہ ذبح سے مراد وقف علی المعبد لیں، تو یہ کھلا ہوا امتحان کیا سرے سے امتحان ہی نہیں رہ جاتا؛ لیکن اگر ذبح کے حقیقی معنی مراد لیے جائیں تو پھر یہ امتحان، امتحان ہے اور یقیناً اتنا بڑا کہ اِس کی رفعتوں کے حضور ملائکہ کے بھی سر خم ہیں۔

شادی:

کتبِ سماویہ میں نبیِ آخر الزماں کے مبعوث ہونے کا وقت، آبا و اجداد کے کوائف، حُلیے مذکور تھے، حضرتِ عبداللہ میں اِن علامتوں کو دیکھ کر اہلِ کتاب تاڑ گئے تھے کہ کنزِ مخفی کا دُرِّ یکتا اِنھی

کے پشت میں مکنون ہے۔ اُنھیں حسد ہوا کہ بنی اسرائیل اِس سے محروم رہے۔ وہ اس تاک میں رہتے تھے کہ کسی صورت حضرتِ عبداللہ کو قتل کر دیں۔ شام کے اہلِ کتاب کی ایک جماعت مسلح ہوکر اس مقصد کے لیے مکہ کے جنگلوں میں آکر چھپ رہی۔ ایک دن حضرتِ عبداللہ شکار کے لیے گئے۔ یہ کمینے، کمین گاہ سے نکل کر حملہ آور ہوئے۔ اِن کے حملہ کرتے ہی غیب سے کچھ سوار نمودار ہوئے اور انھیں دفع کیا۔ وہیب بن عبد مناف یہ سب منظر دیکھ رہے تھے۔ انھیں اپنی بھتیجی آمنہ کے لیے کسی شریف بَر کی تلاش تھی، اِس واقعے نے اُنھیں حضرتِ عبداللہ کی جانب متوجہ کر دیا اور اُن کی نگاہِ انتخاب حضرتِ عبداللہ پر پڑی۔ گھر آکر مشورہ کیا اور حضرتِ عبدالمطلب کے پاس اپنے کچھ دوستوں کو منگنی کے لیے بھیجا۔ اِدھر حضرتِ عبدالمطلب کو بھی جوان بیٹے کی شادی کی فکر تھی۔ آمنہ حسب ونسب، حسن و جمال میں ممتاز تھیں۔ حضرتِ عبدالمطلب کو کیا عذر ہوتا، منظور فرمالیا اور حضرتِ عبداللہ کی حضرتِ آمنہ سے شادی ہوگئی۔

اِسی موقع پر حضرتِ عبدالمطلب نے ہالہ بنت وہیب، حضرتِ آمنہ کی چچا زاد بہن سے عقد کیا، انھی کے بطن سے حضرتِ حمزہ ہیں۔

عامۂ کتبِ سیر میں یہ مذکور ہے کہ حضرتِ آمنہ کا عقد خود اُن کے باپ وہب نے کیا تھا؛ مگر یہ صحیح نہیں، اُن کا انتقال بہت پہلے ہو چکا تھا۔ حضرتِ آمنہ کی پرورش اُن کے چچا وہیب نے کی تھی اور شادی بھی انھوں نے کی تھی۔ (مدارج)

حضرتِ آمنہ بنی زہرہ کی چشم و چراغ تھیں، اُن کا نسب ماں کی طرف سے قصی پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مل جاتا ہے۔ عرب کا دستور تھا کہ شادی کے بعد دولھا تین دن سسرال میں رہتا تھا۔ حضرتِ عبداللہ بھی اِسی رسم کے مطابق تین دن سسرال میں رہے۔ شادی کے وقت اُن کی عمر تقریباً سترہ سال تھی۔

شادی کے پہلے ہی ہفتے میں رب العالمین کی امانتِ کبریٰ حضرتِ آمنہ کو تفویض ہوگئی۔ قول راجح کی بنا پر رجب کی ابتدائی تاریخ اور جمعہ کی شب تھی۔

وفات:

حضرتِ عبداللہ کی تاریخِ وفات کے بارے میں علمائے سیر مختلف قول نقل کرتے ہیں۔

سب میں راجح یہ ہے کہ حضرتِ عبداللہ کی وفات، ولادتِ مبارکہ سے پہلے ہی ہوگئی تھی۔ حاکم نے قیس بن مخرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بطنِ مادر ہی میں تھے کہ حضور کے والدِ ماجد کا انتقال ہوگیا۔ حاکم نے اسے علیٰ شرطِ مسلم صحیح کہا ہے۔ یہی امام مغازی، ابن اسحاق، امام واقدی، ابن سعد، بلاذری اور امام ذہبی کا قول ہے۔ وجہِ ترجیح ظاہر ہے کہ یہ ایک صحابی کا قول ہے، جو بروایت صحیحہ مروی ہے۔ نیز واقعاتِ ولادت میں حضرتِ عبداللہ کا کہیں کوئی تذکرہ نہیں، جب کہ تمام جزئیات مشرح ہیں۔

حسبِ دستور حضرتِ عبداللہ قریش کے کاروانِ تجارت کے ساتھ شام کے مشہور شہر 'غزہ' گئے۔ واپسی میں بیمار ہوگئے، اس لیے مدینہ میں اپنے والد کے ننہال بنی نجار میں رک گئے۔ ایک ماہ علیل رہ کر وفات پاگئے، دار نابغہ میں مدفون ہوئے۔ قافلہ والے جب مکہ واپس ہوئے اور حضرتِ عبدالمطلب کو اُن کی بیماری کا حال سنایا تو اُنھوں نے خبر گیری کے لیے اپنے بڑے بیٹے حارث کو بھیجا۔ اُنھوں نے واپس ہوکر وفات کی خبر سنائی تو سارا گھر ماتم کدہ بن گیا۔ حضرتِ آمنہ نے ایسا پر درد مرثیہ کہا ہے کہ سن کر آج بھی دل پر چوٹ لگتی ہے۔

حضرتِ عبداللہ کی وفات پر فرشتوں نے غم زدہ ہوکر بارگاہِ الوہیت میں عرض کیا:

''الٰہی تیرا نبی یتیم ہوگیا۔''

جواب ملا:

''کیا ہوا؟ میں اُس کا حافظ وحامی ہوں۔''

حضرتِ عبداللہ نے ترکے میں اونٹ، بکریاں اور ایک لونڈی چھوڑی تھی جن کا نام ''امِ ایمن'' ہے۔ ام ایمن کا اصلی نام برکہ تھا۔ یہ سب ترکہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ملا۔

ارہاصات

قبلِ نبوت خوارقِ عادات

انبیاء علیہم السلام سے قبل جو خوارق عادات صادر ہوتے ہیں، انھیں اصطلاحِ شرع میں 'ارہاص' کہتے ہیں اور بعدِ نبوت 'معجزہ'۔

تمام کتبِ سیر مملو ہیں کہ حضرتِ آمنہ کے بطنِ پاک میں نورِ نبوت کے جلوہ گر ہوتے ہی عجیب وغریب محیر العقول باتیں ظہور میں آنے لگیں، اُن میں سب سے عظیم ونمایاں اصحاب فیل کی بربادی ہے؛ جس کی تفصیل یہ ہے:

واقعۂ فیل:

بیت اللہ (کعبہ) کی وجہ سے اہلِ مکہ خصوصاً قریش کو جو عزت نصیب تھی، اُس پر اردگرد کے بادشاہوں کو بھی رشک وحسد تھا۔ مکہ کی اس دینی مرکزیت کو ختم کرنے کے لیے یمن کے بادشاہ ابرہۃ الاشرم نے صنعا میں ایک مَعبد بنوایا۔ قصرِ بلقیس کی ملبے سے قسم قسم کے رنگین پتھر منگائے، سفید، زرد، سرخ، سیاہ، چِتّی دار۔ اُن سے عمارت تیار کر کے سونے، چاندی جواہر سے منقش کیا۔ اُس میں صلیب آویزاں کی۔ ہاتھی دانت اور آبنوس کا ممبر بنوایا۔ اس کا نام قلیس رکھا۔ اتنا اونچا تھا کی دیکھنے والوں کی ٹوپیاں گر پڑتی تھیں۔ اُس کی چھت سے عدن دکھائی پڑتا تھا۔

جب یہ کلیسا بن کر تیار ہو گیا تو ابرہہ نے اپنے ماتحت علاقے میں ندا کرادی کہ اب کوئی حج کے لیے مکہ نہ جائے، مکہ کے بجائے صنعا کے قلیس کا حج کرے۔ اس کا علم جب اہلِ مکہ کو ہوا تو رقیبانہ جذبے سے مشتعل ہو کر ایک کنعانی نے جا کر پاخانہ کر کے اس کو گندا کر دیا۔ بعض روایتوں میں ہے کہ نفیل خثعمی نے اُس میں مردے ڈالے اور کچھ لوگوں نے اُسے جلا دیا۔ اس پر ابرہہ آگ بگولا ہو گیا اور قسم کھائی کی کعبہ کا ایک ایک پتھر اکھاڑ کر دم لوں گا۔ اِس ناپاک مقصد کے لیے ساٹھ

ہزار کا ایک لشکرِ جرار تیار کر کے ہاتھیوں کے ساتھ مکہ کی طرف چل پڑا۔ راستے میں یمن کے ایک رئیس ذونفر نے روکنا چاہا، نوبت جنگ تک پہنچی، ذونفر شکست کھا کر زندہ گرفتار ہوا۔ پھر نفیل بن حبیب خثعمی نے مزاحمت کی۔ یہ بھی پسپا ہو کر گرفتار ہو گیا۔ ابرہہ نے اسے قتل کرنا چاہا تو اس نے جان بچانے کے لیے کہا:

''مجھے قتل مت کر، عرب تک رہبری کا کام انجام دوں گا۔''

ابرہہ نے جان بخشی کی۔ اُس کی رہ نمائی میں ابرہہ جب طائف پہنچا تو وہاں کا رئیس مسعود بن معتب ثقفی کچھ آدمیوں کے ساتھ ملا اور اظہارِ اطاعت کے بعد ابورغال کو ہم راہ کیا کہ ابرہہ کو مکہ تک پہنچائے۔ یہ غدار مغمس پہنچ کر مر گیا، وہیں اس کی قبر ہے۔ اہل عرب جب اس کی قبر سے گزرتے ہیں تو اس پر پتھر برساتے ہیں۔

ابرہہ نے مغمس میں پہنچ کر پڑاو ڈال دیا۔ یہیں سے اسود بن مقصود کے ہم راہ کچھ سوار بھیجے، جو اہلِ مکہ کے مویشی پکڑ لائے، جن میں حضرتِ عبدالمطلب کے بھی چار سو اونٹ تھے۔ حضرتِ عبدالمطلب کو جب اِس کی خبر ملی تو ابرہہ کے پاس تشریف لے گئے۔ اُن کی بارعب، پرشکوہ صورت کو دیکھتے ہی ابرہہ تخت سے اتر پڑا، زمین پر فرش پر بیٹھا اور حضرتِ عبدالمطلب کو بھی اپنے برابر بٹھایا۔ آمد کی غرض پوچھی۔ حضرتِ عبدالمطلب نے اپنے اونٹوں کے لیے کہا۔ ابرہہ نے حیرت سے کہا:

''میں سمجھتا تھا کہ مکہ کا سردار کوئی ذی عقل انسان ہوگا، تم تو نرے احمق نکلے، میں کعبہ ڈھانے آیا ہوں جو تمھارا معبد اور شان و شوکت کا مرکز ہے، اُس کی فکر نہیں، مویشیوں کی فکر ہے۔''

حضرتِ عبدالمطلب نے فرمایا:

''اونٹ میرے ہیں؛ اس لیے مجھے اُن کی فکر ہے، کعبہ رب العالمین کا ہے، وہ خود اس کی حفاظت فرمائے گا۔

اس جواب پر ابرہہ بہت متأثر ہوا اور ان کے اونٹ واپس کر دیے۔ حضرتِ عبدالمطلب نے اِن تمام اونٹوں کو قلادہ پہنائے، ان پر جُل ڈالے، ان کے کوہان پر نشان بنائے اور انھیں حرم میں قربانی کے لیے چھوڑ دیا، ابرہہ کی لشکر کشی سے قریش کو سخت تشویش تھی۔ ابرہہ سے مقابلہ کی ان

میں تاب نہ تھی۔ کہاں ایک باقاعدہ حکومت کی کیل کانٹوں سے لیس، آراستہ و پیراستہ، منظم ساٹھ ہزار کا لشکرِ جرار اور کہاں یہ مٹھی بھر، تہی دست بے سروساماں۔

اہلِ مکہ نے حسبِ دستور پہاڑ پر جا کر حضرتِ عبدالمطلب کے وسیلے سے دعا مانگی۔ اثنائے دعا حضرتِ عبدالمطلب کی پیشانی پر ہلالی شکل کی تجلی پیدا ہوئی، اتنی تیز کہ اُس کی کرنیں بیت اللہ پر پڑیں، اُسے دیکھ کر حضرتِ عبدالمطلب نے فرمایا:

''یہ نشانِ ظفر ہے، اطمینان رکھو اب کوئی اندیشہ نہیں۔''

پھر سارے اہل مکہ کو ہدایت کی کہ یہ پہاڑوں میں چلے جائیں، خود مکہ ہی میں رہے، اس نشانِ ظفر دیکھنے کے بعد بھی حضرتِ عبدالمطلب کو چین نہ تھا۔ درِ کعبہ کا حلقہ ہاتھ میں لے کر نہایت رقت کے ساتھ یہ دعا مانگی۔

لَا هُمَّ اِنَّ الْمَرْءَ يَمْنَعُ رَحْلَهُ فَامْنَعْ رِحَالَكَ
وَانْصُرْ عَلٰى اٰلِ الصَّلِيْبِ وَعَابِدِيْهِ الْيَوْمَ اٰلَكَ
لَا يَغْلِبَنَّ صَلِيْبُهُمْ وَ مِحَالُهُمْ اَبَدًا مِحَالَكَ
جَرُّوْا جَمِيْعَ بِلَادِهِمْ وَالْفِيْلَ كَيْ يَسْبُوْا عِيَالَكَ
عَمَدُوْا حِمَاكَ بِكَيْدِهِمْ جَهْلًا وَمَا رَقَبُوْا جَلَالَكَ

- اے اللہ ہر شخص اپنے گھر کی حفاظت کرتا ہے، تو بھی اپنے گھر کی حفاظت فرما۔
- صلیب کے پجاریوں کے مقابلے میں اپنے طاعت شعاروں کی مدد فرما۔
- اُن کی صلیب اور فوج تیری فوج پر ہرگز غالب نہ آئے۔
- اپنی پوری آبادی اور ہاتھی گھسیٹ لائے ہیں؛ تاکہ تیری ظل حمایت میں رہنے والوں کو گرفتار کریں۔
- اپنی جہالت کی وجہ سے، اپنے مکر کے ساتھ، تیرے حرم کا انھوں نے قصد کیا اور تیرے جلال سے نہ ڈرے۔

دعا کے بعد حضرتِ عبدالمطلب ایک اونچی جگہ کھڑے ہو گئے؛ کہ دیکھیں پردۂ غیب سے کیا نمودار ہوتا ہے۔ زرقانی میں ہے کہ ابو مسعود ثقفی بھی حضرتِ عبدالمطلب کے ساتھ تماشا دیکھنے

کے لیے کھڑا تھا۔

اصحابِ فیل کی پیش قدمی:

ابرہہ نے صبح تڑکے لشکر درست کر کے ایک آزمودہ کار سردار حُناط حمیری کی سرکردگی میں مکہ کی طرف بھیجا۔ آگے آگے ہاتھیوں کا جھنڈ تھا، جن کا سرخیل فیلِ سفید ''محمود'' نامی تھا۔ یہ دل بہ دل جب مکہ کے قریب پہنچا اور سالار لشکر کی نظر عبدالمطلب کے پرشکوہ چہرے پر پڑی تو وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا اور یوں چیخنے لگا جیسے ذبح کے وقت جانور چلاتا ہے، ہوش میں آنے کے بعد حضرتِ عبدالمطلب کے سامنے سجدے میں گر پڑا اور کہا میں شہادت دیتا ہوں کہ تم قریش کے سردار ہو۔

یہی حال فیلِ سفید کا ہوا، جیسے ہی حضرتِ عبدالمطلب کے روبرو ہوا، بیٹھ گیا، پھر سجدہ میں گر گیا۔ حالاں کہ یہ اتنا سرکش تھا کہ کبھی ابرہہ کے بھی آگے نہیں جھکا تھا، جب کہ دوسرے ہاتھی اُسے سلامی میں سجدہ کیا کرتے تھے۔ اللہ عزوجل نے فیلِ سفید کو گویائی عطا فرمائی، اُس نے نورِ محمدی پر سلام پڑھا، پھر اَڑ گیا۔ ہر چند آں کس مارے گئے؛ مگر نہ اُٹھا۔ مکہ کے علاوہ جدھر موڑتے بھاگتا، جب مکہ کی طرف پھیرتے بیٹھ جاتا۔ جب مہاوت (ہاتھی چلانے والے) نے بہت دِق (اور تنگ) کیا تو یمن کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ اُمیہ بن صلت کہتا ہے:

اِنّ آیَاتِ رَبِّنَا بَیِّنَاتٌ		مَا یُمَارِیْ بِھِنَّ اِلَّا الْکَفُوْرُ
جَلَسَ الْفِیْلُ بِالْمُغَمِّسِ		حَتّٰی ظَلَّ یَجْبُوْ کَأَنَّہٗ مَعْقُوْرٌ

❁ ہمارے پروردگار کی نشانیاں بالکل ظاہر ہیں، جن کا انکار سوائے کافر کے کوئی نہیں کرتا۔

❁ مغمس میں ہاتھی بیٹھ گیا، یوں گھسٹنے لگا گویا اُس کے ہاتھ پاؤں کٹے ہوئے ہیں۔

اصحابِ فیل کی تباہی:

اِن عظیم نشانیوں کے دیکھنے کے بعد بھی جب اُن متمردین کے ارادے تبدیل نہ ہوئے تو وقت آ گیا کہ انھیں پوری سزا دی جائے۔ اِس کے لیے اُس قادرِ مطلق نے سمندر کی طرف سے چھوٹے چھوٹے پرندوں کی فوج بھیجی جن کے چنگلوں اور چونچوں میں مسور کے برابر کنکریاں

تھیں، اُن پرندوں نے ابرہہ کے لشکر پر سنگ باری کی، جس سے تمام لشکر پامال ہوگیا۔ سنگ ریزہ سر پر پڑتا 'خود' کو پھاڑ کر سر میں گھستا اور بدن کو چیر کر پار ہوجاتا۔ یہی نہیں، سواروں کے بعد سواریوں کو چھیدتا ہوا زمین پر پہنچتا۔ ہر سنگ ریزے پر اُس کا نام کندہ تھا، جس کے حصہ کا وہ ہوتا۔ ابرہہ کا حصہ بھی اس کے سر پر پڑا، اس کے اثر سے اُسے چیچک نکل آئی، پور پور سڑ گل کر گرا، اخیر میں دل پھٹا اور ایک زمانے تک رسوائی اور طرح طرح کی اذیت کے بعد ہلاک ہوا۔ اس عذابِ الٰہی کی تاب نہ لاکر پوری فوج سراسیمہ (وبے تاب) ہوکر بھاگ کھڑی ہوئی؛ مگر بھاگ کر کہاں جاتی۔

اَیْنَ الْمَفَرُّ وَ الاِلٰہُ الطَّالِبُ	وَالْاَشْرَمُ الْمَغْلُوْبُ لَیْسَ الْغَالِبُ

❁ بھاگنے کی جگہ کہاں؟ اللہ پکڑنے والا ہے، ہونٹ کٹا، ناک کٹا شکست خوردہ پسپا ہے۔

سب کے سب وہیں ڈھیر ہوکر رہ گئے۔ کعبہ ڈھانے کا حوصلہ رکھنے والے، سورماؤں کی تڑپتی ہوئی لاشوں سے وادی مکہ پٹ گئی۔

نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ غَضَبِہٖ وَ غَضَبِ رَسُوْلِہٖ.

صرف ابرہہ کا وزیر اُن کی تباہی کی داستان سنانے کے لیے حبشہ واپس ہوا، نجاشی کے دربار میں پہنچا، سب کیفیت بیان کی، ایک پرندہ اس کے ساتھ ساتھ تھا، جب پوری داستان سنا چکا، اُس نے سنگ ریزہ مارا اور یہ بھی وہیں تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہوگیا۔

ایک روایت میں ہے کہ فیلِ سفید، اُس کا مہاوت اور سائیس بچ گئے۔ یہ دونوں زندہ تو رہے؛ مگر مردہ سے بدتر، اندھے اپاہج ہوگئے۔ مکہ میں عرصے تک عبرت کی تصویر بن کر بھیک مانگ مانگ کر زندگی کے دن پورے کیے۔

حضرتِ ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں:

''میں نے خود ان کو اس حال میں بھیک مانگتے دیکھا ہے۔''

جب ابرہہ اور اس کی فوج کا کام تمام ہوگیا تو حضرتِ عبدالمطلب اپنے آدمیوں کے ساتھ گئے اور اُن کے اموال اور مویشی پر قبضہ کیا۔ اللہ عزوجل نے سیلاب بھیجا جو ان کی ناپاک لاشوں کو بہا کر سمندر میں پھینک آیا۔

ارہاصاتِ نبوت کی فہرست میں اصحابِ فیل کی تباہی سب سے اعظم وروشن ہے۔ اسی

لیے قرآن کریم نے اس کی طرف خاص طور پر متوجہ فرمایا ہے:

﴿اَلَمۡ تَرَ كَيۡفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصۡحٰبِ الۡفِيۡلِ ؕ اَلَمۡ يَجۡعَلۡ كَيۡدَهُمۡ فِىۡ تَضۡلِيۡلٍ ۙ وَّ اَرۡسَلَ عَلَيۡهِمۡ طَيۡرًا اَبَابِيۡلَ ۙ تَرۡمِيۡهِمۡ بِحِجَارَةٍ مِّنۡ سِجِّيۡلٍ ۙ فَجَعَلَهُمۡ كَعَصۡفٍ مَّاۡكُوۡلٍ ۧ﴾ (سورۂ فیل)

اے محبوب! کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمھارے پروردگار نے ہاتھی والوں کا کیا حال کیا؟ کیا اُن کا داؤں برباد نہ کر ڈالا اور ان پر پرندوں کے جھنڈ بھیجے، جنھوں نے انھیں سنگ ریزوں سے مار مار کر چبائے ہوئے بھس کی طرح کر ڈالا۔

واقعۂ فیل اتنا مشہور و معروف ہے کہ اُس کی صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اُس نے ایک طرف پورے ملک پر کعبہ کی عظمت و جلال کا سکہ بٹھا دیا تو دوسری طرف حضرتِ عبدالمطلب کے عز و جاہ میں چار چاند لگا دیے۔

بروایت راجح ولادتِ پاک سے پچپن دن پہلے، سترہ محرم کو یہ عبرت ناک واقعہ پیش آیا۔ بعض روایتوں میں ہفتے کا دن آیا ہے؛ مگر یہ کسی طرح درست نہیں، جب کہ ولادت ۱۲ ربیع الاول دوشنبہ کو ہوئی ہے تو پچپن دن پہلے ۱۷ محرم کو بدھ کا دن پڑتا ہے جو اِس قسم کی سرکشوں کی سرکوبی کے لیے پہلے ہی سے متعین ہو چکا ہے۔

حضرتِ امام باقر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعۂ فیل پندرہ محرم کو ہوا ہے۔ پندرہ اور سترہ کے قول میں یہ تطبیق ہو سکتی ہے کہ ابرہہ مغمس میں پندرہ کو آیا اور سترہ کو کعبہ کی طرف بڑھا۔ جس نے اُس کی آمد کو اہم سمجھا، پندرہ کہا اور جس نے اس کے حملے کو [اہم سمجھا] اس کے حملے کی تاریخ یاد رکھی۔

یہ بھی احتمال ہے کہ مبنی ہو تاریخ ولادت کے اختلاف پر، مذہبِ مشہور ۱۲ ربیع الاول ہے اور مذہب مختار دس ربیع الاول، ہو سکتا ہے کہ حضرتِ امام باقر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول مذہب مختار کی بنا پر ہو۔ واللہ تعالیٰ اعلم

دیگر خوارقِ عادت:

جس رات نورِ مصطفیٰ بطنِ آمنہ میں مستقر ہوا۔ اللہ عزوجل نے رضوان۔ خازنِ جنت۔

کو حکم دیا: فردوس کے دروازے کھول دیے جائیں۔ ایک منادی نے تمام آسمان وزمین میں ندا کی کہ نورِ نبوی بطنِ مادر میں تشریف فرما ہوگیا، آمنہ کو مبارک باد۔ اُس دن روے زمین کے تمام بت اوندھے ہوکر گر پڑے۔ تمام چوپایوں کو خصوصاً قریش کے جانوروں کو گویائی عطا ہوئی۔ انھوں نے بزبانِ فصیح یہ کہا: آج اللہ کے رسول سے ان کی والدہ حاملہ ہوئیں، ربِ کعبہ کی قسم وہ تمام دنیا کے امام اور چراغ ہیں۔ وحوشِ مشرق نے وحوشِ مغرب کو خوش خبری دی۔ قریش سخت قحط اور تنگی میں تھے، درخت سوکھ گئے تھے، جانور دبلے ہوگئے تھے۔ اللہ عزوجل نے رحمتِ عالم کے ورودِ مسعود کی تقریب میں موسلا دھار بارش برسائی، جس سے وادیاں بھر گئیں، نالے بہ نکلے، درخت سرسبز و شادب ہوگئے، جانور فربہ، تنومند ہوگئے۔ اِسی خیر و برکت کی بنا پر اہل عرب نے اس سال کا نام ''سَنَۃُ الْفَرَجِ وَالْاِبْتِہَاجِ'' رکھا۔

حضرتِ آمنہ فرماتی ہیں:

''ایامِ حمل میں حاملہ کو جن تکلیف دہ باتوں سے دو چار ہونا پڑتا ہے، ان میں سے کوئی بھی مجھے نہ ہوئی، مجھے یہ بھی پتہ نہ چلا کہ میں حاملہ ہوں، سوائے اِس کے کہ میرے ایام بند ہوگئے۔''

بعض روایتوں میں ہے کہ شدید ترین بوجھ محسوس ہوا۔ امام ابونعیم وغیرہ نے یہ تطبیق دی کہ ابتداے حمل میں بوجھ معلوم ہوا، بعد میں بالکل نہیں، یہ بھی خرقِ عادت ہے۔

نیز فرماتی ہیں:

''اُن دنوں میں نے عالمِ واقعہ میں دیکھا کہ میرے جسم سے ایک نور نکل کر تمام عالم میں پھیل گیا۔ اسی کی روشنی میں، میں نے بصرہ کے محل دیکھے۔''

اور فرماتی ہیں:

''چھ ماہ پورے ہونے پر خواب میں یہ ندا سنی:

اے آمنہ تیرے بطن میں عالم کا افضل ترین فرد ہے، جب یہ دنیا میں تشریف لائے تو اِن کا نام محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) رکھنا۔ یہ بات صیغۂ راز میں رہے۔''

❁❁❁

خورشید رسالت کا طلوع

آج بہارِ خلد وادیِ تہامہ میں اتر آئی ہے،
آسمان اپنی انجمن کے ساتھ دولت سرائے آمنہ پر جھکا آرہا ہے،
مہتاب وسطِ آسمان پر فضائے بسیط پر اپنی نقرئی چاندنی تانے ہوئے ہے،
آفتاب بڑی تیزی سے افقِ مکہ کی طرف بڑھ رہا ہے،
جبریلِ امین ملاء اعلیٰ کے نورانی انفاس کی فوج در فوج جلو میں لے کر دست بستہ کاشانۂ عبداللہ پر کھڑے ہیں،
کارکنانِ قضا وقدر چشم براہ ہیں،
ملکۂ مصر آسیہ، کنواری بتول مریم، حورانِ بہشت کے ساتھ خلوت کدۂ آمنہ میں حاضر ہیں۔

کیوں؟

اس لیے کہ نورِ ازل کا آئینۂ جمال وکمال،
قادرِ مطلق کا مظہر ذات وصفات،
ربُّ العالمین کا خلیفۂ اعظم،
خالقِ کونین کا نائب اکبر،
خزائن السماوات والارض کا مالک،
نعمہائے الٰہیہ کا قاسم،
ملکوت وملک کا تاجدار،
بحر وبر کا مختار،
سید المرسلین، خاتم النبین،
رحمت اللعالمین، شفیع المذنبین،

دعائے خلیل، تمنائے کلیم، بشارتِ مسیح،
جگر گوشۂ عبداللہ، نور دیدۂ آمنہ،
رونق افزائے عالم شہود ہونے والا ہے۔

ولادت:

حضرتِ آمنہ فرماتی ہیں:

''قربِ ولادت جب مجھے درد شروع ہوا تو میں گھر میں تنہا تھی، ایک خوف ناک آواز آئی، جس سے میں لرز اٹھی۔ پھر ایک مرغِ سفید نے میرے دل پر بازو ملا، جس سے خوف و درد جاتا رہا۔ اِس کے بعد غیب سے ایک پیالہ نمودار ہوا، جس میں نہایت شیریں شربت تھا، میں نے اُسے پی لیا جس سے مکمل سکون حاصل ہو گیا۔ پھر کچھ عورتیں غیب سے نمودار ہوئیں جو بناتِ عبد مناف کی طرح دراز قد تھیں۔ مجھے تعجب ہوا یہ کہاں سے آ گئیں۔

وہ خود بولیں:

'ہم آسیہ زوجۂ فرعون اور مریم بنت عمران ہیں، ہمارے ساتھ یہ حورانِ خلد آپ کی خدمت کی سعادت حاصل کرنے کے لیے آئی ہیں۔'

[حضرتِ آمنہ] فرماتی ہیں:

میرا حال سخت نازک تھا، لمحہ بہ لمحہ عجیب و غریب خوف ناک سے خوف ناک آوازیں آتی رہتی تھیں۔ اسی اثنا میں ریشم کے سفید کے پردے آسمان و زمین کے مابین تان دیے گئے اور کچھ لوگ نقرئی چھاگل (لوٹا) لیے آسمان و زمین کے درمیان کھڑے ہو گئے۔ پرندوں کے ایک جھنڈ نے میرے گھر کو گھیر لیا، جن کے منقار زمرد کے اور بازو یاقوت کے تھے۔ اللہ عزوجل نے غیب کے پردے اٹھا دیے، میں نے تمام روے زمین کو دیکھ لیا۔ میں نے تین سبز علَم نصب کیے ہوے دیکھے: ایک کعبہ کی چھت پر، ایک مغرب میں، ایک مشرق میں۔ میں عالمِ غیب کے اِن محیر العقول گونا گوں کرشموں کے نظارے میں محو تھی کہ محبوبِ رب العالمین اس خاک دان گیتی میں تشریف لائے۔

رَبِّ صَلِّ عَلَيْهِ أَفْضَلَ الصَّلَوَاتِ بِقَدْرِ فَضْلِهِ وَ سَلِّمْ عَلَيْهِ أَحْسَنَ

التَّسْلِيْمَاتِ بِقَدْرِ حُسْنِهٖ وَعَلٰی اٰلِهٖ وَ أَصْحَابِهٖ دَائِمًا أَبَدًا.

زمین پر قدم رکھتے ہی سجدہ میں سر رکھ کر کلمہ کی دونوں انگلیاں آسمان کی طرف اٹھا کر اپنے رب کے ساتھ راز و نیاز میں مشغول ہو گئے۔ جسمِ اقدس ہر قسم کی گندگیوں سے پاک تھا، ناف بریدہ اور مختون (ختنہ شدہ) تھے۔

ایک ابر کا ٹکڑا آیا اُنھیں لے کر نظروں سے اوجھل ہو گیا، ایک آواز آئی:

اِن کو عالم کے تمام خشک و تر کی سیر کراؤ! سب سے اِن کا تعارف کراؤ! حلیہ دکھاؤ! نام بتاؤ! اِن کا نام ''ماحی'' ہے، یہ شرک مٹانے والے ہیں۔''

دوسری روایت مفصلاً ہے:

''بعدِ ولادت ابر کا بہت بڑا چمک دار ٹکڑا نمودار ہوا، اُس میں سے گھوڑوں کے بازوؤں کی سرسراہٹ، بات چیت کی آوازیں سنائی دے رہی تھی۔ یہ ابر آں حضور ﷺ کو میری گود سے لے کر غائب ہو گیا، پھر میں نے سنا کہ کوئی کہہ رہا ہے:

محمد (ﷺ) کو تمام روئے زمین میں پھراؤ! تمام ارواح جن و انس، ملائکہ، وحوش و طیور کو پہچنواؤ! اور اِنھیں خلقِ آدم، معرفتِ شیث، شجاعتِ نوح، خلتِ ابراہیم، لسانِ اسماعیل، رضائے اسحاق، فصاحتِ صالح، حکمتِ لوط، بشریِ یعقوب، شدتِ موسیٰ، صبرِ ایوب، طاعتِ یونس، جہادِ یوشع، صوتِ داؤد، حبِ دانیال، وقارِ الیاس، عصمتِ یحییٰ، زہدِ عیسیٰ عطا کر کے تمام پیغمبروں کے اخلاق سے مزین کر دو۔ اِس کے بعد بادل چھٹ گیا۔ میں نے دیکھا کہ آپ سبز ریشمی کپڑے میں لپٹے ہوئے ہیں، اُس کپڑے سے پانی ٹپک رہا ہے۔ آواز آئی:

کیا خوب محمد (ﷺ) کو تمام دنیا پر قبضہ دے دیا گیا، دنیا کی کوئی مخلوق باقی نہ رہی جو اُن کے قبضۂ اقتدار و حیطۂ طاعت میں نہ ہو، اب میں نے چہرۂ انور کو دیکھا، ماہِ تمام کی طرح تاباں تھا اور جسمِ اقدس سے مشک اذفر کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔

پھر تین شخص نظر آئے۔ ایک کے ہاتھ مین چاندی کا جھاگل تھا۔ دوسرے کے ہاتھ میں زمرد سبز کا طشت۔ اور پھر تیسرے کے ہاتھ میں چمک دار انگوٹھی تھی۔ جس سے آنکھیں خیرہ ہوری تھیں۔ انگوٹھی کو سات بار دھو کر حضور (ﷺ) کے دونوں شانوں کے درمیان مہر نبوت لگا دی۔

پھر حضور کو ریشمی کپڑے میں لپیٹ کر اٹھایا اور تھوڑی دیر کے بعد مجھے سپرد کر دیا۔

حضرتِ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی والدہ 'شفا' سے روایت کرتے ہیں، وہ فرماتی ہیں:

''میں وقتِ ولادت حاضر تھی، یہ سعادت مجھے ہی نصیب ہوئی کہ اس عالم میں تشریف لانے کے بعد سب سے پہلے میں نے ہی آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے ہاتھوں میں لیا۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دہنِ اقدس سے کوئی آواز نکلی، غیب سے کسی نے جواب دیا:

یَرْحَمُكَ اللهُ.

[حضرتِ شفا] فرماتی ہیں:

آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تشریف لاتے ہی عظیم نور پھیلا، جس سے شرق و غرب روشن ہو گیا، حتیٰ کہ میں نے اُس کی روشنی میں شام کے محل دیکھ لیے، مجھ پر عجیب قسم کا خوف طاری ہوا، جس کے اثر سے میں کانپنے لگی۔ پھر ایک نور داہنی طرف سے پیدا ہوا اور کسی نے کہا کہ انھیں کہاں لے گئے تھے اور کسی نے جواب دیا: انھیں مغرب کی جانب لے گیا تھا اور تمام مقامات متبرکہ کی سیر کرا لایا۔ پھر بائیں جانب سے ایک نور پیدا ہوا، اس میں سے بھی کسی نے پوچھا کہاں لے گئے تھے؟ کسی نے جواب میں کہا: انھیں مشرق کی جانب لے گیا تھا اور تمام مقامات متبرکہ کی سیر کرا لایا، اِنھیں حضرتِ ابراہیم خلیل اللہ کی خدمت میں پیش کیا اور اُنھوں نے اپنے لختِ جگر کو سینے سے لگایا اور طہارت و برکت کی دعا دی۔''

عثمان بن عاص کی والدہ فرماتی ہیں:

''میں اس وقت موجود تھی، میں نے دیکھا کہ تمام گھر نور سے درخشاں ہیں اور ستارے جھکے آ رہے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ زمین پر ٹوٹ پڑیں گے۔''

حضرتِ عبدالمطلب فرماتے ہیں:

''میں شبِ ولادت کعبہ کے قریب تھا، آدھی رات کے بعد میں نے دیکھا کعبہ نے مقامِ ابراہیم کی جانب سجدہ کیا اور یہ تکبیر پڑھی:

اللهُ أَكْبَرُ اللهُ أَكْبَر، رَبُّ مُحَمَّدِ الْمُصْطَفٰى، اَلْاٰن قَدْطَهَّرَنِيْ رَبِّيْ مِنْ

اَنْجَاسِ الْاَصْنَامِ وَ اَرْجَاسِ الْمُشْرِكِيْنَ.

اللہ سب بڑا ہے، اللہ سب بڑا ہے۔ اللہ محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا پروردگار ہے۔ اب مجھے میرے پروردگار نے بتوں کی نجاست اور مشرکین کی گندگی سے پاک کیا۔

غیب سے ایک آواز آئی:

'رب کعبہ کی قسم! سب لوگ سن لو، حق تعالیٰ نے کعبہ کو برگزیدہ کر لیا اور آنے والے شہنشاہِ رسالت کا کعبہ کو قبلہ اور مسکن بنایا۔'

کعبہ کے اردگرد جتنے بت تھے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور سب سے بڑا بت ہُبل منہ کے بل اوندھا گر پڑا۔ ایک ندا آئی:

آمنہ کے بطنِ مبارک سے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، عالمِ امکاں میں رحمت کے بادل لیے جلوہ فرما ہو گئے۔''

عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

مرالظہران (مکہ کے قریب ایک وادی فاطمہ میں ایک گاؤں ہے۔ مجیب اشرف) میں 'عیص' نام کا ایک راہب رہتا تھا۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت کے قریب وہ اکثر کہا کرتا تھا: اہل مکہ تم میں ایک لڑکا پیدا ہونے والا ہے، جس کی تمام عرب اطاعت کریں گے اور وہ عجم کا بھی مالک ہوگا۔

مکہ میں جو بھی لڑکا پیدا ہوتا اُس کے حالات دریافت کرتا، جب آں حضور کی ولادت ہوئی۔ حضرتِ عبدالمطلب نے صبح کو اطلاع دی۔ اُس نے پوچھا نام کیا رکھا ہے؟ عبدالمطلب نے بتایا ''محمد''۔ اُس نے کہا کہ یہ وہی لڑکا ہے میں جس کا تذکرہ کیا کرتا تھا۔ میں انھیں تین نشانیوں سے پہچانتا ہوں۔

(۱) اِن کے طالع سے جو کل طلوع ہوا۔

(۲) اِن کی ولادت دوشنبہ کو ہوگی۔

(۳) اِن کے نام سے۔

اسی طرح کا ایک واقعہ ایک یہودی کا ہے جو بہ سلسلۂ تجارت مکہ میں رہتا تھا۔ شب

ولادت اس نے پوچھا: اے قریش! تم میں کوئی لڑکا پیدا ہوا ہے؟ جس سے پوچھا تھا اس نے لاعلمی ظاہر کی۔ اس یہودی نے بتایا: آج ایک لڑکا پیدا ہوا ہے جو خاتم النبین ہے، اس کے دونوں شانوں کے درمیان مہر نبوت ہوگی۔ تفتیش کرنے پر آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت کا پتہ چلا۔

یہودی کو حضرتِ آمنہ کے پاس لے گئے۔ یہودی آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پشت مبارک پر مہرِ نبوت دیکھتے ہی بے ہوش ہو کر گر پڑا، ہوش میں آنے کے بعد بولا: اب نبی اسرائیل سے نبوت گئی۔

یوں ہی حضرتِ حسان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ میں وقتِ ولادتِ باسعادت سات آٹھ سال کا تھا، ایک دن صبح کے وقت ایک یہودی کو چیختے چلاتے دیکھا، لوگوں نے پوچھا: تجھ پر کیا مصیبت نازل ہوئی؟ وہ بولا آج طالعِ احمد ظاہر ہو گیا، وہ آج پیدا ہو گئے۔

شہنشاہِ کونین کی آمد آمد پر عجیب انقلابات رونما ہوئے، ان میں سے چند یہ ہیں:

- آتش کدۂ فارس جیسے گستاشپ نے زرتشت کی تحریک پر مجوسیت اختیار کرنے کے بعد ہزار سال پہلے قائم کیا تھا اور اُس وقت سے لے کر اب تک کبھی بجھا نہ تھا، دفعۃً سرد ہو گیا۔
- بحیرۂ ساوا کا تمام پانی زیرِ زمین تہ نشیں ہو گیا اور وہ بالکل سوکھ گیا۔
- وادیِ سماوا جو پہلے دریا تھا، ہزار سال سے خشک پڑا تھا یک بہ یک بہ نکلا۔
- کسریٰ شاہِ ایران کے محل میں زبردست زلزلہ آیا جس کے جھٹکے سے اس کے چودہ کنگرے ٹوٹ کر گر پڑے۔

یہ زمانہ نوشیرواں کا تھا، اُس نے کثیر دولت صرف کر کے یہ دنیا کا مشہور و معروف محل بنوایا تھا۔ اتنا پائیدار تھا کہ ہارون رشید نے اُس کے دفینے حاصل کرنے کے لیے ڈھہوا کر کھودنا چاہا، کام شروع کرا دیا، مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ زلزلے اور کنگروں کے ٹوٹنے سے نوشیرواں کے دل میں خوف و ہراس پیدا ہوا، لیکن اپنے کو قابو میں رکھ کر اس کو چھپائے رکھا، کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا۔

اُس کی مملکت کے چیف جسٹس موبان نے خواب دیکھا کہ چند تیز و طرار اونٹ، عربی گھوڑوں کو کھینچتے ہوئے آئے ہیں اور دجلہ پار کر کے بلادِ فارس میں پھیل گئے ہیں، اِس کی تعبیر خود اس کے ذہن میں یہ آئی کہ عرب میں کوئی ایسی نئی بات پیدا ہوئی ہے، جس سے اہلِ عجم مغلوب ہوں

گے۔

نوشیرواں نے کاہنوں کے پاس اِن احوال کی تحقیق کے لیے آدمی دوڑائے۔ اُس زمانے میں 'سطیح' نامی ایک عجیب الخلقت کاہن تھا، اس کے بدن میں کہیں جوڑ نہ تھا اور نہ کھوپڑی اور نہ انگلیوں کے ماسوا کہیں ہڈی تھی۔ سر گردن میں کوئی امتیاز نہ تھا۔ سینے میں منہ تھا۔ اسے کہیں لے جانا ہوتا تو کپڑے میں لپیٹ کر گٹھری باندھ کر لاد لیتے اور جہاں چاہتے لے جاتے۔ خود ہل جل نہیں سکتا تھا۔ جب کچھ پوچھنا ہوتا تو دہی کے مشک کی طرح ہلاتے جس سے اس کے بدن میں قوت آتی اور وہ سوالات کے جوابات دیتا۔ اُس کی عمر تقریباً چھ سو سال تھی۔ علمِ کہانت میں یدِ طولیٰ رکھتا تھا، تمام کاہنوں کا سربراہ تھا۔

نوشیرواں کے آدمی جب سطیح کے پاس پہنچے تو وہ عالمِ نزع میں تھا۔ نوشیرواں کے آدمیوں نے اس کو سلام کرنے کے بعد نوشیرواں کا سلام پہنچایا؛ لیکن سطیح نے کوئی جواب نہیں دیا۔ نوشیرواں کے قاصد نے کچھ اشعار پڑھے جن میں کسریٰ کا سوال مذکور تھا، سطیح اُن اشعار کو سن کر ہنسا اور بولا:

''جس وقت قرآن کی تلاوت ہونے لگے اور صاحبِ عصا ظاہر ہو جائیں تو وادیِ ساوا بہنے لگے، دریائے ساوا خشک ہو جائے، آتش کدۂ فارس بجھ جائے اور سطیح مر جائے۔''

سطیح اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ اس کی روح نکل گئی۔

❁ تمام عالم کے بت اُس رات اوندھے منہ گر پڑے۔ حضرتِ عبدالمطلب کا چشم دید واقعہ او پر گزرا۔ قریش اپنے بت کے تھان پر سالانہ میلا لگاتے تھے، اتفاق سے یہ ایام میلے کے تھے، قریش نے اُس رات دیکھا کہ بت اپنی جگہ سے گر پڑا۔ جلدی سے دوڑے گئے اور اُسے اٹھا کر سیدھا کھڑا کر دیا؛ لیکن پھر گر پڑا، دوبارہ اٹھا رکھا؛ مگر پھر گر پڑا۔ لیکن قریش نے پھر تیسری مرتبہ اس کو بڑی مضبوطی کے ساتھ اس کی جگہ نصب کیا۔ اب کے اس کے جوف (اندر) سے آواز آئی۔

تَرَدّٰی بِمَوْلُوْدٍ أَضَاءَتْ بِنُوْرِهٖ	جَمِيْعُ فُجَاجِ الْاَرْضِ بَالشَّرْقِ وَالْغَرْبِ
وَخَرَّتْ لَهُ الْاَوْثَانُ طَرًّا وَ ارْعَدَتْ	قُلُوْبُ مُلُوْكِ الْأَرْضِ مِنَ الرُّعْبِ

❁ ہلاک ہو گئے اُس مولود کی پیدائش سے جس کے نور سے شرق و غرب کے تمام گلیاں

چمک اٹھیں۔

۞ اور تمام بت گر پڑے اور اس کی ہیبت سے، روے زمین کے تمام بادشوں کے دل لرز اٹھے۔

تاریخِ ولادت:

تاریخ ولادت کے بارے میں کئی اختلافات ہیں، کون سا مہینہ تھا، اس میں چھ اقوال ہیں:

(۱) ربیع الاول (۲) ربیع الآخر (۳) رجب (۴) رمضان (۵) محرم (۶) صفر۔

اِسی طرح جو لوگ ربیع الاول کو ماہِ ولادت مانتے ہیں، اُن میں تاریخ کے بارے میں شدید اختلاف ہے، سات اقوال ہیں:

(۱) دو (۲) آٹھ (۳) دس (۴) بارہ (۵) سترہ (۶) اٹھارہ (۷) بائیس۔

رات کا وقت تھا یا دن کا؟ جگہ کون سی تھی؟

صدیوں کی بحث وتمحیص کے بعد یہ طے ہو چکا ہے کہ مہینہ 'ربیع الاول' کا تھا اور وقت صبح صادق کا تھا اور جگہ مکۂ معظّمہ، اُس جگہ جہاں چند سال پہلے تک مَولد پاک کی عمارت موجود تھی، جسے ڈھا کر نجدی حکومت نے برابر کر دیا۔ دن کے بارے میں البتہ کوئی اختلاف نہیں۔ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ دوشنبہ کا دن تھا؛ لیکن تاریخ کا مسئلہ جتنا پہلے پیچیدہ تھا اتنا ہی آج بھی ہے۔ جمہور اس کے قائل ہیں کہ ۱۲ ربیع الاول ہے۔ حتی کہ ابن جوزی وغیرہ نے اس پر اجماع کا دعویٰ بھی کیا ہے۔

علامہ زرقانی شرح مواہب اللدنیہ میں فرماتے ہیں:

وَالْمَشْهُوْرُ اَنَّهُ ﷺ وُلِدَ يَوْمَ الْإِثْنَيْنِ ثَانِيَ عَشَرَ رَبِيْعِ الْاَوَّلِ، وَهُوَ قَوْلُ مُحَمَّدِ ابْنِ اِسْحٰقَ ابْنِ يَسَارٍ اِمَامِ الْمَغَازِيْ وَ قَوْلُ غَيْرِهٖ ، قَالَ ابْنُ كَثِيْرٍ وَهُوَ الْمَشْهُوْرُ عِنْدَ الْجُمْهُوْرِ ، وَ بَالَغَ ابْنُ الْجَوْزِيْ وَ ابْنُ الْجَزَّارِ فَنَقَلَا فِيْهِ الْاِجْمَاعَ وَهُوَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْعَمَلُ.

مشہور یہ ہے کہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم دوشنبہ کے دن بارہ ربیع الاول کو پیدا ہوئے، یہی امام مغازی ابن اسحاق وغیرہ کا قول ہے، ابنِ کثیر نے کہا جمہور کے نزدیک یہ مشہور ہے۔ ابنِ جوزی و

ابنِ جزار نے اس میں مبالغہ کیا اور اجماع نقل کر ڈالا، اِسی پر عمل ہے۔

لیکن علمِ ہیئت کے ماہرین کا اس پر اجماع ہے کہ آٹھ ربیع الاول کو ولادت ہوئی، اسی میں ہے:

وَقِيْلَ لِثَمَانٍ خَلَتْ مِنْهُ، وَاخْتَارَهُ الْحُمَيْدِيُّ وَشَيْخُهُ ابْنُ حَزْمٍ وَحَكَى الْقَضَاعِيُّ فِي عُيُوْنِ الْمَعَارِفِ اِجْمَاعَ اَهْلِ الزِّيْجِ عَلَيْهِ.

اور ایک قول ہے کہ آٹھ ربیع الاول کو ولادت ہوئی۔ حمیدی اور اس کے استاد ابن حزم نے اسے اختیار کیا۔ قضاعی نے عیون المعارف میں اہل زیج (توقیت) کا اس پر اجماع نقل کیا۔

لیکن سیرۃ النبی وغیرہ میں تاریخِ ولادت ۹؍ربیع الاول تحریر ہے اور یہ مصر کے مشہور ہیئت داں محمود پاشا فلکی کی تقلید ہے۔ محمود پاشا فلکی نے ایک رسالہ ''نتائج الافہام'' لکھا، اس میں بڑی عرق ریزی سے یہ ثابت کیا ہے کہ صحیح تاریخِ ولادت ۹؍ربیع الاول ہے۔ اس کا اقتباس حاشیۂ سیرۃ النبی میں یہ ہے:

''صحیح بخاری میں ہے کہ حضرتِ ابراہیم (شہزادۂ سرکار رسالت) کے انتقال کے وقت آفتاب میں گہن لگا تھا اور دس ہجری تھا اور اس وقت آپ کی عمر کا ترسٹھواں سال تھا۔ ریاضی کے قاعدے سے حساب لگانے سے معلوم ہوتا ہے کہ دس ہجری کا گرہن ۷؍جنوری ۶۳۲ء کو آٹھ بج کے تیس منٹ پر لگا تھا۔ اس حساب سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر قمری ترسٹھ برس پیچھے ہٹیں تو آپ کی پیدائش کا سال ۵۷۱ء ہے، جس میں از روئے قواعد رویت ربیع الاول کی پہلی تاریخ ۱۲؍اپریل کے مطابق ہے، تاریخِ ولادت میں اختلاف ہے۔ لیکن اس قدر متفق علیہ ہے کہ وہ ربیع الاول کا مہینہ دوشنبہ کا دن تھا، تاریخ آٹھ سے لیکر بارہ تک میں منحصر ہے۔ ربیع الاول مذکور کی اِن تاریخوں میں دوشنبہ کا دن نویں تاریخ کو پڑتا ہے۔ اِن وجوہ کی بنا پر تاریخ ولادت قطعاً ۲۰؍اپریل ۵۷۱ء تھی۔''

سیرت کی اور دوسری اردو کتاب رحمۃ للعالمین میں بھی اسی کو اختیار کیا [ہے۔] اُس میں ہے:

تاریخ ولادت میں مؤرخین نے اختلاف کیا ہے، طبری وابنِ خلدون نے ۱۲؍تاریخ، ابو

الفدا نے ۱۰ رلکھی ہے، مگر سب کا اتفاق ہے کہ دوشنبہ کا دن ۹ ربیع الاول کے سوا کسی اور تاریخ سے مطابقت نہیں کھاتا، اس لیے ۹ ربیع الاول ہی صحیح ہے۔ تاریخ دول العرب والاسلام میں محمد طلعت بک عرب نے بھی ۹ رتاریخ ہی کو صحیح قرار دیا ہے۔ (ج:۲،ص:۴۲)

محمود پاشا فلکی کی تحقیق پر از روے قواعدِ ہیئت کلام، کوہ کن، کاہ بیار سے کم نہیں، اِس لیے اِس پُر پیچ وادی سے ناظرین کو بچاتے ہوئے ہم چند عام فہم معروضات پیش کرتے ہیں:

۞ اس میں دو رائے نہیں کہ کسی واقعے کو قیاس سے ثابت کرنا تاریخ نویسی نہیں، افسانہ نگاری ہے، جب کہ اُس واقعہ کے بارے میں تاریخی شہادتیں موجود ہوں۔ ہاں اگر روایات مختلف ہوں تو کسی ایک روایت کو قیاس سے ترجیح دے سکتے ہیں۔

تاریخِ ولادت کے بارے میں روایتیں موجود ہیں۔ اُن روایتوں میں سے کسی ایک روایت کو ترجیح دینے کے لیے علمِ ہیئت کی شہادت پیش کی جاسکتی ہے۔ اُن روایتوں سے الگ کوئی تاریخ معین کرنی - اگر چہ وہ علم ہیئت کی مدد سے ہو- اصولِ سوانح نگاری کے بالکل خلاف ہے۔ کتب حدیث وسیر کا ایک ایک ورق پڑھ جایئے۔ آپ کو ۹ رتاریخ کی کوئی روایت کہیں نہیں ملے گی، اِس کا مطلب یہ ہے کہ ۹ رکو ولادتِ مبارکہ نہ ہونے پر محدثین وارباب سیر کا اجماع مؤلّف ہے۔ اس اجماع کے خلاف قواعدِ رویت کی مدد سے ۹ رتاریخ متعین کرنی کسی طرح لائق قبول نہیں۔ خود علماے ہیئت اس پر متفق ہیں کہ علم فلکیات کے تمام قواعد تخمینی ہیں، روایاتِ صحیحہ کے مقابلے میں تخمین پر بھروسا کرنا کبھی بھی دیانت داری نہیں کہی جاسکتی۔

۞ پھر حساب کی غلطی بہت ممکن، ادنیٰ سی بھول چوک سے حساب کچھ کا کچھ ہوسکتا ہے، یہیں دیکھیے حاشیۂ سیرۃ النبی میں حضرتِ ابراہیم رضی اللہ عنہ کا یوم وفات ۷ رجنوری تحریر ہے، اور رحمۃ للعالمین میں ۲۷ رجنوری، اِن میں کون صحیح ہے یہ کون بتائے؟

۞ حضرتِ ابراہیم رضی اللہ عنہ کے یومِ وصال قمری کی کون سی تاریخ تھی؟ یہ حاشیۂ سیرۃ النبی میں نہیں ہے؛ مگر رحمۃ للعالمین میں ۲۹ رشوال اور دن دوشنبہ کا لکھا ہے اور از روے قواعد سورج گہن قمری مہینے کی تین آخری تاریخوں کے علاوہ اور کسی تاریخ میں لگ نہیں سکتا۔ ایک کی تحقیق کے مطابق ۱۰ھ کی ۲۹ رشوال کو ۷ رجنوری تھی، دوسرے کے تحقیق کے مطابق ۲۷ رجنوری، اِن

دونوں میں کون سا حساب درست ہے، یہ فیصلہ کیسے ہو؟

۞ چلیے آپ کی خوشی سے ہم مان لیتے ہیں کہ ۵۷۱ء میں ربیع الاول کی ۹ر تاریخ کو دو شنبہ تھا، تو جب ۹ر کو دوشنبہ تھا تو ۲ر کو بھی دوشنبہ ہوگا، پھر ۲ر کو چھوڑ کر ۹ر کی ترجیح، ترجیح بلا مرجح ہی نہیں ترجیح معدوم ہے؛ کیوں کہ ابھی گزر چکا کہ ۹ر کا کوئی قول نہیں اور ۲ر کے بارے میں روایت ہے، تو ترجیح ہوگی تو ۲ر کو نہ کہ ۹ر کو۔ اور اگر بغیر روایت کے ۹ر کی ترجیح پر اصرار ہے تو جیسے ۹ر ویسے ہی ۱۶ر ویسے ۲۳ر ویسے ہی ۳۰ر۔ پھر ۹ر کے اختیار کی وجہ؟

الغرض انھی کے محققین کے تسلیم کردہ اصول کے مطابق ترجیح اگر ہوگی تو ۲ر کو، ۹ر کی ترجیح کسی طرح ممکن نہیں۔

۞ اس تحقیق میں بنیادی غلطی یہ ہے کہ اِن لوگوں نے روایتوں کو پس پشت ڈال کر اپنے جی سے مختلف فیہ باتوں کو متفق علیہ بنا کر ۹ر کو اختیار کر لیا ہے۔

مثلاً محشی سیرۃ النبی لکھتے ہیں:

''تاریخِ ولادت میں اختلاف ہے؛ لیکن اس قدر متفق علیہ ہے کہ وہ ربیع الاول کا مہینہ اور دوشنبہ کا دن تھا اور تاریخ آٹھ سے لے کر بارہ تک میں منحصر ہے۔''

رحمۃ للعالمین میں ہے:

''تاریخِ ولادت میں مؤرخین نے اختلاف کیا، طبری وابنِ خلدون نے ۱۲ر تاریخ، ابو الفدا نے ۱۰ر لکھی، مگر سب کا اتفاق ہے کہ دوشنبہ کا دن ۹ر ربیع الاول کے سوا کسی اور تاریخ سے مطابقت نہیں رکھتا۔''

اِن لوگوں نے جن جن باتوں کو متفقہ بتایا ہے، اُن میں سوائے اِس کے کہ دوشنبہ کا دن تھا اور کوئی بات متفق علیہ نہیں، نہ مہینہ، نہ تاریخ کا ۸ر سے لے کر ۱۲ر میں منحصر ہونا، نہ دوشنبہ کے دن کا صرف ۹ر ربیع الاول کے ساتھ مطابق ہونا، مہینے کے بارے میں چوں کہ راجح مختار یہی ہے کہ ربیع الاول ہے؛ اس لیے ہم اس سے قطع نظر کرتے ہیں، بقیہ باتوں کے بارے میں طول طویل شہادتوں کے بجائے زرقانی علی المواہب کی یہ جامع عبارت پیش کرتے ہیں:

فَقِيلَ اَنَّهُ وُلِدَ لَيْلَتَيْنِ خَلَتَا مِنْ رَبِيعٍ الأَوَّلِ بِهِ قَالَ صَدْرُ مُغَلْطَائِيْ وَ

قَالَ لِثَمَانٍ خَلَتْ مِنْهُ، قَالَ الشَّيْخُ قُطْبُ الدِّيْنِ الْقَسْطَلَانِيُّ وَ هُوَ اخْتِيَارُ أَكْثَرِ أَهْلِ الْحَدِيْثِ وَ نُقِلَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ وَ هُوَ اخْتِيَارُ أَكْثَرِ مَنْ لَهُ مَعْرِفَةٌ بِهٰذَا الشَّانِ يَعْنِيْ التَّارِيْخَ وَ اخْتَارَهُ الْحُمَيْدِيُّ وَ شَيْخُهُ ابْنُ حَزْمٍ وَحَكَى الْقَضَاعِيُّ فِيْ عُيُوْنِ الْمَعَارِفِ إِجْمَاعَ أَهْلِ الزِّيْجِ عَلَيْهِ وَ رَوَاهُ الزُّهْرِيُّ عَنْ محمدِ بْنِ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ وَ كَانَ عَارِفًا بِالنَّسَبِ وَ أَيَّامِ الْعَرَبِ وَقِيْلَ وُلِدَ لِاثْنَيْ عَشَرَ مِنْ رَبِيْعِ الْأَوَّلِ وَ عَلَيْهِ عَمَلُ أَهْلِ مَكَّةَ قَدِيْمًا وَ حَدِيْثًا فِيْ زِيَارَةِ مَوْلِدِهٖ فِيْ هٰذَا الْوَقْتِ وَ قِيْلَ لِسَبْعَ عَشَرَةَ وَ قِيْلَ لِثَمَانَ عَشَرَةَ وَ قِيْلَ لِثَمَانَ بَقِيْنَ وَ قِيْلَ إِنَّ هٰذَيْنِ الْقَوْلَيْنِ الْآخِرَيْنِ غَيْرُ صَحِيْحَيْنِ عَمَّنْ حُكِيَا عَنْهُ بِالْكُلِّيَةِ وَالْمَشْهُوْرُ أَنَّهُ ﷺ وُلِدَ يَوْمَ الْإِثْنَيْنِ ثَانِيْ عَشَرَ رَبِيْعَ الْأَوَّلِ وَ هُوَ قَوْلُ مُحَمَّدِ بْنِ إِسْحَاقَ إِمَامِ الْمَغَازِيْ وَ قَوْلُ غَيْرِهٖ قَالَ ابْنُ كَثِيْرٍ وَ هُوَ الْمَشْهُوْرُ عِنْدَ الْجُمْهُوْرِ وَ بَالَغَ ابْنُ الْجَوْزِيُّ وَ ابْنُ الْجَزَّارِ فَنَقَلَا الْإِجْمَاعَ وَ هُوَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْعَمَلُ.

''ایک قول یہ ہے کہ تاریخِ ولادت ۲ ربیع الاول ہے، یہ صدر مغلطائی کا قول ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ ۸ ہے، شیخ قطب الدین قسطلانی نے فرمایا یہی اکثر محدثین کا مختار اور ابن عباس و جبیر بن مطعم سے منقول ہے۔ اکثر ماہرینِ تاریخ اور حمیدی، اُس کے استاذ ابن حزم کا بھی مختار ہے۔ قضاعی نے عیون المعارف میں اہل ہیئت کا اس پر اجماع بتایا۔ ابن شہاب زہری نے محمد بن جبیر بن مطعم سے اِسے روایت کیا جو انساب اور عرب کی تاریخ کے ماہر تھے۔

اور ایک قول یہ ہے کہ ۱۲ ہے، اِسی پر اہلِ مکہ کا ہمیشہ سے عمل ہے کہ مکانِ ولادت (اس سے معلوم ہوا کہ انبیا اولیا کے مکان مولد کی زیارت جائز ہے، اس حکم میں مدفن بھی ہے۔ مجیب اشرف) کی زیارت اِسی تاریخ میں کرتے ہیں۔

ایک قول سترہ کا ہے۔

اور ایک اٹھارہ کا۔

اور ایک بائیس کا۔

اخیر کے دنوں میں جس کی طرف منسوب ہے اس سے بروایت صحیح ثابت نہیں۔ اور مشہور

۱۲ ربیع الاول دوشنبہ کا دن ہے۔ یہی ابن اسحاق امام مغازی وغیرہ کا قول ہے۔ ابن کثیر نے کہا یہی جمہور کے نزدیک مشہور ہے۔ ابن جوزی اور ابن جزار نے اس پر بہت مبالغہ کیا اور اجماع نقل کر ڈالا، عمل اسی پر ہے۔''

دمیاطی اور ابوالفدا نے ۱۰ ربیع الاول کو اختیار کیا، اِن میں اٹھارہ بائیس کا قول ساقط الاعتبار ہے، باقی پانچ اقوال بچے، جب تاریخ کے بارے میں اتنے اقوال ہیں تو یہ کہنا کیسے صحیح ہے کہ تاریخ آٹھ سے لے کر بارہ تک میں منحصر ہے، یا صرف بارہ یا دس ہے۔

اِسی طرح یہ بھی متفق علیہ نہیں کہ سنہ ولادت کے ربیع الاول میں دوشنبہ کا دن سوائے نو کے کسی اور تاریخ سے مطابقت نہیں رکھتا، ابھی گزرا کہ تمام اہلِ ہیئت کا اس پر اتفاق ہے کہ اِس سال آٹھ ربیع الاول کو دوشنبہ تھا۔ نیز برسبیلِ صدق جس طرح دوشنبہ کا دن نو (۹) کو پڑے گا اُسی طرح دو (۲) سولہ (۱۶) تیئس (۲۳) تیس (۳۰) کو بھی پڑے گا۔ پھر نو کی ترجیح کس بنا پر؟ اور اگر اسے درست مان لیا جائے تو ترجیح دو کو ہونی چاہیے؛ کیوں کہ ۲ کی روایت ہے، ۹ کی کوئی روایت نہیں۔ مختصر یہ کہ ۹ ربیع الاول کا قول روایۃً درایۃً کسی طرح اس لائق بھی نہیں کہ اسے ذکر کیا جائے، چہ جائے کہ اسے محقق ومختار بتایا جائے۔

صحیح تاریخ:

ابھی گزرا کہ ان سات اقوال میں پانچ لائقِ غور ہیں، اُن میں آٹھ ربیع الاول کا قول بحیثیت روایت اور درایت ہر طرح راجح ومختار ہے۔ بحیثیت روایت یوں کہ یہ سید المفسرین سیدنا وابن سیدنا حضرتِ عبداللہ بن عباس اور حضرتِ جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہم جیسے اجلۂ صحابہ کا قول ہے۔ ابن شہاب زہری اور محمد بن جبیر بن مطعم جیسے اکابر تابعین سے منقول ہے۔ یہی اکثر محدثین اور ماہرینِ تاریخ کا مختار ہے۔ اور بحیثیت درایت یوں کہ اس پر تمام اہل ہیئت کا اجماع ہے۔

لیکن چوں کہ بارہ ربیع الاول کا قول عوام وخواص سب میں مشہور ہے اور جمہور اہل سیر کا مختار ہے، اِسی پر تمام امت کا عمل ہے اور تلقیِ امت بالقبول کا شرع میں بہت اعتبار ہے۔ اس لیے جشن میلاد النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منانے کے لیے ۱۲ ربیع الاول ہی مختار ہے۔ اس کے خلاف میں انتشار و افتراق ہے۔

اب ہم اِس بحث کو امام اہلِ سنت مجدد اعظم اعلیٰ حضرتِ امام احمد رضا خان صاحب بریلوی قدس سرہ السامی کے کلمات طیبات پر تمام کرتے ہیں۔

اعلیٰ حضرتِ قدس سرہ جہاں دینیات میں یگانۂ وقت تھے وہیں ریاضی کے بھی امام تھے، اس لیے تاریخ و توقیت دونوں حیثیت سے آپ کے ارشادات قول فیصل ہیں۔ اعلیٰ حضرتِ قدس سرہ کا اس موضوع پر ایک رسالہ بھی ہے، بدقسمتی سے وہ رسالہ نہیں مل سکا۔ جمادی الاولیٰ ۱۳۱۸ھ کا تحفۂ حنفیہ کا شمارہ ملا، اس میں یہ جواہر پارے ملے جو ہدیۂ ناظرین ہیں:

سوال: ولادتِ اقدس حضور پُرنور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تاریخ کیا ہے۔ بینوا وتوجروا

جواب: دو۔ آٹھ۔ دس۔ بارہ۔ سترہ۔ اٹھارہ۔ بائیس۔ سات اقوال ہیں، مگر اشہر و اکثر و ماخوذ و معتبر دوازدہم ربیع الاول شریف ہے۔ مکۂ معظّمہ میں ہمیشہ اِسی تاریخ کو مکانِ مولدِ اقدس کی زیارت کرتے ہیں۔ کذا فی المواھب والمدارج.

اور خاص اس مکانِ جنت نشان میں اِسی تاریخ کو مجلس مقدس ہوتی ہے۔ کذا فی المدارج.

علامہ قسطانی و فاضل زرقانی فرماتے ہیں:

اَلْمَشْھُوْرُ أَنَّہٗ ﷺ وُلِدَ یَوْمَ الْإِثْنَیْنِ ثَانِیَ عَشَرَ رَبِیْعِ الْأَوَّلِ وَ ھُوَ قَوْلُ مُحَمَّدِ بْنِ إِسْحٰقَ إِمَامِ الْمَغَازِیْ وَغَیْرِہٖ وَ عَلَیْہِ الْعَمَلُ.

مشہور یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دوشنبہ کے دن بارہ ربیع الاول کو پیدا ہوئے، یہی امام مغازی ابنِ اسحاق وغیرہ کا قول ہے اور اسی پر عمل ہے۔

شرح مواہب میں امام ابن کثیر سے ہے:

اَلْمَشْھُوْرُ عِنْدَ الْجُمْھُوْرِ اسی میں ہے: ھُوَ الَّذِیْ عَلَیْہِ الْعَمَلُ.

شرحِ ہمزیہ میں ہے:

ھُوَ الْمَشْھُوْرُ عَلَیْہِ الْعَمَلُ.

اسی طرح مدارج وغیرہ میں تصریح کی:

وَإِنْ کَانَ أَکْثَرُ الْمُحَدِّثِیْنَ وَالْمُؤَرِّخِیْنَ عَلٰی ثَمَانٍ خَلَوْنَ وَعَلَیْہِ أَجْمَعَ

اَهْلُ الزِّيْجَاتِ وَاخْتَارَهُ ابْنُ حَزْمٍ وَالْحُمَيْدِيُّ وَرُوِيَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَ جُبَيْرِ ابْنِ مُطْعِمٍ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُمْ وَ بِالْاَوَّلِ صَدَرُ مُغَلْطَائِي وَاعْتَمَدَهُ الذَّهْبِيُّ فِي تَذْهِيْبِ التَّذْهِيْبِ تَبَعًا للمزی فِي التَّهْذِيْبِ وَ حَكَى الْمَشْهُوْرَ بِقِيْلَ وَصَحَّ دِمْيَاطِيُّ عَشْرًا خَلَتْ اَقُوْلُ وَحَاسَبْنَا فَوَجَدْنَا غَرَّةَ الْمُحَرَّم الوَسطيةِ عَامَّ وِلَادَتِهِ ﷺ يَوْمَ الْخَمِيْسِ فَكَانَتْ غَرَّةُ شَهْرًا لِوِلَادَةِ الْكَرِيْمَةِ الْوَسْطِيَّةِ يَوْمَ الْاَحَدِ وَالْهِلَالِيَّةُ يَوْمَ الْاِثْنَيْنِ فَكَانَ يَوْمَ الْاِثْنَيْنِ اَلثَّامِنُ مِنَ الشَّهْرِ وَلِذَا أَجْمَعَ عَلَيْهِ اَصْحَابُ الزِّيْجِ وَبِمُجَرَّدِ مُلَاحَظَةِ الْغَرَّةِ الْوَسْطِيَّةِ يَظْهَرُ اِسْتِحَالَةُ سَائِرِ الْاَقْوَالِ مَا خَلَا الطَّرْفَيْنِ وَالْعِلْمُ بِالْحَقِّ عِنْدَ مُقَلِّبٍ.

اگر چہ اکثر محدثین اور مؤرخین آٹھ تاریخ مانتے ہیں اور اُسی پر اہل ہیئت کا اجماع ہے اور اُسے ابنِ حزم اور حمیدی نے اختیار کیا، ابن عباس اور جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ پہلا قول صدر مغلطائی کا ہے اور اسی پر ذہبی نے تذہیب میں صاحبِ تہذیب مزی کی اتباع میں اعتماد کیا اور قولِ مشہور کو قیل سے نقل کیا۔ دمیاطی نے دس تاریخ کی تصحیح کی۔

اقول: میں نے حساب لگایا تو سنِ ولادت کے محرم کے غرہ وسطیہ کو پنج شنبہ کے دن پایا، تو ماہِ ولادتِ مبارکہ کا غرہ وسطیہ یک شنبہ کو ہوا اور ہلالیہ دوشنبہ کو۔ پس دوشنبہ کو آٹھ ربیع الاول ہوئی، اِسی وجہ سے اِس پر اہل ہیئت نے اجماع کیا، محض غرۂ وسطیہ کے دیکھنے سے تمام اقوال کا محال ہونا ظاہر ہو جائے گا۔ علاوہ قولِ اول و آخر کے (یعنی دو اور بائیس کے) اور حقیقی علم شب و روز بدلنے والے کو ہے۔'

اور شک نہیں کہ تلقیِ امت بالقبول کے لیے شان عظیم ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

اَلْفِطْرُ يَوْمَ يُفْطِرُ النَّاسُ وَالْاَضْحٰى يَوْمَ يُضَحِّي النَّاسُ، رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ عَنْ اُمِّ الْمُؤْمِنِيْنَ عَائِشَةَ الصِّدِّيْقَةَ بِسَنَدٍ صَحِيْحٍ.

عید الفطر اس دن ہے جس دن لوگ عید کریں اور عید الاضحیٰ اس روز ہے جس روز لوگ عید سمجھیں۔

اور فرماتے ہیں صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم:

فِطْرُكُمْ يَوْمَ تَفْطُرُوْنَ وَاَضْحَاكُمْ يَوْمَ يَضْحُوْنَ (رواه ابو داؤد البهيقي في السنن عن ابي هريرة رضي الله عنه بسند صحيح رواه الترمذي) وَحَسَّنَهُ فَزَادَ فِي الصَّوْمِ يَوْمَ تَصُوْمُوْنَ وَالْفِطْرَ يَوْمَ يَفْطُرُوْنَ وَاَرْسَلَهُ الشَّافِعِي فِي مُسْنَدِهِ وَالْبَيْهَقِي فِي سُنَنِهِ عَنْ عَطَاءٍ فَزَادَ فِي آخرِهِ عَرْفَةٌ يَوْمَ تَعْرِفُوْنَ وَاِنْ لَمْ يُصَادِفُ الْوَاقِعَ وَنَظِيْرُهُ التَّحَرِّيْ.

مسلمانوں کا روزہ عید الفطر اور عید الاضحیٰ اور عرفہ سب اس دن ہے، جس دن جمہور مسلمین خیال کریں، یعنی اگرچہ (کسی وجہ سے، مثلاً رویت نہ ہونے کی وجہ سے) واقع کے مطابق نہ ہو اور اس کی نظیر تحری کا قبلہ ہونا ہے۔

لا جرم عیدِ میلادِ والا بھی کہ عیدِ اکبر ہے، قول و عمل جمہور مسلمین کے مطابق بہتر ہے۔ ولادتِ پاک باعتبار عیسوی ۲۰/اپریل ۵۷۱ء اور باعتبار بکرمی یکم جیٹھ ۶۲۸/تھی، فارسی کا مہینہ نیسان تھا، اس کی تاریخ بھی ۲۰/تھی۔ آفتاب اس وقت برج حمل سے ۳۱/درجے دقیقے پر تھا۔ اُس دن صبحِ صادق کا طلوعِ افق مکۂ معظّمہ پر دھوپ گھڑی سے چار بج کر بیس منٹ پر اور عرب کے مروجہ حال ٹائم سے ۹/بج کر ۵۷/منٹ پر ہوا تھا۔ ''غفر'' منازل قمر میں تین چھوٹے چھوٹے ستارے ہیں، اس کے طلوع کے وقت ولادت ہوئی۔ یہی تمام انبیا کی ولادت کا وقت ہے۔

❁❁❁

رضاعت

آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سب سے پہلے ثُوَیبہ ابولہب کی باندی نے دودھ پلایا۔ ثویبہ ولادتِ پاک کی بشارت لے کر ابولہب کے پاس گئی اور بتایا کہ آپ کے مرحوم بھائی عبداللہ کے گھر ایک نونہال تشریف لائے ہیں، اس پر خوش ہو کر ابولہب نے ثویبہ کو آزاد کر دیا اور حکم دیا کہ جاؤ انھیں دودھ پلاؤ۔

حدیث پاک میں ہے کہ ولادت پاک کی مسرت میں باندی آزاد کرنے کے صلے میں عذاب شدید میں مبتلا ہونے کے باوجود ہر دوشنبہ کو ابولہب پر عذاب میں کچھ تخفیف ہو جاتی ہے اور کلمے کی انگلی اور انگوٹھے کے درمیانی گھائی سے پانی مل جاتا ہے۔ اِسی موقع پر حضرتِ شیخ نے مدارج النبوۃ میں فرمایا ہے:

دریں جا سند است اہل موالید را کہ در شبِ میلاد آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سرور کنند و بذلِ اموال نمایند۔ یعنی ابولہب کہ کافر بود و قرآن در مذمت او نازل شدہ، چوں بسرور بمیلاد آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و بذلِ شیر جاریہ او بجہت آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جزا دادہ شد، تا حال مسلماں کہ مملو ست بہ محبت سرور و بذل مال در طریق وی چہ او باشد۔

(ج:۲،ص:۲۶)

اس جگہ میلاد کرنے والوں کے لیے سند ہے کہ یہ لوگ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شبِ ولادت میں خوشی مناتے ہیں، مال خرچ کرتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ جب ابولہب کو- جو کافر تھا اور قرآن اس کی مذمت میں نازل ہوا- آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیدائش پر خوش ہونے اور باندی کا دودھ خرچ کرنے پر جزا دی گئی تو اُس مسلمان کا کیا حال ہوگا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت میں سرشار ہو کر خوشی منائے اور مال خرچ کرے۔

نہ صرف شیخ بلکہ کثیر علماے اسلام مثلاً علامہ جزری، علامہ احمد خطیب قسطلانی، علامہ محمد بن عبدالباقی رحمہم اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً نے یہ مضمون اپنی اپنی تصانیف میں تحریر کیا ہے۔

اِسی ثوبیہ نے سید الشہداء حضرتِ امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کو بھی دودھ پلایا ہے، اسی رشتے سے حضرتِ حمزہ، آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رضاعی بھائی بھی ہوئے۔ ابن مندہ نے ثوبیہ کو صحابیات میں شمار کیا ہے۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کا بہت خیال رکھتے تھے، مدینے سے کپڑے اور دوسری چیزیں بھیجا کرتے تھے۔

ثوبیہ کے علاوہ سات دن تک آپ کی والدۂ ماجدہ نے آپ کو دودھ پلایا، پھر یہ سعادت حضرتِ حلیمہ کے نصیب میں آئی اور مدتِ رضاعت تک آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرتِ حلیمہ کا دودھ پیا۔ ان کے علاوہ اربابِ سیر نے اور بھی چند عورتوں کے نام گنائے ہیں جنھوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دودھ پلانے کی سعادت حاصل کی۔ ام ایمن، حضرتِ عبداللہ کی باندی اُمِ فروہ، حضرتِ حلیمہ کے علاوہ ایک اور عورت انھی کی ہم قبیلہ، بنی سلیم کی تین کنواری عورتیں۔

استیعاب میں ہے کہ آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، بنی سلیم کی تین کنواری عورتوں کے پاس سے گزرے، انھوں نے جوں ہی آپ کی پیار بھری طلعت زیبا دیکھی، فرطِ محبت میں اپنا پستان دہنِ اقدس میں ڈال دیا اور دودھ اتر آیا۔

بعض محدثین نے آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد مبارک:

''أَنَا ابْنُ الْعَوَاتِكِ مِنْ بَنِي سَلِيمٍ.''

کی یہی توجیہ کی ہے۔

اکثر اصحابِ سیر نے یہ لکھا ہے کہ سب سے پہلے آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آپ کی والدہ نے دودھ پلایا؛ لیکن حضرتِ شیخ نے تحریر فرمایا کہ سب سے پہلے یہ شرف ثوبیہ کو ملا۔

فرماتے ہیں:

''اول کسے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم را شیر داد ثوبیہ بود کنیزک ابولہب۔

سب سے پہلے جس نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دودھ پلایا، ثوبیہ ابولہب کی باندی تھی۔

درایتاً بھی یہی صحیح معلوم ہوتا ہے؛ کیوں کہ عادتاً زچہ کو خصوصاً پہلی ولادت کے موقع پر دوسرے تیسرے دن دودھ اترتا ہے اور اُس دوران بچے کو کسی دوسری عورت کے دودھ کی حاجت ہوتی ہے، اس لیے قرینِ قیاس یہی ہے کہ جب تک حضرتِ آمنہ کو دودھ نہ اترا ہو ثوبیہ نے

پلایا ہو، پھر اُس کے بعد حضرتِ آمنہ پلاتی رہیں۔

آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حلیمہ کی گود میں:

دیہات کی آب و ہوا بنسبت شہروں کے صاف اور عمدہ ہوتی ہے، اُس زمانے میں اہلِ بادیہ کی زبان بھی فصیح و بلیغ اور خالص ہوتی تھی۔ شہر کی زبان میں مختلف بلاد کے لوگوں کی آمد و رفت کی وجہ سے خلط ملط ہو جاتا تھا، اس لیے شرفاے عرب کا دستور تھا کہ بچوں کی پرورش بدوی قبائل میں کراتے تھے، چناں چہ بہت سے بدوی قبائل کا دستور تھا کہ وہ سال میں دو مرتبہ شہر آ کر بچوں کو لے جایا کرتے تھے، امسال بھی حسب دستور قبیلۂ بنی سعد بن بکر کی کچھ عورتیں، بچوں کے لیے مکہ آئیں، جن میں حضرتِ حلیمہ بھی تھیں، یہ قبیلہ فصاحت و بلاغت میں اور اُن کی بستی عمدہ آب و ہوا میں ممتاز تھا۔ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''میں تمام عرب سے زیادہ فصیح ہوں؛ کیوں کہ میں قریشی ہوں اور بنی سعد بن بکر میں پلا بڑھا ہوں۔''

حضرتِ حلیمہ کی ساتھ والیوں کو ماں باپ والے مال دار بچے مل گئے، آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یتیم ہونے کی وجہ سے کسی نے نہیں لیا۔ اِدھر مشیت ایزدی کہ حضرتِ حلیمہ کو بھی کوئی بچہ نہیں ملا، اُنھوں نے واپس آ کر اپنے شوہر 'حارث' سے مشورۃً پوچھا کہ خالی ہاتھ جانا بھی اچھا نہیں، اگر تم رائے دو تو اس یتیم کو لے لوں۔

حارث نے اجازت دے دی، یہ گئیں اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لے آئیں، حضرتِ آمنہ نے جب دیکھا کہ یہ دایہ بچے کے یتیم ہونے کی وجہ سے کچھ پژمردہ ہے تو دایہ کی تسلی کے لیے فرمایا:

يَا ظِئْرُ سَلِّيْ عَنِ ابْنِكِ سَيَكُوْنُ لَهُ شَانًا.

اے دایہ اطمینان رکھ، یہ بچہ بڑی شان والا ہوگا۔

برکات:

حضرتِ حلیمہ فرماتی ہیں:

''جب آں حضرت ﷺ کو لینے کے لیے حاضر ہوئی تو دیکھا کہ آپ سبز ریشمی بچھونے پر سفید اونی کپڑے میں چت لیٹے ہوئے سو رہے ہیں۔ بینی مبارک سے پیاری پیاری آواز آ رہی ہے۔ جمال پاک دیکھتے ہی وارفتہ ہوگئی، آہستگی سے قریب جا کر سینہ پر ہاتھ رکھا، آپ نے تبسم فرمایا اور آنکھیں کھول دی، میری طرف دیکھا، چشمِ مبارک سے ایک روشنی کی کرن نکل کر آسمان تک بلند ہوئی، میں بڑھ کر پیشانیِ اقدس چوم لی، گود میں لیا اور داہنا پستان منہ میں دیا، آپ نے اُس کا دودھ پی لیا، پھر بایاں دیا؛ مگر اُسے منہ نہیں لگایا، اخیر رضاعت تک یہی حال تھا، ہمیشہ ایک پستان کا دودھ پیتے اور دوسرے کا میرے بچے کے لیے چھوڑ دیتے۔''

کیا تاریخ عالم اس عدل کی نظیر پیش کر سکتی ہے۔

بھائیوں کے لیے ترکِ پستاں کریں　　دودھ پیتوں کی نصفت پہ لاکھوں سلام

نیز فرماتی ہیں:

''اُس سال قحط تھا، بارش نہیں ہوئی تھی، جس کی وجہ سے بڑی عُسرت تھی، خصوصیت سے ہم بہت پریشان تھے، فاقوں سے رات کو نیند نہیں آتی تھی، ہمارے پاس ایک دبلی پتلی گدھی اور ایک اونٹنی تھی جس کے تھن خشک تھے۔ جب میں آں حضرت ﷺ کو لے کر ڈیرے پر پہنچی تو یک بہ یک اونٹنی کا تھن چڑھ آیا۔ حارث گئے اور اُس کا دودھ دوہ لائے، ہم سب نے پیٹ بھر پیا اور پہلی مرتبہ زمانے کے بعد اُس رات چین کی نیند آئی، اِس پر حارث نے خوش ہو کر کہا:

اے حلیمہ یہ بچہ بڑی عظمت والا معلوم ہوتا ہے۔''

دستور تھا کہ دائیاں بچوں کو لے کر کچھ دن مکہ ٹھہرتیں، غالباً یہ اس لیے تھا کہ بچے اپنی اپنی دائیوں سے گھل مل جائیں، انھی دنوں حضرتِ حلیمہ نے ایک رات دیکھا کہ آں حضرت ﷺ کو ایک نور نے ڈھک لیا اور کوئی سرہانے کھڑا ہے، میں نے گھبرا کر اپنے شوہر کو جگایا، اُنھوں نے دیکھ کر کہا:

''اے حلیمہ! چپ رہ! اِس راز کو کسی سے مت کہنا، جس دن سے یہ بچہ پیدا ہوا ہے، احبار یہود کو کھانا پینا اچھا نہیں لگتا۔''

نیز فرماتی ہیں:

''واپس ہونے کے لیے جب آں حضرت ﷺ کو گود میں لے کر اونٹنی پر بیٹھی تو وہ فربہ وتوانا، چست وچوبند ہوگئی اور اتنی تیز رفتار کہ سب سواریوں سے آگے نکل گئی، کعبے کے قریب پہنچی تو سجدہ کیا، ساتھیوں نے اس تیزی اور قوت کو دیکھ کر حیرت سے پوچھا:

'حلیمہ یہ وہی ہے یا دوسری؟'

میں نے جواب دیا:

'ہے وہی مگر اس مبارک فرزند کی برکت ہے۔'

اس پر ساتھیوں نے کہا:

'اس کی شان بہت بڑی ہے۔'

قدرتِ خداوندی سے سواری کو گویائی ملی، وہ بولی:

'ہاں! بخدا میری شان بڑی ہے، میں مردہ تھی زندہ ہوگئی، میں دبلی تھی فربہ ہوگئی، اے زنانِ سعد! تعجب تم پر ہے، کس غفلت میں ہو؟ تمھیں پتا نہیں کہ مجھ پر کون سوار ہے؟ سنو! میرا سوار سید المرسلین، خیر الاولین والآخرین، حبیب رب العالمین ہے۔''

نیز فرماتی ہیں:

قحط سے سبزہ کہیں نام کو نہ تھا؛ لیکن ہم جس منزل پر پہنچتے سرسبز وشاداب ہوجاتی، جب گھر پہنچے تو بکریاں جنگل میں چرنے کے بعد شام کو واپس آئیں تو خوب آسودہ تھیں، اُن کے تھن دودھ سے بھرے تھے، کچھ ہی دنوں میں ہماری بکریاں خوب بحال ہوگئیں، خوب بچے دیے۔ پوری قوم کو حیرت تھی۔ اُنھوں نے اپنے چرواہوں سے کہا تم لوگ بھی اپنی بکریاں حلیمہ کی بکریوں کے ساتھ رکھو۔ اب پوری قوم ہماری بکریوں کے ساتھ اپنے ریوڑ رکھتی، نتیجہ یہ نکلا کہ اُن کے جانور بھی اُس درِّ یتیم کے فیض سے نہال ہوگئے۔

ایامِ شیر خواری کے عادات:

[حضرتِ حلیمہ] فرماتی ہیں:

''دودھ پینے کے بعد غیب سے خود بخود آں حضور ﷺ کا دہنِ اقدس صاف ہوجاتا۔ عام بچوں کی طرح اپنے کپڑوں میں پیشاب پاخانہ نہیں کرتے۔ ایک وقت معیّن تھا اسی

وقت قضاے حاجت فرماتے۔ اگر کبھی سترِ مبارک کھل جاتا تو مضطرب ہوکر ہاتھ پاؤں چلاتے، روتے، جب تک میں چھپا نہ دیتی، یا میں غفلت برتتی اور دیر ہوجاتی اور غیب سے خود بخود چھپا نہ دیا جاتا، چین نہ لیتے۔

جب ہاتھ پاؤں میں چلنے پھرنے کی قوت آئی کھیلنے کودنے کے دن آئے اور بچے کھیلتے کودتے؛ لیکن آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کبھی کھیل کود میں شریک نہیں ہوتے، دور سے کھڑے ہوکر انھیں دیکھتے، انھیں کھیلنے کودنے سے منع فرماتے، جب بچے اپنے شغل میں شریک ہونے کو کہتے تو فرماتے:

'میں دنیا میں کھیلنے کے لیے نہیں آیا ہوں۔'

رونے دھونے ضد وغیرہ کسی قسم کی بدخُلقی نہ تھی، نشوونُما غیر معمولی تھی، روزانہ آفتاب کے مانند ایک نور آکر آں حضور کو ڈھک لیتا اور کچھ دیر بعد غائب ہوجاتا، بلاناغہ روزانہ دو سفید پوش یا دو سفید مرغے آتے اور گریبان اقدس میں سما جاتے۔

جب بولنے کا سن آیا تو پہلا جملہ زبانِ اقدس پہ یہ جاری ہوا۔

اَللّٰہُ أَکْبَرُ اللّٰہُ أَکْبَرُ، اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ سُبْحَانَ اللّٰہِ بُکْرَۃً وَّ أَصِیْلًا.

اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے۔ سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام عالم کا پروردگار ہے۔ اللہ کے لیے صبح شام پاکی ہے۔

رات کو آہستہ آہستہ پڑھتے:

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ قُدُّوْسٌ نَامَتِ الْعُیُوْنُ، الرَّحْمٰنُ لَا تَأْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَ لَا نَوْمٌ.

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، ہر عیب سے منزّہ ہے۔ آنکھیں سوگئیں اور اسے اونگھ ہے نہ نیند۔

فرشتے گہوارۂ اقدس ہلاتے، چاند سے باتیں کرتے، جدھر اشارہ فرماتے اُدھر چاند جھک جاتا۔ قبیلے میں کوئی انسان یا جانور بیمار ہوتا تو لوگ آپ کا دستِ مبارک ماؤف جگہ رکھ دیتے اور تکلیف دور ہوجاتی۔''

حضرتِ حلیمہ کو آں حضور کا پاسِ ادب اتنا ملحوظ تھا کہ ایامِ رضاعت تک اپنے شوہر کو

قریب نہیں آنے دیا۔ گرمی اور دھوپ میں کہیں جانے نہیں دیتیں۔ ایک دن حضرتِ حلیمہ کی غفلت میں اپنی رضاعی بہن 'شیما' کے ساتھ باہر چلے گئے، حضرتِ حلیمہ نے جب گھر میں نہیں دیکھا تو بے چین ہوگئیں، تلاش میں نکلیں شیما کے ساتھ دیکھ کر شیما پر بہت خفا ہوئیں کہ دھوپ میں اِنھیں لیے کہاں پھر رہی ہے؟ شیما نے کہا: آپ اطمینان رکھیں دھوپ سے اِنھیں کوئی تکلیف نہیں پہنچ سکتی، ان کے سر پر ابر سایہ کیے رہتا ہے۔

حضور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی حضرتِ حلیمہ سے انتہائی محبت تھی۔ بعثت کے بعد ایک مرتبہ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئیں تو آں حضور'' میری ماں، میری ماں'' کہہ کر لپٹ گئے۔

حضرتِ حلیمہ اور اُن کے شوہر حارث بن عبد العزیٰ دونوں اسلام لائے۔ حضرتِ حلیمہ کے بارے میں ابنِ کثیر نے لکھا ہے کہ وہ قبلِ بعثت ہی انتقال کر گئیں تھیں؛ لیکن یہ صحیح نہیں۔ جمہورِ علماے سیر نے اِس کی تصریح کی ہے کہ وہ ایمان لائی تھیں۔

صدر مغلطائی نے اُن کے مسلمان ہونے پر ایک مستقل رسالہ لکھا ہے جس کا نام ''التحفة الجسيمة فی إثبات إسلام حليمة'' ہے۔

زمانۂ بعثت میں حضرتِ حارث مکہ آئے، قریش نے اُن سے شکایت کی کہ سنو تمھارا بیٹا کیا کہتا ہے، کہتا ہے:

''اللہ عزوجل موت کے بعد سب کو قبروں سے اٹھائے گا، نیکوکاروں کو انعام عطا فرمائے گا اور نافرمانوں کو سزا میں دے گا۔''

اُس نے ہم میں پھوٹ ڈال دی اور ہمارا شیرازہ درہم برہم کر دیا۔

حارث خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:

بیٹا لوگ شکایت کرتے ہیں کہ تم ایسا ایسا کہتے ہو، ارشاد فرمایا:

''وہ دن آنے دیجیے میں آپ کا ہاتھ پکڑ کر بتادوں گا کہ میں سچ کہتا تھا۔''

وہ ایمان لائے۔ ایمان لانے کے بعد کہا کرتے تھے:

''اس دن جب میرا بیٹا میرا ہاتھ پکڑے گا تو جنت میں داخل کیے بغیر نہیں چھوڑے گا۔''

حضرتِ حلیمہ کی چار اولادیں تھیں: عبد اللہ، شیما، یہ دونوں ایمان لائے اور حذیفہ، اُنیسہ

اِن کا حال معلوم نہیں۔ اِن میں شیما کو آں حضرت سے بہت محبت تھی، یہی آں حضور ﷺ کو کھلاتی بھی تھیں۔ ایک دفعہ آں حضور ﷺ نے اُن کی پیٹھ میں دانت کاٹ لیا تھا۔ غزوۂ ہوازن میں صحابہ کرام نے گرفتار کرنا چاہا تو فرمایا میں تمھارے نبی کی رضاعی بہن ہوں۔ لوگ سرکار کی خدمت میں لائے۔ انھوں نے یہی نشان دکھا کر اپنا تعارف کرایا۔

عبداللہ ہم عمر تھے آں حضور ﷺ کے ساتھ دودھ پیتے تھے۔

پہلی بار ایامِ رضاعت میں شرحِ صدر حضرتِ حلیمہ کے گھر قیام کے زمانے میں ہوا تھا۔ جس کی تفصیل معجزات کے بیان میں آئے گی۔ اجمالی بیان یہ ہے کہ ایک دن آں حضور نے حضرتِ حلیمہ سے کہا:

''مجھے بھی بھائیوں کے ساتھ جنگل جانے دو؛ تاکہ سیر بھی کروں اور بکریاں بھی چراؤں۔''

حضرتِ حلیمہ نے بالوں میں کنگھا کیا، سرمہ لگایا، کپڑا پہنایا، جزعِ یمانی کا ہار دفعِ نظرِ بد کے لیے گلے میں ڈالا؛ لیکن آپ نے اسے پھینک دیا اور فرمایا:

''میرا پروردگار میری حفاظت کے لیے کافی ہے۔''

آں حضور ﷺ بھائیوں کے ساتھ جنگل تشریف لے گئے۔ دوپہر کے وقت حضرتِ حلیمہ کا ایک لڑکا روتا چلّاتا یا اُمّاہُ یا اُمّاہُ کہتا ہوا آیا اور کہا: ''محمد کی خبر لو۔''

حضرتِ حلیمہ نے قصہ پوچھا تو اس نے بتایا:

''ہم سب اکٹھے تھے کہ ایک شخص آیا اور انھیں لے کر پہاڑ کی چوٹی پر گیا اور لٹا کر سینہ چاک کر دیا۔ اب آگے مجھے خبر نہیں کیا ہوا۔

یہ سن کر حضرتِ حلیمہ اور حارث دوڑے گئے دیکھا کہ آپ پہاڑ پر بیٹھے ہوئے آسمان کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ آں حضور نے انھیں گھبرایا ہوا دیکھ کر تبسم فرمایا۔ اُن دونوں نے بڑھ کر سر اور آنکھ کو بوسہ دیا، حال پوچھا، آں حضور نے سارا واقعہ بیان فرمایا۔

مکہ واپسی اور گمشدگی

شرحِ صدر کے واقعہ سے لوگ ڈر گئے، سب نے حضرتِ حلیمہ سے کہا: انھیں ان کی ماں اور دادا کے حوالے کر آؤ۔ حضرتِ حلیمہ نے بھی یہ رائے پسند کی اور آں حضور کو لے کر مکہ چلیں۔ جب قریب پہنچیں تو حضور کو تنہا بیٹھا کر قضاے حاجت کو گئیں، واپس آئیں تو حضور کا کہیں پتہ نہ تھا، بہت ڈھونڈا کہیں نہ ملے۔ نا امید ہو کر سر پیٹ پیٹ کر وَا مُحَمَّدَاہْ- وَاوَلَدَاہْ؛ کی فریاد بلند کرتیں۔ اچانک ایک مردِ پیر لاٹھی لیے آیا، حال پوچھا۔ حضرتِ حلیمہ نے اپنی مصیبت سُنائی، اس نے کہا: بڑے بُت ہبل کے پاس چلو وہ بتائے گا کہ وہ کہاں ہے۔ حضرتِ حلیمہ نے اس سے کہا کہ تیرا بُرا ہو، تجھے معلوم نہیں کہ اُن کی ولادت کی رات تمام بُت اوندھے گر پڑے تھے؛ لیکن بڈھا زبردستی انھیں ہبل کے پاس لے گیا۔ بُت پرستوں کی رسم کے مطابق اُس کے اردگرد پھرا، اور قصہ بیان کیا۔ ہبل اور تمام بُت منہ کے بل گر پڑے، اُن کے جوف سے آواز آئی:

''اے بڈھے یہاں سے دور ہو۔ اُن کا نام نامی ہمارے سامنے نہ لے۔ اُن کے دستِ باطل شکن سے تمام بُت اور بُت پرستوں کی ہلاکت ہے۔ ان کا رب ان کا محافظ ہے، انھیں ضائع نہیں ہونے دے گا۔

حضرتِ حلیمہ وہاں سے مایوس ہو کر حضرتِ عبدالمطلب کے پاس آئیں۔

عبدالمطلب، حلیمہ کو تنہا اور پریشان دیکھ کر کھٹکے، گھبرا کر پوچھا: تم اتنی پریشان کیوں ہو؟ محمد کہاں ہیں؟ حضرتِ حلیمہ نے سارا واقعہ سُنایا۔ یہ سُنتے ہی حضرتِ عبدالمطلب کوہِ صفا پر آئے اور یا آلِ غالب کہہ کر قریش کو پکارا، ایک آواز پر سارے قریش جمع ہو گئے۔ حضرتِ عبدالمطلب نے سب کو بتایا کہ میرالختِ جگر محمد غائب ہو گیا ہے۔ یہ سنتے ہی تمام قریش سوار ہو کر تلاش میں نکل پڑے۔ تمام پہاڑ، جنگل چھان مارا؛ لیکن آں حضور کہیں نہیں ملے، مایوس ہو کر حضرتِ عبدالمطلب مسجد حرام شریف میں گئے، بیت اللہ کا طواف کیا، دعا مانگی، ہاتفِ غیبی نے تسلی دی: تم لوگ پریشان نہ ہوں، محمد کا نگہبان قادرِ قیوم ہے، وہ ضائع نہ ہوں گے۔ حضرتِ عبدالمطلب کی ڈھارس بندھی، پوچھا آخر

وہ ہیں کہاں؟ جواب ملا: وادیِ تہامہ میں ایک درخت کے نیچے۔ حضرتِ عبد المطلب وادیِ تہامہ گئے۔ راستے میں ورقہ بن نوفل بھی ساتھ ہو گئے۔ وادیِ تہامہ میں پہنچ کر دیکھا کہ ایک کھجور کے درخت کے نیچے ایک بچہ بیٹھا پتیّاں چُن رہا ہے۔ حضرتِ عبد المطلب نے قریب جا کر پوچھا تم کون ہو؟ آپ نے فرمایا: میں محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب ہوں۔ حضرتِ عبد المطلب نے اُٹھا کر سینے سے چمٹا لیا۔ اپنے ساتھ گھر لائے، زرِ نقد و جانور صدقہ کیے۔ حضرتِ حلیمہ کو بھی انعام و اکرام سے مالا مال کیا، حضرتِ حلیمہ آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو واپس کرنے کے لیے آئیں تو تھیں؛ لیکن جدائی شاق تھی۔ اِدھر حضرتِ آمنہ قرۃ العین کو آنکھوں سے اوراوجھل ہونا پسند نہیں کرتیں تھیں؛ لیکن قسمت میں حضرتِ حلیمہ کی یاوری کی، اس وقت مکے میں وبا تھی؛ اس لیے سب نے یہی مناسب جانا کہ کچھ دن بچہ اور بادیہ میں حضرتِ حلیمہ کے پاس رہے۔ یوں حضرتِ حلیمہ پھر اس دولتِ سرمدی سے مالا مال واپس ہوئیں۔ بعض مفسرین نے آیۂ کریمہ: ''**وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى**'' کی تفسیر اس واقعہ سے کی ہے۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرتِ حلیمہ کے پاس کم و بیش چھ برس رہے۔

والدۂ ماجدہ اور حضرتِ حلیمہ کے علاوہ آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت کا شرف حضرتِ امّ ایمن کو ملا۔ یہ حضرتِ عبد اللہ کی باندی تھیں۔ آں حضور کو میراث میں ملی تھیں۔ حضرتِ امِّ ایمن نے بھی حضور کی بڑی محبت کے ساتھ پرورش کی ہے۔ وہ فرماتی ہیں:

''میں نے دوسرے بچوں کی طرح کبھی بھوک پیاس کی شکایت کرتے ہوئے نہیں پایا۔ صبح کو زم زم پی لیتے اور شام تک کچھ نہ مانگتے۔ ایسا بارہا ہوا کہ چاشت کا کھانا پیش کیا جاتا تو فرماتے مجھے خواہش نہیں۔

مدینے کا سفر---والدۂ محترمہ کا انتقال

جب آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرتِ آمنہ کے پاس آ گئے اور وہ آپ کو لے کر آپ کے دادا حضرتِ عبد المطلب کے ننہال مدینہ طیبہ گئیں، ساتھ میں امّ ایمن بھی تھیں۔ بیٹے کو دادا کے ننہال لے جانے کے بہانے اصل میں اپنے مرحوم سرتاج کے قبر پر حاضری مقصود تھی۔ وہاں بنی نجار میں دارِ نابغہ میں قیام کیا، ایک ماہ وہیں رہیں، واپسی میں 'مقامِ ابوا' میں بیمار ہوئیں اور فوت ہو گئیں۔ دفن بھی اُسی مقام پر کی گئیں۔

اسما بنت رہم کہتی ہیں کہ آمنہ کی بیماری میں مَیں ان کے پاس گئی تھی، آں حضور ﷺ اس وقت (اندازاً) پانچ سال کے بچے تھے، بیمار ماں کے سرہانے موجود تھے۔

آں حضور ﷺ کو اُن دنوں کی بہت سی باتیں یاد تھیں۔ ہجرت کے بعد ایک مرتبہ بنی عدی کے محلے سے گزرے تو اپنی جائے قیام پہچان کے فرمایا کہ اس گھر میں میری والدہ ٹھہری تھیں، اس جگہ بیٹھتی تھیں، اس تالاب میں مَیں نے تیرنا سیکھا تھا۔ اِسی میدان میں اُنیسہ کے ساتھ کھیلا کرتا تھا، اس قلعے پر پرندے آکر بیٹھتے تھے اور بچے اڑا دیا کرتے، یہودیوں نے مجھے دیکھ کر کہا تھا کہ آمنہ کا بیٹا پیغمبر ہے اور یہ اس کا دارالہجرت ہے۔

عبدالمطلب کی کفالت:

والدۂ محترمہ کے انتقال کے بعد امِّ ایمن آں حضور ﷺ کو لے کر مکہ آئیں، حضرتِ عبدالمطلب خود بھی یتیم رہ چکے تھے، سینے میں دردآشنا دل رکھتے تھے۔ انھوں نے آں حضور کی جس ناز برداری کے ساتھ پرورش کی حضرتِ عبداللہ بھی ہوتے تو شاید اس سے زیادہ نہ کر سکتے، اپنے تمام بچوں سے زیادہ پیار کرتے، خلوت میں ساتھ رکھتے تھے۔ بغیر آں حضور کے کھانا نہیں کھاتے اور آں حضور ﷺ بھی بہت زیادہ گھل مل گئے تھے۔ اُن کے برابر مسند پر بیٹھتے۔ اگر کوئی روکتا تو حضرتِ عبدالمطلب جواب دیتے:

''میرے بیٹے کو میری مسند پر بیٹھنے دو، اس سے اسے احساسِ بزرگی ہوگا، مجھے امید ہے کہ میرا بیٹا شرف و بزرگی کی اُس منزل پر پہنچے گا کہ نہ پہلے کوئی پہنچا ہے اور نہ آئندہ پہنچے گا۔''

اہلِ قیافہ حضرتِ عبدالمطلب کو تاکید کرتے کہ اِس بچے کی پوری نگہ داشت کرنا۔ مقامِ ابراہیم میں جو نشانِ قدم ہے، اُس کے ساتھ اِس بچے کے قدم سے زیادہ کسی دوسرے قدم کو مشابہت نہیں۔

اسی سال حضرت عبدالمطلب رؤسائے قریش کے ساتھ سیف بن ذی یزن کی تہنیت کے لیے یمن گئے، اُس نے انھیں بشارت دی کہ تمھاری نسل سے پیغمبرِ آخرالزماں ہوں گے۔

دفعِ قحط:

مکے میں ادھر کئی سال سے قحط تھا، اُس سال اور سخت قحط پڑا۔ حضرتِ عبدالمطلب غیبی اشارے سے آں حضور کو لے کر کوہِ ابوقبیس پر گئے اور حضور کو کاندھے پر اٹھا کر دعا کی، اتنی کثیر بارش ہوئی کہ تلافیِ مافات ہوگئی۔

عبدالمطلب کی وفات:

آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کچھ ہی دن دادا کے پاس رہے تھے کہ ان کا بھی انتقال ہوگیا۔ اُس وقت حضور کی عمر مبارک تقریباً آٹھ سال کی تھی۔ اور حضرتِ عبدالمطلب کی بیاسی سال کی۔ حضرتِ عبدالمطلب حجون میں دفن کیے گئے۔ جنازے کے ساتھ آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی تھے۔ جدائی کے غم سے روتے جاتے تھے۔

حضرتِ عبدالمطلب کی وفات کے بعد آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پرورش ابوطالب نے اپنے ذمے لے لی اور یہاں سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ کا دوسرا دور شروع ہوا۔ دورِ ثانی کی تفصیلات سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حضرتِ آدم صفی اللہ علیہ السلام سے لے کر جنابِ عبد اللہ تک تمام آبائے کرام و اُمّہاتِ عظام کی مذہبی حالت کا سرسری جائزہ پیش کر دیا جائے: تاکہ ناظرین کے ایمان میں مزید تنویر پیدا ہو۔

❁❁❁

آبائے کرام کا اسلام

لَمْ اَزَلْ اَنْتَقِلُ مِنْ اَصْلَابِ الطَّاهِرِيْنَ اِلٰى اَرْحَامِ الطَّاهِرَاتِ.

میں ہمیشہ پاک پشتوں سے پاک شکموں کی طرف منتقل ہوتا رہا۔

اس پر تمام اُمت کا اتفاق ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آبائے کرام و اُمّہاتِ عظام بے حیائی اور بدکاری سے ہمیشہ محفوظ رہے۔ خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

خَرَجْتُ مِنْ نِّكَاحٍ لَا سِفَاحٍ.

میرا ظہور نکاح ہی کے ذریعہ ہوا، زنا سے نہیں۔

اِسی طرح سرکار کے آبا و اُمہات کفر و شرک کی گندگیوں میں کبھی ملوث نہ ہوئے۔ یہی صحیح و مختار ہے۔ علامہ جلال الدین سیوطی قدس سرہٗ وغیرہ نے اس پر جو دلائل قائم کیے ہیں ان کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے:

(۱) ابو نعیم نے حضرتِ عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کی، رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

لَمْ اَزَلْ اَنْتَقِلُ مِنْ اَصْلَابِ الطَّاهِرِيْنَ اِلٰى اَرْحَامِ الطَّاهِرَاتِ.

میں ہمیشہ پاک پشتوں سے پاک شکموں کی طرف منتقل ہوتا رہا ہوں۔

ارشادِ ربانی ہے:

اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ.

بیشک مشرکین ناپاک ہیں۔

نجاست و طہارت دو متضاد چیزیں ہیں، ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ جب کہ حسبِ فرمانِ حدیث آبائے کرام و اُمہات عظام طاہر تھے۔ تو لازم ہوا کہ کفر و شرک کی گندگی سے آلودہ نہیں ہوئے۔

(۲) بخاری میں ہے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

بُعِثْتُ مِنْ قُرُوْنِ بَنِی آدَمَ قَرْنًا فَقَرْنًا ، حَتّٰی بُعِثْتُ مِنَ الْقَرْنِ الَّذِیْ کُنْتُ فِیْہِ. (بخاری، ج:۱،ص:۵۰۳)

میں بنی آدم کے بہترین قرون میں مبعوث ہوا، یہاں تک کہ اس قرن میں تشریف لایا۔

اِس سے معلوم ہوا کہ حضور کے اجداد میں ہر جَد اپنے زمانے کے افضل ترین گروہ میں سے ہوا کرتا تھا۔

دوسری حدیث ہے:

لَمْ یَزَلْ عَلٰی وَجْہِ الدَّھْرِ سَبْعَۃٌ مُسْلِمُوْنَ فَصَاعِدًا فَلَوْلَا ذَالِكَ ھَلَکَتِ الْاَرْضُ وَمَنْ عَلَیْھَا.

زمین پر ہمیشہ سات یا سات سے زیادہ مسلمان رہے، ورنہ زمین اور زمین والے بچتے نہیں۔

اِس حدیث کو عبدالرزاق اور ابن منذر نے علیٰ شرط الشیخین حضرتِ علی سے روایت کیا ہے۔اس کے ہم معنیٰ امام احمد-علی شرط الشیخین -ابنِ عباس سے یوں راوی ہیں۔

مَا خَلَتِ الْاَرْضُ مِنْ بَعْدِ نُوْحٍ مِنْ سَبْعَۃٍ یَدْفَعُ اللّٰہُ بِھِمْ عَنْ اَھْلِ الْاَرْضِ.

حضرتِ نوح کے بعد زمین سات (ایسے نفوسِ قدسیہ) سے خالی نہیں ہوئی جن کے صدقے میں زمین والے محفوظ رہے۔

اِن ہر دو حدیث سے معلوم ہوا کہ حضرتِ نوح علیہ السلام کے بعد سے عہدِ بعثت تک کم از کم زمین پر سات مسلمان ضرور رہے۔کافر و مسلم میں ظاہر ہے کہ فضیلت مسلم ہی کو حاصل ہے، تو جب کہ حضور کے آبا و اجداد اپنے زمانہ کے بہترین گروہ میں سے ہوا کرتے تھے تو لازم ہے کہ وہ مسلمان رہے ہوں، ورنہ بہترین گروہ نہ ہوں گے۔

(۳) ابنِ عباس فرماتے ہیں:

''حضرتِ آدم سے حضرتِ نوح علیہ السلام تک دس پیڑھیاں ہیں اور سب شریعتِ حقہ کے پابند تھے۔''

اسے ابنِ جریر، ابنِ ابو حاتم، ابنِ منذر، بزار اور حاکم نے روایت کیا ہے۔ حاکم نے اسے صحیح کہا ہے۔

ابن سعد کی روایت میں یہ ہے:

''حضرتِ نوح یک تمام آبائے کرام اسلام پر تھے۔''

رہ گیا حضرتِ نوح کے بعد تو حضرتِ نوح کے صاحب زادے حضرتِ سام کا مومن ہونا بالاجماع ہے اور بعض آثار میں اُن کا نبی ہونا مُصرّح ہے۔ حضرتِ سام کے صاحب زادے ارفخشد کے بارے میں ابنِ عباس نے مومن ہونے کی تصریح کی ہے۔

اس کے علاوہ ابنِ سعد نے روایت کی ہے کہ حضرتِ نوح سے لے کر نمرود کے قبل تک اہلِ بابِل مسلم تھے، نمرود نے انھیں گمراہ کر کے بتوں کی پرستش میں پھنسایا۔ نمرود ہی کا معاصر مشہور بُت تراش آزر ہوا ہے، جس کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ حضرتِ ابراہیم کا باپ تھا۔ جیسا کہ خود کلام پاک میں اسے حضرتِ ابراہیم کا ''اَب'' کہا گیا ہے جس کا ترجمہ باپ ہے؛ لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ حضرتِ ابراہیم کا باپ نہیں چچا تھا اور اہلِ عرب چچا کو بھی ''اب'' کہتے ہیں۔

یہ محاورہ خود کلامِ پاک میں بھی ہے، ارشادِ ربانی:

﴿اَمۡ كُنۡتُمۡ شُهَدَآءَ إِذۡ حَضَرَ يَعۡقُوبَ الۡمَوۡتُ اِذۡ قَالَ لِبَنِيۡهِ مَا تَعۡبُدُونَ مِنۡ بَعۡدِیۡ، قَالُوۡا نَعۡبُدُ إِلٰهَكَ وَ إِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبۡرٰهٖمَ وَ اِسۡمٰعِيۡلَ وَ اِسۡحٰقَ۔﴾

جب یعقوب رحلت فرمانے لگے، تو کیا تم لوگ وہاں موجود تھے؟ جب کہ انھوں نے اپنے بیٹوں سے پوچھا تھا کہ میرے بعد کسے پوجو گے؟ تو انھوں نے کہا کہ ہم آپ کے آبا و اجداد ابراہیم و اسماعیل و اسحاق کے معبود کو پوجیں گے۔ (سورۂ بقرہ: ۱۳۳)

حضرتِ اسماعیل بنی اسرائیل کے چچا ہیں، پھر بھی آبا میں انھیں داخل کیا گیا۔ اِسی طرح آزر پر جو حقیقت میں حضرتِ ابراہیم کا چچا ہے۔ 'اَب' کا اطلاق کر دیا گیا ہے۔

زرقانی میں ہے:

''شہاب ہیتمی نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ اہلِ کتاب اور تاریخ کا اس بات پر

اجماع ہے کہ آزر حضرتِ ابراہیم کا باپ نہیں چچا تھا۔‘‘

اسی میں ’’الدرج المنیفة‘‘ سے نقل کیا:

’’حضرتِ ابنِ عباس، مجاہد، ابنِ جریج اور سدی نے کہا ہے کہ آزر حضرتِ ابراہیم کا باپ نہیں تھا، ان کے باپ کا نام تارخ تھا۔‘‘

اُسی میں یہ بھی ہے:

’’ابنِ منذر کی تاریخ میں ایک اثر میں اِس کی تصریح کی ہے کہ آزر حضرتِ ابراہیم کا چچا تھا، اگر آزر حضرتِ ابراہیم کا باپ ہوتا تو حضرتِ ابراہیم تک شجرۂ پاک میں ایک ہی کافر ہوتا۔‘‘

اب جب کہ ائمۂ مفسرین کے اقوال اور تاریخ کی تصریحات سے ثابت ہو گیا کہ آزر حضرتِ ابراہیم کا باپ نہیں چچا تھا؛ تو واضح ہو گیا کہ شجرۂ پاک حضرتِ ابراہیم تک کفر سے محفوظ ہے۔

رہ گیا حضرتِ ابراہیم کے بعد؛ تو نصوصِ قرآنیہ سے ثابت ہے کہ وادیِ غیر ذی زرع میں بسنے والی ذرّیت ابراہیم میں ایک گروہ ہمیشہ توحید پر قائم رہا۔

ارشاد ہے:

﴿اِذ قَالَ اِبْرَاهِیْمُ لِأَبِیْهِ وَ قَوْمِهٖ اِنَّنِیْ بَرَاءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ إِلاَّ الَّذِیْ فَطَرَنِیْ فَإِنَّهٗ سَیَهْدِیْنِ وَ جَعَلَهَا كَلِمَةً بَاقِیَةً فِیْ عَقِبِهٖ.﴾

یاد کرو جب حضرتِ ابراہیم نے اپنے چچا اور قوم سے کہا تھا: جنھیں تم پوجتے ہو، اُن سے مَیں بیزار ہوں سوائے اُس ذات کے جس نے مجھے پیدا کیا، وہ یقیناً مجھے راستے پر قائم رکھے گا۔ اللہ نے ابراہیم کے بعد اسے کلمۂ باقیہ کر دیا۔ (سورۂ زخرف:۲۶)

خاتم المفسرین حضرتِ عبداللہ بن عباس اور مجاہد سے مروی ہے:

إِنَّهَا لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ بَاقِیَةٌ فِیْ عَقْبِ إِبْرَاهِیْمَ.

حضرتِ ابراہیم کے بعد باقی رہنے والا کلمہ ’’لا الٰہ الا اللہ‘‘ ہے۔

حضرتِ قتادہ سے منقول ہے:

شَهَادَةُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَ التَّوْحِیْدِ لَا یَزَالُ فِیْ ذُرِّیَّتِهٖ مَنْ یَّقُوْمُهَا مِنْ

بعد.

لا الٰہ الا اللہ کی شہادت اور توحید کا قائل حضرتِ ابراہیم کی ذریت میں اُن کے بعد ہمیشہ رہے گا۔

دوسری آیت، خاص مکہ کے بارے میں، یوں ہے:

﴿اِذْ قَالَ اِبْرَاهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّ اجْنُبْنِيْ اَنْ نَّعْبُدَ الْأَصْنَامَ.﴾

یاد کرو جب کہ ابراہیم نے کہا تھا: اے پروردگار اِس شہر کو امن والا بنا، مجھے اور میری اولاد کو بُتوں کی پرستش سے بچا۔ (سورۂ ابراہیم: ۳۵)

اسی سلسلۂ دعا میں آگے چل کے ہے:

﴿رَبَّنَا اِنِّيْ أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ، رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ.﴾

اے رب میں نے اپنی کچھ ذریت ناقابلِ کاشت میدان میں تیرے حرمت والے گھر کے پاس بسائی ہے، اے رب اِس لیے کہ یہ لوگ نماز ادا کریں۔ (سورۂ ابراہیم: ۳۷)

اِس کے آگے ہے:

﴿رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ.﴾

اے رب مجھے اور میری ذریت کے کچھ لوگوں کو پابندِ نماز رکھنا۔ (سورۂ ابراہیم: ۴۰)

ابنِ منذر نے ابنِ جریج سے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے:

فَلَنْ تَزَالَ مِنْ ذُرِّيَّةِ اِبْرَاهِيْمَ نَاسٌ عَلَى الْفِطْرَةِ يَعْبُدُوْنَ اللهَ.

پس اولادِ ابراہیم سے کچھ لوگ ہمیشہ فطرت پر قائم رہ کر اللہ کی پرستش کرتے رہیں گے۔

پہلی آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ عزوجل نے اولادِ ابراہیم میں کلمۂ توحید باقی رکھا، اس میں احتمال تھا کہ ہوسکتا ہے یہ خصوصیت اولادِ اسحاق میں چلی گئی ہو؛ لیکن بعد والی آیت نے بالکل واضح کر دیا کہ نماز کی پابندی اور بتوں سے اجتناب کی دعا خاص باشندگانِ مکہ کے لیے ہے۔ اگر حضرتِ ابراہیم جیسے اوالعزم نبی کی یہ دعائیں مقبول ہوئیں، تو ہر شخص کو یہ ماننا پڑے گا کہ بنی

اسماعیل میں کچھ افراد ایسے ضرور ہوئے جو ملتِ حنفیہ کے پابند رہے اور جن کا دامن شرک کی آلودگی سے بچا رہا۔ ظاہر ہے کہ خانوادۂ اسماعیل میں بانیِ اسلام کے آباواجداد سے زیادہ کوئی متبعِ ابراہیم نہیں ہوا۔

اِس قیاس سے قطعِ نظر کرتے ہوئے مؤرخین ومحدثین کی تصریحات سے پتہ چلتا ہے کہ بنی اسماعیل ہی نہیں؛ بلکہ تمام عرب عہدِ ابراہیم سے ملتِ ابراہیم کے پابند رہے اور اُن میں سے کسی ایک نے بھی کفر کا ارتکاب نہیں کیا؛ یہاں تک کہ عمرو بن لحی نے بت پرستی پھیلائی۔ عمرو بن لحی کے معاصر اجدادِ کرام میں سے کنانہ تھے۔ اِس سے ثابت ہو گیا کہ حضرتِ ابراہیم سے کنانہ تک تمام آبائے کرام، مسلمان تھے۔ رہ گیا کنانہ کے بعد، تو اُن میں سے مرّہ تک کا اسلام تواریخ سے ثابت ہے۔ مرّہ کے بعد عبدالمطلب تک چار پیڑھیاں ایسی ہیں جن کے بارے میں اسلام کی تصریح ہے نہ کفر کی۔ دلیلِ اوّل ودوم کے کلیہ سے یہی متبادر ہے کہ یہ بھی مسلمان ہی ہوں گے اور اِسی کلیہ سے حضرتِ عبدالمطلب وحضرتِ عبداللہ کا مسلمان ہونا بھی ثابت ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں ان دونوں حضرات کے بارے میں بہت سے علمائے سِیَر نے تصریح کی ہے کہ یہ موحد تھے۔

(۴) ارشادِ خداوندی ہے:

﴿وَهُوَ الَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ.﴾

اللہ وہی ہے جو آپ کی شب زندہ داری کو اور ساجدین میں منتقل ہونے کو دیکھتا ہے۔

(سورۂ شعرا: ۲۱۸۔۲۱۹)

اِس آیت میں تصریح ہے کہ نورِ محمدی ساجدین سے ساجدین میں منتقل ہوتا رہا، یہ ساجدین مومنین کے علاوہ اور کون ہو سکتے ہیں؟

خاتم المفسرین حضرتِ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اِس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

مِنْ نَبِيٍّ إِلٰى نَبِيٍّ وَمِنْ نَبِيٍّ إِلٰى نَبِيٍّ.

ایک نبی سے دوسرے نبی تک اور ایک نبی سے دوسرے نبی تک۔

چوں کہ اجدادِ کرام میں انبیا علیہم السلام کی تعداد جو یقینی طور پر معلوم ہے وہ صرف چھ

ہیں۔حضرتِ اسماعیل، حضرتِ ابراہیم، حضرتِ نوح، حضرتِ ادریس، حضرتِ شیث، حضرتِ آدم؛ اس لیے کہ اِن کی توجیہ میں علامہ جلال الدین سیوطی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

مَحَلُّ الْآيَةِ عَلٰى أَعَمِّ مِنْهُمْ وَ هُمُ الْمُصَلُّوْنَ الَّذِيْنَ لَمْ يَزَالُوْا فِيْ ذُرِّيَةِ إِبْرَاهِيْمَ أَوْضَحُ.

اس آیت کے لفظ ساجدین کو انبیا سے اعم معنیٰ پر محمول کرنا زیادہ واضح ہے یعنی وہ پابند صلاۃ تھے جو اولادِ ابراہیم میں ہمیشہ رہے۔

اِس استدلال پر بعض حضرات نے یہ اعتراض کیا ہے کہ تفسیرِ بیضاوی میں ہے کہ اِس آیت میں 'تقلب' سے رات کو گشت کرنا اور ساجدین سے تہجد گزار حضرات مراد ہیں۔ معنی یہ ہوئے کہ اللہ وہی ہے جو آپ کے قیام کو بھی دیکھتا ہے اور رات کو اُٹھ کر صحابۂ کرام کے احوال کے تفحص کرنے کو بھی دیکھتا ہے؛ لہٰذا آبائے کرام کے مسلمان ہونے پر اِس آیت کی دلالت نہ رہی۔ اِس کے جواب میں علامہ زرقانی فرماتے ہیں:

وَهٰذَا التَّعَقُّبُ بَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ إِذْ لَيْسَ فِيْ كَلَامِ الْبَيْضَاوِيْ نَفْيٌ لِغَيْرِيْ مَا ذَكَرَهُ مِنَ التَّفْسِيْرِ وَلَا حِكَايَةَ إِجْمَاعٍ عَلَيْهِ بَلْ ذَكَرَ بَعْدَهُ تَفْسِيْرَ اٰخَرَانِ الْمُرَادَ بِهِمُ الْمُصَلُّوْنَ اَيْضًا لَمْ يَنْفِ غَيْرِ التَّفْسِيْرِ الَّذِيْ ذَكَرَهُ. بَلْ قَالَ اَقْصٰى مَافِي الْبَابِ حمل الْآيَةِ عَلٰى وُجُوْهٍ اُخْرٰى لَا مُنَافَاتَ بَيْنَهَا فَتَعَقُّبُهُ بِأَحَدِ تَفَاسِيْرِ اَعْتَرِفُ هُوَ بِهَا وَ اَشَارَ اِلَى الْجَمْعِ بَيْنَهَا مِمَّا لَا يَلِيْقُ تَسْطِيْرُهُ عَلٰى اَنَّ مَا فَسَّرَ بِهِ الرَّازِيْ هُوَ الْاَوْلٰى بِالْقَبُوْلِ.

(ج:۱،ص:۱۷۶)

یہ اعتراض مکڑی کا جالا ہے؛ کیوں کہ بیضاوی کی تفسیر میں اپنی ذکر کردہ تفسیر کے علاوہ دوسرے تفسیر کی نفی نہیں اور نہ اِس پر اجماع منقول ہے؛ بلکہ ایک اور تفسیر مذکور ہے کہ ساجدین سے مراد مصلی ہیں۔ اور امام رازی نے اپنی ذکر کردہ تفسیر میں علاوہ دوسری تفسیروں کی نفی نہیں کی؛ بلکہ انھوں نے کہا ہے کہ انتہائی بات یہ ہے کہ آیت کو چند اور وجہوں پر محمول کیا جا سکتا ہے، جن میں منافات نہیں۔ تو جس تفسیر کا انھوں نے خود اعتراف کیا اور اُس میں اور دوسری تفسیر میں تطبیق کی

جانب اشارہ بھی کیا، اُسے لے کر اعتراض کرنا لکھنے کے لائق نہیں۔ علاوہ ازیں امام رازی نے جو تفسیر کی ہے وہ قبول کرنے کے زیادہ لائق ہے۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ آیت میں دو احتمالات ہیں:

ایک تو تقلب سے مراد نور کا پُشت در پُشت منتقل ہونا اور ساجدین سے آبائے کرام مراد ہیں جو مومن اور موحد تھے۔

دوسرے یہ کہ تقلب سے رات کو حضور کا گشت کرنا اور ساجدین سے تہجد گزار مراد ہے۔

اور کسی آیت میں چند احتمالات پیدا ہو جانے سے کسی ایک احتمال کے لائق حجت ہونے پر کوئی حرف نہیں آتا۔ کیوں کہ علمائے تفسیر فرماتے ہیں:

اَلْقُرْاٰنُ ذُوْ وُجُوْهٍ وَهُوَ حُجَّةٌ بِكُلِّ وَجْهٍ مَالَمْ يَتَنَافِ.

قرآن مختلف معنی کا احتمال رکھتا ہے اور ہر معنی کے اعتبار سے حجت ہے، جب تک آپس میں منافات نہ ہو۔

یہاں یہ دونوں احتمالات آپس میں منافی نہیں ہیں؛ لہٰذا اپنے مطلوب کے اثبات کے لیے حجت ہے۔

(۵) ﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ.﴾ (سورۂ توبہ:۱۲۹)

میں حضرتِ انس رضی اللہ عنہ سے ایک قراءت ''اَنْفُسِكُمْ'' کے بجائے ''أَنْفَسِكُمْ'' مروی ہے، جس کا ترجمہ ہوا بے شک تمھارے پاس تمھارے نفیس ترین میں سے ایک رسول آیا۔

جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ حضور کا شجرۂ مبارکہ اہلِ عرب تمام شجروں سے نفیس ترین ہے اور یہ اُسی وقت درست ہوگا، جب کہ آں حضور کے اہلِ شجرہ مومن موحّد ہوں جیسا کہ گزر چکا۔

(۶) صحیح مسلم شریف میں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں:

اِنَّ اللهَ اصْطَفٰى كِنَانَةَ مِنْ اَوْلَادِ اِسْمٰعِيْلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَ اصْطَفٰى قُرَيْشًا مِنْ كِنَانَةَ وَاصْطَفٰى مِنْ قُرَيْشٍ بَنِي هَاشِمَ وَاصْطَفَانِيْ مِنْ بَنِي هَاشِمَ.

اللہ عزوجل نے اولادِ اسماعیل میں کنانہ کو چُنا، کنانہ میں قریش کو، قریش میں بنی ہاشم کو اور بنی ہاشم میں مجھے۔

اولادِ اسماعیل میں ایک گروہ کا ہمیشہ مسلمان رہنا ثابت ہو چکا، پس اگر اولادِ اسماعیل میں کنانہ کے سوا کوئی اور، کنانہ میں قریش کے علاوہ کوئی اور، قریش میں بنی ہاشم کے ماسوا کوئی اور مسلمان ہوتا تو یہ اصطفا بے معنی ہو کر رہ جاتا؛ اس لیے ماننا پڑے گا کہ بنی اسماعیل میں کنانہ اور کنانہ میں قریش اور قریش میں بنی ہاشم ہی حضرتِ ابراہیم کی توحید و تعلیم کے حقیقی وارث تھے اور یہ لوگ اِس متاعِ گراں بہا کی بدولت تمام عالم میں منتخب ہوئے۔

جب کہ روایت و درایت عقل و نقل اس کی مؤید ہیں کہ آبائے کرام موحّد و مومن تھے۔ تو اگرچہ بعض علما نے اِس باب میں اِس کا خلاف کیا ہے، پھر بھی ہم اِسی بات پر یقین کرنے پر مجبور ہیں کہ حق یہی ہے کہ نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس طرح بتصریح احادیثِ صحیحہ و اجماعِ علماے سیر و حدیث نجاستِ سفاح سے منزہ رہا، اُسی طرح کفر و شرک سے بھی مشکاۃِ نبوت ہمیشہ بے داغ رہا۔

تھوڑی دیر کے لیے اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ آبائے کرام میں چند نفوس وقت کی رَو میں بہ کر آلودۂ کفر ہو گئے تو بھی ادب و محبت کا تقاضا یہی ہے کہ ہم کفِ لسان کریں؛ کیوں کہ اولاد کے سامنے والدین کے عیوب و گناہ بیان کرنا باعثِ ایذا ضرور ہوتا ہے۔

خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اِس قسم کے طعن سے شدت کے ساتھ منع فرمایا ہے، چناں چہ زرقانی نے ابنِ منذر سے روایت کیا ہے:

''سبیعہ بنت ابولہب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور شکایت کیں کہ لوگ مجھے 'بنتِ حمالۃ الحطب' کہتے ہیں، حضور کو جلال آ گیا فرمایا:

مَا بَالُ أَقْوَامٍ يُؤْذُوْنَنِيْ فِيْ قَرَابَتِيْ وَمَنْ أٰذَانِيْ فَقَدْ أٰذَى اللهَ.

کیا بات ہے کہ کچھ لوگ رشتے کے معاملے میں مجھے ایذا دیتے ہیں، جس نے مجھے ایذا دی اس نے اللہ کو ایذا دی۔

اسی مقصدِ شریف کی ابحاثِ جلیلہ علامہ سیوطی کے رسائلِ ستّہ اور اعلیٰ حضرت مجدد اعظم قدس سرہٗ کے رسالہ 'شمول الاسلام' میں مطالعہ کریں۔

ابوطالب:

حضرتِ عبدالمطلب کے اگر چہ بارہ بیٹے تھے؛ لیکن انھوں نے حضور کی پرورش ابوطالب کے ذمے کی۔

(زرقانی،جلداول)

کیوں کہ یہ حضرتِ عبداللہ کے حقیقی بھائی تھے اور اُن دونوں میں کافی محبت تھی۔ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ عبدالمطلب نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اختیار دیا تھا کہ جس کے پاس جی چاہے رہیں۔حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوطالب ہی کو پسند فرمایا۔(مدارج جلد دوم)

حضرتِ عبدالمطلب کی طرح ابوطالب بھی آں حضور سے انتہائی محبت رکھتے تھے۔سفر و حضر میں ساتھ رکھتے۔ایک آن کے لیے بھی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیتے تھے۔ساتھ بٹھا کے کھلاتے پلاتے،ساتھ سلاتے۔گھر کے سب بچوں سے پہلے کھانا دیتے۔

امام واقدی نے ذکر فرمایا ہے:

اگر ابوطالب کے گھر والے بغیر آں حضور کے کھاتے تو آسودہ نہ ہوتے اور اگر آں حضور کے ساتھ کھاتے تو سیر ہوجاتے؛اسی لیے ابوطالب کا یہ طریقہ تھا کہ جب کھانا تیار ہوجاتا،اگر آں حضور تشریف فرما نہ ہوتے،تو بچوں کو نہ کھلاتے اور کہتے:رکو میرا بیٹا آجائے۔آں حضور کے کھانے میں شریک ہونے سے اتنی برکت ہوتی کہ گھر کے سب افراد شکم سیر ہوکر کھاتے،پھر بھی کھانا بچا رہتا۔ایک پیالہ دودھ ہوتا اگر حضور پہلے منہ لگا دیتے تو گھر بھر کو کافی ہوتا،اس اعجاز کو دیکھ کر ابو طالب کہا کرتے:

اِنَّكَ لَمُبَارَكٌ.تم برکت والے ہو۔

(زرقانی جلداول)

امام ابونعیم وغیرہ نے حضرتِ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کی ہے کہ ابو طالب کے اور بچے سوکر اٹھتے تو آنکھوں میں کیچڑ اور چندیا پن ہوتا،مگر آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ شگفتہ رو اُٹھتے،آنکھوں میں سرمہ اور بالوں میں تیل لگا ہوا نظر آتا۔ (زرقانی جلداول)

دفعِ قحط:

ابو طالب کے زمانے میں بھی مکہ میں ایک بار شدید قحط پڑا، استسقا کے لیے قریش ابوطالب کے پاس آئے، یہ آں حضور کو لے کر حرم شریف میں گئے اور آں حضور کی پشتِ مبارک کعبہ سے لگا کر کھڑا کر دیا، آں حضور نے اُنگلی سے آسمان کی طرف اشارہ فرمایا، آسمان بالکل صاف تھا، اشارہ کرتے ہی اَبر کے ٹکڑے ہر چہار جانب سے اُمنڈ آئے اور برسنے لگے، اتنی بارش ہوئی کہ ندی نالے بہ نکلے۔ شعب ابو طالب میں محصوری کے زمانہ میں اسی اعجاز کے جانب اشارہ کرتے ہوئے ابوطالب نے یہ قصیدہ کہا ہے۔

وَأَبْيَضُ يُسْتَسْقَى الْغَمَامُ بِوَجْهِهِ	ثِمَالُ الْيَتٰمٰى عِصْمَةٍ لِلْأَرَامِلِ
تَلُوْذُ بِهِ الْهُلَّاكُ مِنْ اٰلِ هَاشِمٍ	فَهُمْ عِنْدَهٗ فِيْ نِعْمَةٍ وَ فَوَاضِلَ

۞ گورے چہرے والے جن کے صدقے میں بارش ہوتی ہے، یتیموں کی جائے پناہ، بیوگان کی آڑ۔

۞ جن کے دامنِ کرم میں بنی ہاشم کے تباہ حال پناہ لیتے ہیں اور یہ اُن کی بارگاہ میں چین سے ہیں۔ (طبقات ابن سعد جلد اول)

گھریلو مصروفیات:

آں حضور جب کام کاج کے لائق ہو گئے، تو گھر کے کام میں ہاتھ بٹانے لگے، چناں چہ آپ نے بکریاں تک چرائیں۔ زمانۂ رسالت میں ایک بار صحابہ کے ساتھ ''مرالظہران'' میں تشریف لے گئے، وہیں کہیں پیلوں کا درخت تھا، پھل لگے تھے، لوگ توڑ توڑ کر کھانے لگے، آں حضور نے فرمایا:

جتنا زیادہ کالا ہوگا اتنا ہی زیادہ مزے دار ہوگا، یہ میں نے اُس وقت جانا جب میں یہاں بکریاں چراتا تھا۔

فرانس کے ایک نامور مؤرخ نے اس پر یہ جڑ دیا کہ ابوطالب چوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ذلیل جانتے تھے، اِس لیے اُن سے بکریاں چرانے کا کام لیتے تھے۔ (سیرت النبی، اول)

بکریاں چَرانے کو ذلیل سمجھنا، یوروپ کی ذلیل ذہنیت کی اُپج تو ہوسکتی ہے؛ لیکن ایک عالی دماغ انسان اِسے کبھی بھی ذلیل کام نہیں کہہ سکتا اور عرب میں خصوصاً اُس زمانے میں معززین و رؤسا کے بچے جانور چَرایا کرتے تھے، حضرتِ عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے زمانۂ خلافت میں اس کا اعتراف کیا ہے کہ بچپن میں میرے والد مجھ سے اونٹ چَرانے کا کام لیا کرتے تھے، واضح ہو کہ حضرتِ عمر کے باپ خطّاب صرف رؤسا قریش ہی میں سے نہ تھے؛ بلکہ عہدے داروں میں سے تھے۔ چُناں چہ عہدۂ سفارت اُن کے ذمے تھا، خطّاب حضرتِ عمر کے باپ تھے، اس لیے یہاں یہ وہم بھی نہیں ہوسکتا کہ حضرتِ عمر سے چَرواہی کا کام اِس وجہ سے لیتے تھے کہ انھیں ذلیل جانتے تھے۔

خود حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے دس سال تک حضرتِ شعیب علیہ الصلاۃ السلام کے مویشی چَرائے ہیں اور اپنی مرضی سے یہ کام قبول فرمایا تھا، اِس لیے یہاں کسی کے ذلیل سمجھنے کا سوال ہی نہیں۔

بات یہ ہے کہ انبیا علیہم السلام کے لیے قبلِ نبوت یہ مشغلہ لازم ہے، اس سے جفاکشی، خطرات سے مقابلے کی قوت اور تحمل وضبط کی طبیعت خوگر ہوجاتی ہے، جس سے تبلیغِ رسالت کے ایام میں قوم کے ردِعمل سے تأسف کم ہوتا ہے۔

بخاری میں ہے:

مَابَعَثَ اللّٰہُ نَبِیًّا اِلّا رَعَی الْغَنَمَ، فَقَالَ: أَصْحَابُہُ وَ أَنْتَ؟ فَقَالَ: نَعَمْ کُنْتُ أَرْعَاھَا عَلٰی قَرَارِیْطَ لِأَھْلِ مَکَّۃَ.

ہر نبی نے بکریاں چَرائی ہے۔ صحابہ نے پوچھا: آپ نے بھی؟ فرمایا: میں نے بھی قراریط پر اہلِ مکہ کی بکریاں چَرائی ہے۔

قراریط کے دو معنی ہیں:

ایک سونے اور چاندی کے ٹکڑے، اِس تقدیر پر یہ قیراط کی جمع ہے۔ بعض محدثین نے یہاں یہی معنیٰ مراد لیے ہیں۔

دوسرے ایک مقام کا نام ہے جو حوالیِ مکہ میں اجیاد کے قریب ہے۔

امام ابراہیم حربی نے فرمایا:

اِس حدیث میں قرار یط سے یہی جگہ مراد ہے۔ علامہ بدرالدین محمود عینی وغیرہ نے اسی کو راجح بتایا ہے۔ (عینی جلد ششم)

ملا علی قاری نے اسی پر جزم فرمایا۔ (شرح شِفا، ج:۲،ص:۴۴۸)

واقعات سیر کے استیعاب کے لیے علما نے اِسے ذکر فرمایا ہے، ورنہ ایسے اجتماعات میں جو عوام وخواص سب پر مشتمل ہوں، یہ اور اس قسم کی دیگر کوائف جنھیں سن کر ترحم تو پیدا ہو، مگر وہ کمالِ تعظیم میں کسی طرح مخل ہوں، بیان کرنے سے پرہیز لازم ہے۔

علامہ زرقانی فرماتے ہیں:

سُئِلَ الْحَافِظُ عَمَّا يَقَعُ مِنْ بَعْضِ الْوُعَّاظِ فِي الْمَوَالِيْدِ فِي مَجَالِسِهِمِ الْحَفْلَةِ الْمُشْتَمِلَةِ عَلَى الْخَاصِ وَ الْعَامِ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَاءِ مِنْ ذِكْرِ الْاَنْبِيَاءِ بِمَا يُخِلُّ بِكَمَالِ التَّعْظِيْمِ حَتّٰى يَظْهَرَ لِلسَّامِعِيْنَ لَهَا حُزْنٌ وَرِقَّةٌ فَيَبْقٰى فِيْ خَبَرٍ مَنْ يُرْحَمُ لَا مَنْ يُعَظَّمُ كَقَوْلِهِ لَمْ تَأْخُذْهُ الْمَرَاضِعُ لِعَدَمِ مَالِهِ اِلَّا حَلِيْمَةَ رَغَبَتْ فِيْ رِضَاعِهِ شَفَقَةً عَلَيْهِ وَ اَنَّهُ كَانَ يَرْعٰى غَنَمًا وَ كَثِيْرٌ مِنْ هٰذَا الْمَعْنٰى الْمُخِلِّ بِالتَّعْظِيْمِ فَاَجَابَ يَنْبَغِيْ اَنْ يُحْذَفَ مِنَ الْخَبَرِ مَا يُوْهِمُ فِي الْمُخْبِرِ عَنْهُ نَقْصًا.

حافظ (ابنِ حجر) سے سوال ہوا کہ بعض واعظین میلاد شریف کی اُن محفلوں میں جن میں عام وخاص مرد وعورت سبھی شریک ہوتے ہیں، انبیا علیہم السلام کے وہ احوال بیان کرتے ہیں جو کمالِ تعظیم میں مخل معلوم ہوتے ہیں، جسے سن کر سامعین پر اندوہ ورقت طاری ہوتی ہے، انبیاے کرام اِس زمرے میں معلوم ہوتے ہیں جن پر رحم کیا جائے اور نہ اُس گروہ میں جن کی تعظیم کیا جائے، جیسے اُن کا یہ کہنا:

آں حضور کو دودھ پلانے والیوں نے نہیں لیا اس وجہ سے کہ آں حضور کے پاس مال نہ تھا؛ مگر حلیمہ نے آں حضور پر شفقت کرتے ہوئے لے لیا۔

اور یہ کہنا کہ آں حضور بکریاں چَراتے تھے۔

اِس کے مثل اور دوسری باتیں جو تعظیم میں بظاہر مخل ہیں؟

تو اُنھوں نے جواب دیا کہ ایسی باتیں نہیں ذکر کرنی چاہیے جن سے تنقیص کا وہم پیدا ہو۔(ج:۱،ص:۱۴۳)

شام کا سفر اور بحیرا راہب سے ملاقات

قریش تجارت پیشہ تھے۔سال میں دو سفر کیا کرتے تھے جاڑوں میں یمن کا، گرمیوں کا شام کا، ابو طالب کا بھی یہی شغل تھا۔آں حضور کی عمرِ مبارک کا بارہواں سال تھا، ابو طالب مالِ تجارت لے کر شام کے ارادے سے نکلے، سفر کی صعوبتوں کی خیال سے آں حضور کو ساتھ لے جانا نہیں چاہتے تھے؛لیکن آں حضور جب کسی طرح سے بھی نہیں مانے تو ساتھ لے لیا۔

راستے میں شام کی سرحد پر ایک شہر بُصریٰ پڑتا تھا۔یہاں گرجا میں ایک راہب رہتا تھا، جس کا نام جرجیس تھا جو'بحیرا' کے ساتھ مشہور تھا۔یہ کتبِ سماویہ کا زبردست عالم اور صلاح وتقویٰ میں یگانہ تھا۔اُس نے کتبِ سابقہ میں پڑھا تھا کہ ایک دن خاتم النبیین اِس راستے سے گزریں گے۔

تجارت کے موسم میں جب قریش کا قافلہ گزرتا تو باہر آ کر دیکھتا اور مایوس ہو کر لوٹ جاتا۔امسال جب قافلہ اُس کے گرجا کے پاس پہنچا تو وہ حسبِ عادت قافلے میں آیا،لوگ ابھی محمل کھول رہے تھے۔وہ لوگوں کے درمیان ہوتا ہوا بڑھتا گیا اور آں حضور کا دستِ مبارک پکڑ کر کہا کہ یہ تمام عالَم کے سردار ہیں، اللہ عزوجل انھیں رحمۃ للعالمین بنا کر مبعوث کرے گا۔لوگوں نے پوچھا:تمھیں کیسے معلوم ہوا؟ اُس نے بتایا کہ جب تم لوگ گھاٹی سے نکلے تو انھیں تمام شجر وحجر نے سجدہ کیا،شجر وحجر سوائے نبی کے اور کسی انسان کو سجدہ نہیں کرتے، نیز میں اُن کو خاتمِ نبوت سے پہچانتا ہوں، جو سیب کے مثل شانوں کے نیچے ہے۔

پھر اس نے تمام اہلِ قافلہ کی دعوت کی، قافلے والے سب کے سب گئے؛لیکن آں حضور کو نہیں دیکھا تو آدمی بھیج کر بلوایا،حضور جب منزل سے چلے تو سرِ اقدس پر ابر سایہ کرتا ہوا ساتھ ساتھ آیا۔لوگ ایک سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھے تھے،آں حضور کے پہنچنے سے پہلے ہی تمام سایہ

دار جگہ بھر چکی تھی۔ آں حضور ایک طرف بیٹھ گئے، درخت کا سایہ بھی اُس طرف جھک گیا۔ بحیرا نے قریش سے کہا: دیکھو۔ ان تمام علامتوں کو دیکھ کر بحیرا ایمان لایا۔ (مدارج، ج:۲،ص:۳۵)

اس نے ابو طالب کو قسم دی کہ اِنھیں شام نہ لے جاؤ! اہلِ روم اِن کے دشمن ہیں، علامتوں سے پہچان کر اِنھیں مار ڈالیں گے۔ ابھی یہ بات چیت ہو رہی تھی کہ سات آدمی سامنے سے آئے۔ بحیرا ان کے پاس گیا، آنے کا سبب پوچھا؟ انھوں نے کہا:

ہمیں بتایا گیا ہے کہ نبی آخر الزماں اِس مہینے شام میں تشریف لائیں گے، تمام راستوں پر آدمی بھیج دیے گئے ہیں کہ اِنھیں جہاں پاؤ قتل کر ڈالو۔ ہمیں اِدھر اسی غرض سے بھیجا گیا ہے۔

بحیرا نے اُن سے کہا: مجھے بتاؤ اگر اللہ کسی کام کے کرنے کا فیصلہ کر لے گا تو اُسے کوئی روک سکتا ہے؟ وہ بولے: نہیں۔ اب بحیرا نے ان سے کہا: میری مانو! چلو اِن سے بیعت کر لو اور اِن کے ساتھ ہو جاؤ۔ پھر ابو طالب سے کہا کہ یہ بچہ خاتم النبیین ہے، اِس کا دین تمام دینوں کا خاتم ہے۔ یہود اِن کے دشمن ہیں، اِنھیں شام نہ لے جاؤ! بحیرا کے اصرار سے مجبور ہو کر ابو طالب نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مکہ واپس کر دیا۔ بحیرا نے توشہ کے لیے کیک اور روغن زیتون ساتھ کر دیا۔

(مدارج، ج:۲،ص:۳۶)

چند یوروپین کی بڑھ

صاحب سیرۃ النبی اِس واقعے کے بارے میں چند یوروپین مؤرخین کی یہ ٹک بندی نقل کرتے ہیں:

سر ولیم، میور، ڈر پیر، مارگوس، وغیرہ سب اِس واقعے کو عیسائیت کی فتحِ عظیم خیال کرتے ہیں اور اِس بات کے مدّعی ہیں کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مذہب کے حقائق و اسرار اُسی راہب سے سیکھے تھے اور جو نکتے اُس نے بتا دیے تھے، اُنھی پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عقائد اسلام کی بنیاد رکھی، اسلام کے تمام عمدہ اُصول انھی نکتوں کے شروح و حواشی ہیں۔

(ج:۱،ص:۱۷۹)

اسی کے حاشیہ پر ہے، ڈر پر صاحب معرکۂ علم و مذہب میں لکھتے ہیں:

بحیرا راہب نے بُصریٰ کی خانقاہ میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نسطوری عقائد کی تعلیم دی۔ آپ کے نا

تربیت یافتہ لیکن اخاذ دماغ نے نہ صرف اپنے اتالیق کے مذہبی؛ بلکہ فلسفیانہ خیالات کا گہرا اثر قبول کیا۔ بعد میں آپ کے طرزِ عمل سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ نسطوریوں (عیسائیوں کے ایک فرقے کا نام ہے) کے مذہبی عقائد نے آپ پر کہاں تک قابو پالیا تھا۔

سرویم میور صاحب نے بھی نہایت آب ورنگ سے ثابت کرنا چاہا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بت پرستی سے جو نفرت پیدا ہوئی اور ایک مذہبِ جدید کا جو خاکہ آپ نے قائم کیا، وہ سب اُسی سفر اور اس کے مختلف تجارب اور مشاہدات کے نتائج تھے۔

①

یوروپین مصنفین کو اپنی روشن دماغی اور تجدد آفریں ذہن پر بہت ناز ہے؛ لیکن منصف جانتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس مذہب کی بنیاد رکھی یا جس کی نشر واشاعت فرمائی وہ عیسائیت سے اپنے جملہ اصول وفروع میں بالکلیہ مختلف ہے۔ مثلاً عیسائیت کی بنیاد تثلیث پر ہے، اِس کے بر خلاف اسلام کی خشتِ اول توحید ہے، اگر اسلام کی بنیاد کسی عیسائی معلم سے سیکھے ہوئے حقائق واسرار اور نکتوں پر قائم ہوتی، فروع میں نہ سہی اصول میں ضرور اتحاد ہوتا۔ یہ کس کی عقل میں آسکتا ہے کہ تلمیذ اپنے استاذ کے بتائے ہوئے تمام حقائق واسرار ونکات کے علی الرغم اس کے متضاد اصول وفروع کی نشر واشاعت کرے۔

۞ استاذ کا بنیادی عقیدہ تثلیث، تلمیذ کا توحید۔

۞ استاذ کا عقیدہ یہ ہے کہ عیسیٰ، ابن اللہ ہیں۔ تلمیذ کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ ابن اللہ نہیں عبداللہ ہیں۔

۞ استاذ کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ عزوجل اُبُوَّت وزوجیت وتوالد وتناسل سے ملوث ہے۔ تلمیذ کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ سبوح وقدوس، تمام خرافات سے منزہ ہے۔

۞ استاذ کا عقیدہ یہ ہے کہ حضرتِ عیسیٰ سولی دیے گئے۔ تلمیذ کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ سولی سے محفوظ رہے، زندہ اٹھا لیے گئے۔

۞ استاذ کا عقیدہ یہ ہے کہ ہفتے میں ایک دن چند منٹ گرجا میں پادریوں اور ننوں کی گیت سن لینا عبادت ربانی کے لیے کافی ہے۔ تلمیذ کا عقیدہ یہ ہے کہ دن میں پانچ بار

معبودِ حق کی بارگاہ میں سجدہ کرو۔

۞ استاذ کا عقیدہ یہ ہے کہ صلیب کو پوجو۔ تلمیذ، غیر اللہ کی پرستش کا سب سے بڑا مخالف۔

۞ استاذ شراب، خنزیر، مردار جائز جانے۔ تلمیذ اِن سب کو حرام و اعمال شیطانی بتائے۔

۞ استاذ سود قمار کو مباح کہے۔ تلمیذ اِن سب کو گناہ بتائے۔

۞ استاذ کا قبلہ بیت المقدس۔ تلمیذ کا خانۂ کعبہ۔

غرض کہ عقائد و عبادات و معاملات ہر ہر قدم پر تخالف، پھر کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ بانیِ اسلام نے اُس عیسائی راہب کے سکھائے ہوئے حقائق و اسرار و نکات پر اسلام کی بنیاد رکھی ہے؟

اور اگر کوئی یہ کہے:

''اُس راہب کے عقائد وہ نہ تھے جو اُس دور کے عیسائیوں میں پھیل گئے تھے اور اُن کی اتباع میں آج تک پھیلے ہوئے ہیں، عیسائیوں کے یہ عقائد راہبوں اور پادریوں کے مُخترع ہیں، بحیرا راہب حقیقی عیسائیت کا پابند تھا، جو اُصول میں اسلام کے مطابق ہے۔''

تو مہربان اِس تقدیر پر ہمیں کہنے دیجیے کہ یہ اسلام کی عیسائیت پر فتحِ عظیم ہے، اسلام کا یہی دعویٰ ہے کہ آج عیسائی جس عیسائیت کا ڈھونگ رچائے ہیں، اُسے خدائی مذہب کہتے ہیں، یہ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کا مذہب نہیں، آسمانی مذہب نہیں؛ بلکہ پادریوں کی ہوا و ہوس کی پیداوار اور ان کا گڑھا ہوا ہے۔ اس اقرار کے کرنے والوں کو اپنے آپ کو عیسائی کہتے ہوئے شرم سے پانی پانی ہو جانا لازم ہے۔ اِس کے لیے سوا اِس کے اور کوئی چارۂ کار نہیں کہ وہ دامنِ اسلام میں پناہ لے۔

(۲)

کسی واقعے سے نتیجہ اخذ کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسے صحیح مان لیا گیا، نتیجہ خواہ غلط ہی کیوں نہ ہو۔ جب اِن مستشرقین نے بحیرا راہب کے واقعے سے مذکورہ نتیجہ اخذ کیا تو لازم ہے کہ وہ اُسے درست مانتے ہیں اور جب یہ واقعہ درست تو پیغمبر اسلام کا نبی برحق، نبی آخر الزماں ہونا اور اُن کے دین کا تمام ادیانِ سابقہ کا ناسخ ہونا ثابت؛ اِس لیے کہ اس واقعہ میں تصریح ہے کہ عیسائیوں کے اِس پیشوا نے اقرار کیا ہے:

’’هٰذَا سَيِّدُ الْعَالَمِيْنَ ، هٰذَا رَسُوْلُ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ يَبْعَثُهُ اللهُ رَحْمَةً لِلْعَالَمِيْنَ.‘‘ (ترمذی، ج:۲،ص:۲۰۲)

یہ تمام عالم کے سردار ہیں، یہ رب العالمین کے رسول ہیں، اللہ عزوجل اِنھیں رحمت عالم بنا کر مبعوث فرمایا۔

اس میں یہ بھی ہے کہ بحیرا ایمان لایا اور اُس نے روم سے آنے والوں سے کہا:

فَبَايِعُوْهُ وَاَقِيْمُوْا مَعَهُ.

(اِن کی بیعت کرو اور اِن کا ساتھ دو۔)

اپنے مذہبی پیشوا کی مفروضہ تعلیم وتلقین پر فخر کرنے والو! اگر تم میں ذرا بھی حق پرستی ہے اور اگر حق پرستی نہیں تو اپنے اِس بات کا ذرا بھی پاس ولحاظ ہے تو مذہبی پیشوا کا حکم مانو۔ آؤ اِنھیں سرور عالم، رب العالمین کا رسول، رحمۃ للعالمین مانو۔ ورنہ دنیا یہ کہنے پر مجبور ہوگی کہ تم میں حق پرستی تو کیا ہوگی، خود اپنی کہی ہوئی بات کا پاس تک بھی نہیں۔

(۳)

اس واقعے میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بحیرا سے دو بار ملاقات مذکور ہے، ایک اُس وقت جب قافلہ پہنچا، دوسری دعوت میں، پہلی ملاقات کے وقت اُس نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہاتھ پکڑ کر یہ کہا تھا:

’’هٰذَا سَيِّدُ الْعَالَمِيْنَ.‘‘

اِس کے علاوہ اور کوئی بات اس نے نہیں کہی۔ دوسری ملاقات میں دعوت کے وقت تو کسی بات کے کہنے اور سننے کا کوئی تذکرہ نہیں۔ اگر سب کے سامنے مذہب کے رموز ونکات سکھائے ہوتے تو وہ بھی ضرور مذکور ہوتے اور اگر خلوت میں کوئی بات ہوئی ہوتی تو خلوت کا تذکرہ ہوتا۔ جب کسی روایت میں اِن دونوں باتوں میں سے کوئی مذکور نہیں تو ناولسٹوں کی طرح اپنے دماغ سے واقعہ فرض کر کے اتنا بڑا دعویٰ کرنا تحقیق نہیں ابلہ فریبی ہے۔

(۴)

پھر یہ کس ذی ہوش کو باور ہوگا کہ مختصر سی ملاقات میں ۱۲ رسال کا بچہ وہ اسرار ورموز سیکھ

جائے جس پر اسلام جیسے عظیم مذہب کی بنیاد قائم کی جا سکے۔ اور اگر یہ سیکھنے والے کا اعجاز ہے تو اِس صاحبِ اعجاز کا کلمہ پڑھنے میں عار کیوں؟

آؤ اُن کا کلمہ پڑھ لو، ہمارا تمھارا جھگڑا ختم۔

صاحب سیرۃ النبی بحیرا کے واقعہ کے بارے میں اپنا فیصلہ یہ صادر فرماتے ہیں :

''لیکن حقیقیت یہ ہے کہ یہ روایت نا قابلِ اعتبار ہے، اِس روایت کے جس قدر طریقے ہیں سب مرسل ہیں، اِس روایت کا سب سے زیادہ مستند طریقہ یہ ہے جو ترمذی میں مذکور ہے، اس کے متعلق چند باتیں قابل لحاظ ہیں:

۞ ترمذی نے اس روایت کے متعلق لکھا ہے: حسن اور غریب ہے۔ اور ہم اس حدیث کو اِس طریقے کے سوا کسی اور طریقے سے نہیں جانتے جس کا مرتبہ صحیح حدیث سے کم ہوتا ہے اور جب غریب ہو تو اِس کا مرتبہ اس سے بھی گھٹ جاتا ہے۔

۞ اِس حدیث کا ایک راوی عبدالرحمٰن بن غزوان ہے، اس کو بہت سے لوگوں نے اگرچہ ثقہ بھی کہا ہے، لیکن اکثر اہلِ فن نے اِس کی نسبت بے اعتباری ظاہر کی ہے۔ علامہ ذہبی 'میزان الاعتدال' میں لکھتے ہیں:

عبدالرحمن مُنکر حدیثیں بیان کرتا ہے، جن میں سب سے بڑھ کر وہ روایت ہے جس میں بحیرا کا واقعہ مزکور ہے۔

۞ علامہ ذہبی نے یہ لکھا ہے کہ میں اِس حدیث کے بعض واقعات کو موضوع جھوٹا اور بنایا ہوا خیال کرتا ہوں۔

۞ اِس روایت میں مذکور ہے: حضرتِ بلال اور ابوبکر بھی اِس سفر میں شریک تھے، حالاں کہ اُس وقت بلال کا وجود بھی نہ تھا اور حضرتِ ابوبکر بچے تھے۔

۞ اِس حدیث کے اخیر راوی ابوموسیٰ اشعری ہیں وہ شریک واقعہ نہ تھے اور اوپر کے راوی کا نام نہیں بتاتے۔ ترمذی کے علاوہ 'طبقاتِ ابن سعد' میں جو سلسلۂ سند مذکور ہے وہ مرسل یا معضل ہے۔

۞ حافظ ابنِ حجر روایت پرستی کے بنا پر اِس حدیث کو صحیح تسلیم کرتے ہیں؛ لیکن

چوں کہ حضرتِ ابوبکر اور بلال کی شرکت بداہتاً غلط ہے؛ اس لیے مجبوراً اقرار کرتے ہیں کہ اس قدر حصہ غلطی سے روایت میں شامل ہوگیا؛ لیکن ابن حجر کا یہ ادعا بھی صحیح نہیں کہ اِس روایت کے تمام رُواۃ قابلِ سند ہیں۔ عبد الرحمٰن بن غزوان کی نسبت خود اِنھی حافظ ابنِ حجر نے 'تہذیب التہذیب' میں لکھا ہے کہ وہ خطا کرتا تھا، اس کی طرف سے اِسی وجہ سے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نے ممالیک کی روایت نقل کی ہے، ممالیک کی ایک روایت ہے جس کو محدثین جھوٹ اور موضوع خیال کرتے ہیں۔ (ج:۱ص:۱۸۱)

اپنے استاذ کی تقلید میں اُن کے بعض شاگردوں نے بھی اسے نا قابل اعتبار قرار دیا ہے اور جو کچھ ان کے استاذ نے کہا ہے اسی کو تھوڑی تفصیل کے ساتھ اُنھوں نے بھی سیرۃ النبی کی تیسری جلد میں لکھا ہے۔

مقدمے کی ابحاث پر ایک نظر ڈال دیجیے اور پھر اُنھیں ذہن میں رکھ کر استاذ و شاگرد کی اِس تنقید کو پڑھیے تو آپ پر واضح ہوجائے گا کہ اِس تنقید کی اہلِ علم کے نزدیک کوئی وقعت نہیں، اِس کا پورا جواب فصل معجزات میں آئے گا، یہاں صرف ناظرین کی تشفی کے لیے چند باتیں ذکر کی جاتی ہیں۔

علامہ کی پہلی دلیل اس واقعے کے نا قابل اعتبار ہونے کی یہ ہے کہ یہ حدیث مرسل ہے، اِسی کو پانچویں وجہ میں یوں بیان کیا ہے کہ اس حدیث کے اَخیر راوی حضرتِ ابوموسیٰ اشعری ہیں جو خود شریک واقعہ نہ تھے اور جس صحابی سے نقل کرتے ہیں اُس کا نام نہ لیتے۔

اگر کسی حدیث کے غیر معتبر ہونے کے لیے صحابی کا ارسال کافی ہو تو احادیث کا تقریباً نصف سرمایہ ردی کا طومار ہوجائے گا اور تو اور صحاحِ ستہ حتیٰ کہ بخاری و مسلم بھی غیر مستند ہوجائے گی۔ اِس لیے کہ صحابۂ کرام عام طور پر وہ واقعات روایت کرتے ہیں جن میں شریک نہ تھے اور تمام محدثین بالاتفاق اُسے مقبول و معتمد جانتے ہیں۔ خصوصاً حضرتِ اُمُّ المومنین عائشہ صدیقہ، حضرتِ ابوہریرہ، حضرتِ ابوموسیٰ اشعری، حضرتِ عبداللہ بن عباس کی صدہا روایتیں ایسی ہیں۔ حدیث کی جو کتاب اٹھائیے آپ کو ایسی مرویات کا ایک خزانہ ملے گا جو اِس طرح منقول ہیں؛ بلکہ خود اِن دونوں محققین کی تالیفات اِسی سے بھری پڑی ہے، مثال کے طور پر ایک روایت لیجیے: بدر

نبوت کی روایت اُمُّ المومنین حضرتِ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے اور قبلہ کی اصح کتب بعد کتاب اللہ کے ص: ۲۰۰ لغایت ص: ۲۰۲، جلد اول میں مذکور ہے۔

(اِس حدیث کو اِن بزرگوں نے مرسل مانا ہے، اُن کی تسلیم پر ہم نے مثال میں اِسے ذکر کیا ہے، ورنہ صحیح یہ ہے کہ وہ متصل ہے۔)

اور ہر مسلمان جانتا ہے کہ حضرتِ صدیقہ کا اُس وقت حبالۂ عقدِ مبارک میں آنا تو بہت دور ہے، اُن کی ابھی پیدائش بھی نہیں ہوئی تھی۔ یہاں کیوں علامہ اور اُن کے تلمیذ صاحب کو یہ نظر نہیں آیا کہ حضرتِ صدیقہ شریک واقعہ نہیں تھیں اور اُس راوی کا نام نہیں لیتیں جس سے انھوں نے سنا ہے؛ اس لیے یہ قابل اعتبار نہیں۔ اِس حال کے پیشِ نظر میں سوائے اِس کے کیا کہوں کہ یہ دونوں محققین مستشرقین کے ہفوات سے اتنے مرعوب ہو گئے کہ بحیرا کے واقعے کو ناقابلِ تسلیم بنانے کی سعیِ لاحاصل کی ہے یا پھر اِن صاحبان کا معیارِ تحقیق، روایت نہیں اپنا ذوق اور اپنی پسند ہے؛ ورنہ سارے محدثین اِس پر متفق ہیں کہ صحابی کا ارسال مطلقاً مقبول ہے، نہ صرف واقعاتِ سیر و ابوابِ فضائل میں؛ بلکہ دربارۂ احکام بھی۔ اصولِ فقہ کی مشہور متداول کتاب 'نورالانوار' میں ہے:

فَالْمُرْسَلُ مِنَ الْأَخْبَارِ إِن كَانَ مِنَ الصَّحَابِيِّ فَمَقْبُوْلٌ بِالْإِجْمَاعِ.

مرسل اگر صحابی سے ہے تو بالاجماع مقبول ہے۔ (ص: ۱۸۵)

لطف کی بات یہ ہے کہ خود تلمیذ صاحب کو اس کا اعتراف ہے۔ اِسی بدرِ نبوت کے واقعے پر تلمیذ صاحب حاشیۂ سیرت النبی میں لکھتے:

''یہ روایت حضرتِ عائشہ سے مروی ہے؛ لیکن حضرتِ عائشہ اُس وقت تک پیدا نہیں ہوئی تھیں، محدثین کی اصطلاح میں ایسی روایت کو مرسل کہتے ہیں؛ لیکن صحابہ کا مرسل محدثین کے نزدیک قابل حجت ہے؛ کیوں کہ متروک راوی بھی صحابہ میں ہی ہوں گے۔''

(حاشیہ، ص: ۲۰۲)

اس کی تفصیل یہ ہے کہ ہر صحابی عادل ہے، حدیث میں:

اَصْحَابِيْ كُلُّهُمْ عُدُوْلٌ.

میرا ہر صحابی عادل ہے۔

تقاضائے عدل یہ ہے کہ وہ کوئی مَن گڑھت وفرضی واقعہ نہیں بیان کریں گے؛ بلکہ وہ وہی واقعہ بیان کریں گے جو اُنھوں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہو یا کسی صحابی سے سنا ہو اور یہ درحقیقت اتصال ہے۔

نورالانوار میں ہے:

لِأَنَّ غَالِبَ حَالِهٖ اَنْ يَّسْمَعَ بِنَفْسِهٖ مِنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَإِنْ كَانَ يَحْتَمِلُ اَنْ يَسْمَعَ مِنْ صَحَابِيٍّ اٰخَرَ وَلَمْ يَكُنْ هُوَ بِنَفْسِهٖ حَاضِراً.

اس لیے کہ اغلب یہ ہے کہ اُس نے خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ دوسرے صحابی سے سنا ہو اور وہ خود واقعہ کے وقت حاضر نہ ہو۔ (ص:۱۸۵)

رہ گیا عبدالرحمٰن بن غزوان یا بعض دوسرے رُواۃ کا بعض ناقدین کے نزدیک ضعیف ہونا، اِس سے لازم اگر آتا ہے تو صرف یہ کہ [اُس] حدیث کا یہ سلسلہ ضعیف ہے؛ لیکن اگر کوئی حدیث چند طرق سے مروی ہو تو اگرچہ وہ سب ضعف رکھتے ہوں؛ لیکن ضعیف ضعیف مل کر بھی قوت حاصل کر لیتے ہیں؛ بلکہ اگر ضعف غایتِ شدت وقوت پر نہ ہو تو جبرِ نقصان ہو کر وہ حدیث حسن، بلکہ صحیح تک ہو جاتی ہے۔

مرقاۃ شرح مشکاۃ میں ہے:

تَعَدُّدُ الطُّرُقِ يُبْلِغُ الْحَدِيْثَ الضَّعِيْفَ إِلٰى حَدِّ الْحَسَنِ.

متعدد روایتوں سے آنا حدیثِ ضعیف کو درجۂ حسن تک پہنچا دیتا ہے۔

امام عبدالوہاب شعرانی قدس سرہٗ ''میزان الشریعۃ الکبریٰ'' میں فرماتے ہیں:

قَدِ احْتَجَّ جُمْهُوْرُ الْمُحَدِّثِيْنَ بِالْحَدِيْثِ الضَّعِيْفِ إِذَا كَثُرَتْ طُرُقُهٗ وَأَلْحَقُوْهُ بِالصَّحِيْحِ تَارَةً وَبِالْحَسَنِ أُخْرٰى.

جمہور محدثین نے حدیثِ ضعیف کو کثرتِ طرق سے حجت مانا اور اُسے کبھی صحیح اور کبھی حسن سے ملحق کیا۔

اور واقعۂ بحیرا کا تعددِ طرق سے مروی ہونا خود علامہ کو مسلم ہے، خود لکھتے ہیں:

''اِس روایت کا سب سے مستند طریقہ یہ ہے جو ترمذی میں مذکور ہے۔''

(ص:۱۸۰)

سب سے مستند طریقہ اُسی وقت ہوگا جب طرق کثیر ہوں۔

صفحہ:۱۸۰ پر ہے:

''ترمذی کے علاوہ طبقات ابنِ سعد میں جو سلسلہ مذکور ہے''

اِس سے معلوم ہوا کہ طبقات ابنِ سعد میں بھی یہ روایت ہے۔

تلمیذ صاحب جلد سوم میں فرماتے ہیں:

''مگر ابنِ اسحاق اور ابن سعد وغیرہ کتبِ سیر میں اِس کے متعلق جس قدر روایتیں ہیں، اُن سب کے سلسلے کمزور اور ٹوٹے ہوئے ہیں۔ حافظ سیوطی نے خصائص الکبریٰ میں ابنِ سعد وغیرہ سے چند اور سلسلے نقل کیے ہیں، مگر ان سے کوئی بھی محفوظ نہیں۔''

(ملخصاً، ص:۷۶۲)

خلاصہ یہ ہے کہ اِس [حدیث] کے تعددِ طرق سے کوئی انکار نہیں کرسکتا، اگر میں اُن طُرق کو نقل کروں تو بات طویل ہوگی۔ جب یہ محقّق [وثابت ہے] کہ یہ واقعہ تعددِ طرق سے مروی ہے اور علما کا اس پر اتفاق ہے کہ تعددِ طرق سے حدیث درجۂ حسن، بلکہ درجۂ صحت تک پہنچ کر مطلقاً مقبول ہوتی ہے، خواہ احکام ہو یا فضائل سیر۔ تو اب کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ یہ واقعہ مستند و معتمد ہے۔

ایک خاص بات یہاں ذہن نشیں کرلیں کہ تعددِ طرق کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ دس بیس طریقوں سے مروی ہو؛ بلکہ صرف دو طریقوں سے مروی ہو، جب بھی وہ قوی ہو جاتی ہے۔ تیسیر میں ہے:

ضَعِيْفٌ لِضُعْفِ عَمْرِو بْنِ وَاقِدٍ؛ لٰكِنَّهُ يَقْوٰى بِوُرُوْدِهٖ مِنْ طَرِيْقَيْنِ.

عمرو بن واقد کی وجہ سے ضعیف ہے؛ مگر دو سندوں سے آکر قوت پا گئی۔

علاوہ ازیں تلقّیِ امّت سے بھی حدیث قوت پاتی ہے، خصوصاً مرسل اور معضل کہ تلقیِ امّت کے بعد امام شافعی کے یہاں بھی مستند ہو جاتی ہے۔ نورالانوار میں ہے:

وَعِنْدَ الشَّافِعِيِّ لَا يُقْبَلُ اِلَّا اِذَا تَأَيَّدَ بِحُجَّةٍ قَطْعِيَّةٍ اَوْ قِيَاسٍ صَحِيْحٍ اَوْ

تَلَقَّتْهُ الْاُمَّةُ بِالْقَبُوْلِ اَوْ ثَبَتَ اِتِّصَالُهُ بِوَجْهٍ اٰخَر.

(غیرِ صحابی کا مرسل اور معضل) امام شافعی کے یہاں مقبول نہیں، مگر جب کہ اس کی تائید حجت قطعیہ اور قیاس صحیح سے ہو یا اُمت اُسے قبول کرے یا اس کا اتصال دوسرے طریقے سے ثابت ہوجائے۔

مرقاۃ میں ہے:

قَدْ صَرَّحَ غَيْرُ وَاحِدٍ بِأَنَّ مِنْ دَلِيْلِ صِحَّةِ الْحَدِيْثِ: قَوْلُ أَهْلِ الْعِلْمِ بِهِ وَإِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُ إِسْنَادٌ يُعْتَمَدُ عَلٰى مِثْلِهِ.

ایک نے نہیں کثیر علما نے تصریح کی ہے کہ حدیث کی صحت کی یہ بھی دلیل ہے کہ اہلِ علم اُسے اخذ کرلیں، اگرچہ اُس حدیث کی کوئی سند قابل اعتماد نہ ہو۔

'تعقبات' میں امام بیہقی سے ناقل:

تَدَاوَلَهَا الصَّالِحُوْنَ بَعْضُهُمْ عَنْ بَعْضٍ وَ فِيْ ذٰلِكَ تَقْوِيَةُ الْحَدِيْثِ الْمَرْفُوْعِ.

اسے صالحین نے ہاتھوں ہاتھ لیا ہے اور اس حدیث میں مرفوع کی تقویت ہے۔ امام ترمذی کا عام طریقہ یہ ہے کہ بعض احادیث پر باعتبار سند کلام کرنے کے بعد فرمایا کرتے ہیں:

وَالْعَمَلُ عَلٰى هٰذَا عِنْدَ أَهْلِ الْعِلْمِ.

اِس پر مرقاۃ میں ہے:

وَكَأَنَّ التِّرْمِذِيَّ يُرِيْدُ تَقْوِيَةَ الْحَدِيْثِ بِعَمَلِ أَهْلِ الْعِلْمِ.

امام ترمذی کی مراد اِس سے یہ ہے کہ اہلِ علم کے عمل سے حدیث قوی ہوجاتی ہے۔

واقعۂ بحیرا کے تلقّیِ اُمّت کا حال یہ ہے کہ ابنِ اسحاق سے لے کر آج تک کے تمام مصنفینِ سیرت ہی نے نہیں؛ بلکہ اجلۂ محدثین نے بھی اپنی اپنی تصنیفات میں نقل فرمایا ہے۔ امام ترمذی اور ابنِ سعد کا اخذ تو علامہ نے خود نقل کیا ہے۔ دوسرے حضرات کے اخذ کو اُن کے تلمیذ سے سنیے۔ دیگر طرق کو جانے دیجیے صرف جامع ترمذی میں جو سند ہے اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

''یہ قصہ اس سلسلۂ سند کے ساتھ جامع ترمذی، مستدرک حاکم، مصنف ابن ابی شیبہ،

دلائل بیہقی، دلائل ابی نعیم میں مذکور ہے۔'' (ج:۳،ص:۷۶۲)

صفحہ:۷۶۴ پر ہے:

''امام بیہقی اِس کی صحت کو صرف اِس قدر تسلیم کرتے ہیں کہ یہ قصّہ اہلِ سیر میں مشہور ہے۔ حافظ سیوطی نے خصائص میں امامِ موصوف کے اس فقرے سے یہ سمجھا کہ وہ اِس کے ضعف کے قائل ہیں۔ اِسی لیے اصل روایت میں ابنِ سعد وغیرہ چند اور سلسلے نقل کیے ہیں؛ مگر ان میں سے کوئی محفوظ نہیں ہے۔''

سلاسلِ اسناد کا محفوظ ہونا نہ ہونا یہ ایک الگ بحث ہے؛ مگر یہ تو ثابت ہو گیا کہ یہ روایت امّت میں مقبول و متداول ہے اور جب تداول و تلقّی سے حدیثِ ضعیف دربارۂ احکام حجت ہے تو بابِ فضائل میں بدرجۂ اولیٰ مستند و معتمد ہوگی۔ اِن سب سے قطعِ نظر بھی کر لیجیے تو زیادہ سے زیادہ یہی نہ ہوا کہ یہ ضعیف ہے۔ ہم مقدمے میں نقل کر آئے کہ علماے سیر و مغازی ہی نہیں؛ بلکہ تمام محدثین کا اِس پر اجماع ہے کہ بابِ فضائل میں حدیثِ ضعیف بھی مستند ہے، اِس لیے اگر اِن محققین کی تنقید مان لی جائے تو بھی اس خصوص میں اِس کے لائق استناد ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔

ویسے واقعے کے لحاظ سے یہ روایت مجموعی طور پر ضعف سے خالی ہے، امام ترمذی نے اِس کو حسن غریب کہا ہے اور حدیثِ حسن دربارۂ احکام حجّت ہے، امامِ حاکم نے اِسے بخاری و مسلم کی شرط پر صحیح بتایا۔

امام ابن حجر نے 'الاصابۃ' میں اس کے متعلق فرمایا:

''رجاله ثقات.'' [اس حدیث کے رجال ثقہ ہیں۔]

علامہ زرقانی شرح قسطلانی میں فرماتے ہیں:

قَالَ الْحَافِظُ ابْنُ حَجَرٍ فِي الْاِصَابَةِ: الْحَدِيْثُ رِجَالُهٗ ثِقَاتٌ مِنْ رُوَاةِ الصَّحِيْحِ وَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ غَزْوَانَ مِمَّنْ خَرَجَ لَهُ الْبُخَارِيُّ وَ وَثَّقَهٗ جَمَاعَةٌ مِنَ الْحُفَّاظِ.

ابنِ حجر نے اصابہ میں فرمایا: اس حدیث کے راوی ثقہ ہیں اور رُواۃ صحیح ہیں، عبدالرحمٰن

بن غزوان اِس پائے کے راوی ہیں کہ امام بخاری نے اُن سے روایت کی ہے اور اُن کی توثیق حفاظ کی ایک جماعت نے کی ہے۔

فجارِ ثانی

آں حضور کی عمرِ مبارک کا بیسواں سال تھا کہ قریش اور قیس میں ایک سخت خون ریز جنگ ہوئی، جس کا نام 'فجار' ہے۔ اِس جنگ میں قریش حق پر تھے؛ اس لیے آں حضور نے بھی شرکت کی؛ لیکن کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ جنگ کی تفصیل یہ ہے:

بنی کنانہ میں 'براض' نام کا ایک شخص تھا۔ کسی وجہ سے اہلِ قبیلہ نے اسے نکال دیا، یہ نعمان بن منذر کے یہاں چلا گیا۔ نعمان بن منذر ہر سال عرب کے بازاروں میں فروخت کے لیے مال بھیجا کرتا تھا، جب عکاظ کے میلے کا زمانہ آیا، تو نعمان نے براض اور عروہ سے کہا: میرا ارادہ عکاظ میں کچھ مال بھیجنے کا ہے، تم دونوں میں سے کون اِس کا ذمہ دار بنے گا؟ اس کے لیے دونوں تیار ہو گئے اور اپنی اپنی ترجیح ثابت کرنے میں جھگڑ پڑے۔ عروہ زیادہ تجربہ کار تھا؛ اس لیے نعمان نے مال اُسی کو دیا۔ عروہ جب مال لے کر نکلا تو اپنی خفت مٹانے کے لیے براض نے موقع پا کر عروہ کو قتل کر کے مال اپنے قبضے میں کر لیا۔ عروہ کے قتل کی خبر جب بنی قیس کو ہوئی تو عروہ کا بدلہ لینے کے لیے قیس کے کچھ آدمی نکلے۔ براض نے فریب دے کر انھیں بھی قتل کر دیا اور مکہ کی طرف چل دیا۔ ساتھ ہی خطرے کا احساس کر کے حرب بن امیہ کو اطلاع کر دی کہ وہ قیس کے مقابلے کے لیے تیار رہے۔ یہ اطلاع حرب کو عکاظ میں ملی۔ اُس نے قریش کے تمام سرداروں کو جمع کر کے مشورہ کیا اور مصالحت کے لیے قیس کے سردار عامر بن مالک کے پاس ایک وفد بھیجا، صلح کی بات چیت جاری تھی کہ کسی نے قریش کو یہ افواہ پہنچا دی کہ بنو قیس، قریش پر حملہ کرنا چاہتے ہیں، قریش یہ سن کر وہاں سے مکہ چل دیے۔ عامر بن مالک نے اسے دھوکا سمجھا اور فوراً ایک جمعیت لے کر قریش کے تعاقب میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ مکہ کے قریب دونوں میں جنگ ہوئی، قریش پسپا ہوئے، اپنے بچاؤ کے لیے حرم میں ہٹ آئے۔ بنی قیس حرم کی حرمت کی وجہ سے حرم میں خوں ریزی کر نہیں سکتے تھے۔ اس لیے واپس ہو گئے اور اَلٹی میٹم دے گئے کہ آئندہ سال عکاظ میں ہمارا تمھارا فیصلہ ہوگا۔

سال بھر تک دونوں نے خوب تیاریاں کیں اور سال بھر کے بعد عکاظ کے میدان میں دونوں طرف کی فوجیں آ جمیں۔ قریش کا سپہ سالار حرب بن اُمیّہ -حضرتِ ابوسفیان کا باپ اور حضرتِ معاویہ کا دادا- تھا۔ اِس جنگ میں تمام قریش شریک ہوئے۔ ہر خاندان نے اپنا اپنا پرچم لے کر الگ الگ صفیں قائم کی تھیں۔ بنی ہاشم کے علم بردار زبیر بن عبدالمطلب تھے۔ انھی کے ساتھ حضور ﷺ بھی تھے۔ بڑے زور کا رن پڑا۔ شروع شروع میں قریش کچھ دبے، آخر میں سنبھل گئے اور بنی قیس کو بری طرح شکست دی۔ جب طرفین کے کچھ حوصلے ٹھنڈے ہوئے تو صلح پر جنگ کا خاتمہ ہوا۔ شرط یہ ہوئی کہ دونوں طرف کے مقتولین گنے جائیں زائد کا ''خون بہا'' دے دیا جائے۔ یہ لڑائی چوں کہ شہر حرام میں ہوئی تھی؛ اِس لیے اُس کو 'فجار' کہتے ہیں۔ یہ زمانۂ جاہلیت کی سب سے مشہور اور بڑی جنگ ہے۔

حلف الفضول

زمانۂ جاہلیت کی پیہم لڑائیوں کی بربادیوں سے متأثر ہو کر کچھ لوگوں کے دلوں میں امن قائم کرنے کی کسی ٹھوس تحریک کا خیال پیدا ہوا۔ ابھی یہ خیال عملی جامہ پہننے نہیں پایا تھا کہ ایک ایسا واقعہ ہو گیا جس نے بالآخر اُن لوگوں کو ایک اصلاحی تحریک 'حلف الفضول' کے نام سے قائم کرنے پر آمادہ کر ہی لیا۔

ہوا یہ کہ بنی زہیر کے ایک تاجر سے عاص بن وائل نے کچھ مال خریدا اور قیمت نہیں دی۔ وہ بے چارہ فریاد کرتا پھرا؛ لیکن عاص بن وائل کے مقابل ہونے کی کسی میں جرأت نہ ہو سکی۔ ایک دن صبح کو قریش خانۂ کعبہ میں جمع تھے، اُس شخص نے اُس مجمع میں جا کر چند دردناک اشعار میں اپنی بے کسی ظاہر کی۔ زبیر بن عبدالمطلب اِس سے بہت متأثر ہوئے۔ انھوں نے بنی ہاشم، بنی زہرہ، بنی تمیم کو عبداللہ بن جدعان کے گھر جمع کر کے 'حلف الفضول' کی تشکیل کی جس کی دفعات یہ تھیں:

- ہم ملک سے بدامنی دور کریں گے۔
- ہم مسافروں کی مدد کریں گے۔
- ہم غریبوں کی اعانت کریں گے۔

۞ ہم مظلوموں کا ظالم سے بدلہ لیں گے۔

۞ ہم طاقتور کو کمزور پر ظلم نہیں کرنے دیں گے۔

اس تحریک میں آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی شریک تھے اور اس کی اہمیت کو زمانۂ رسالت میں ان الفاظ میں ظاہر فرمایا:

شَهِدْتُ فِيْ دَارِ عَبْدِاللهِ بْنِ جُدْعَانَ حَلْفًا، لَوْ دُعِيْتُ بِهِ فِي الْإِسْلَامِ لَأَجَبْتُ.

میں عبداللہ بن جدعان کے گھر ایک حلف میں شریک ہوا تھا اگر اسلام میں بھی کوئی اس کے لیے بلائے تو میں تیار ہوں۔

دوسری جگہ یہ الفاظ ہیں کہ اس معاہدے کے بدلے اگر سرخ اونٹ دیے جاتے تو بھی میں نہ بدلتا۔

اُس معاہدے کو 'حلف الفضول' اِس لیے کہتے ہیں کہ پہلے بھی ایک دفعہ یہ تحریک اٹھ چکی تھی، جن کو پہلے پہل اِس کا خیال آیا اُن کے نام 'فضیل' و 'مفضل' تھے۔ اِن دونوں کا مادہ فضل ہے اور فضل کی جمع فضول ہے؛ اس لیے اُس کا نام حلف الفضول پڑا۔ یہ لوگ جرہم اور قطورا کے قبیلے کے تھے۔ یہ معاہدہ نسیاً منسیاً ہو گیا تھا؛ مگر نیک نیتی کا فائدہ یہ ہے کہ اُن کے نام اس یادگار کے ساتھ زندہ ہیں۔

تعمیرِ کعبہ

حضرتِ خلیل اللہ کے بعد قُصَی نے پرانی عمارت ڈھا کر نئے سرے سے بنوائی تھی اور کھجور کے تختوں کی چھت پاٹی تھی؛ مگر مرورِ زمانہ سے چھت جاتی رہی، صرف قدِ آدم دیواریں قائم رہیں۔ عمارت نشیبی علاقے میں تھی، بارش میں پانی حرم میں آجاتا تھا، اِس کی روک تھام کے لیے پانی کے درآمد کی جگہ بند تھا؛ مگر وہ ٹوٹ ٹوٹ جاتا تھا اور سیلاب کا پانی کعبہ کے دیواروں سے ٹکراتا تھا، جس سے عمارت خستہ ہو گئی تھی۔ اس پر مستزاد یہ ہوا کہ ایک بار ایک عورت کی انگیٹھی سے- جو کعبہ کو بخور دے رہی تھی- پردے میں آگ لگ گئی اور بڑھ کر پوری عمارت اُس کی لپیٹ میں آگئی جس سے کئی جگہ سوراخ ہو گئے اور عمارت کافی مخدوش ہو گئی۔ اس لیے اس کی تعمیرِ جدید کا

خیال قریش کو ہوا۔ باہمی مشورے سے جب یہ طے ہوگیا کہ قدیم عمارت اٹھا کرنئ اور مستحکم بنائی جائے، تو چندے کا کام شروع ہوا۔ ابووہب بن عائدمخزومی نے یہ رائے پیش کی کہ اِس مقدس عمارت میں کوئی پیسہ حرام کا نہ لگے۔سب نے اس کی پابندی کی؛ لیکن قدیم عمارت ڈھانے کی ہمت کسی کونہیں ہوئی۔ ابرہہ کی بربادی کوآنکھوں سے دیکھنے والے سیکڑوں موجود تھے، کافی لیت ولعل کے بعدسب سے پہلے ہمت کرکے ولید بڑھااور پہلے یہ عرض کیا:

’’اے اللہ! ہم نہ تو تیرے دین سے اکتائے ہیں اور نہ نکلے ہیں اور ہماری نیت اچھی ہے۔‘‘

یہ عرض کرکے رکنِ اسوداور رکنِ یمانی کے جانب والی دیوار ڈھائی، بقیہ حصہ چھوڑ دیا۔ لوگ رات بھرانتظار کرتے رہے کہ دیکھیں ولید کوکوئی آفت تونہیں پہنچی۔ اگر وہ ٹھیک رہا تو بقیہ عمارت ڈھا کرنئ عمارت بنائی جائے گی، ورنہ گرے ہوئے حصہ کی مرمت کر کے چھوڑ دیا جائے گا۔صبح کو ولید جب بخیر وعافیت ملاتو سب نے مل قواعدِ ابراہیم تک دیواریں گرادیں، کسی نے قواعد ِابراہیم کوبھی کھودنا چاہا۔ پہلا ہی پتھر سرکا تھا کہ سارا مکہ لرز گیا،ایک بجلی کوندگئ۔اب کسی کی مجال نہ تھی کہ آگے بڑھتا،قواعدابراہیم ہی پر دیواریں چننی شروع کردیں۔

ایک روایت میں ہے کہ لوگوں نے جب عمارت ڈھانی شروع کی تو ایک کالا سانپ نکلا، لوگ گبھرا کر مقامِ ابراہیم کے پاس بھاگے۔ولید نے لوگوں سے کہاتم سب عہد کرو کہ اپنے رب کے گھر میں پاک مال لگاؤ گے۔سب نے یہ عہد کیا اور دعا کی۔ الٰہی اگر ہمارے اس اقدام میں تیری رضا ہوتو اس سانپ کو دفع فرما۔فوراًایک پرندہ عقاب کے مشابہ-جس کی پیٹھ سیاہ اور پیٹ سفید اور ٹانگیں زرد تھیں- آیا اور سانپ کو لے کر اڑ گیا۔اس کے بعد کام اور آگے بڑھایا گیا۔

اُنھی دنوں جدہ کی بندرگاہ پرایک جہاز ٹکرا کر بے کار ہوگیا تھا۔قریش نے ولید بن مغیرہ کو بھیجا، اُس نے جدہ پہنچ کر جہاز کے تختے مول لیےاور جہاز والوں میں ایک ’باقوم‘ نام کا رومی معمار تھا،اس کوبھی لایا۔قریش نے بڑے جوش وخروش سے پوری یکجہتی کے ساتھ کام شروع کیا۔چھوٹے بڑے سب خود مزدوروں طرح کام کرتے۔خود حضورِاقدس ﷺ کاندھوں پر پتھر ڈھو ڈھو کر لاتے، یہاں تک کہ شانے چھل گئے تھے۔

قریش کی شاخوں نے اپنے اپنے حصے الگ کر لیے تھے؛ کہ اس شرف سے سب کو حصہ ملے۔لیکن جب حجرِ اسود کو اپنی جگہ نصب کرنے کا موقع آیا تو شدید نزاع واقع ہوا۔ ہر قبیلہ یہ چاہتا تھا کہ یہ اہم کام اس کے ہاتھ سے انجام پائے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ تلواریں نیاموں سے نکل آئیں۔ زمانۂ جاہلیت میں دستور یہ تھا کہ جب کوئی جان دینے کی قسم کھاتا تو پیالہ میں خون بھر کر انگلیاں ڈبو لیتا۔ اُس وقت بھی کچھ جوشیلے لوگوں نے یہ خونی عہد کیا۔ چار دن تک جھگڑا ہوتا رہا، پانچویں دن ابو اُمیہ بن مغیرہ نے یہ رائے دی کہ کل صبح جو شخص سب سے پہلے حرم میں آئے، وہی حکم مان لیا جائے۔ یہ قریش میں سب سے زیادہ سن رسیدہ تھا۔ ہزار گئے گزرے ہونے کے باوجود قریش میں بڑے بوڑھوں کا تھوڑا بہت پاس تھا۔اس لیے سب نے اُس کی رائے مان لی۔

دوسرے دن قریش کا ہر فرد سب سے پہلے حرم میں داخل ہونے کے ارادے سے گھر سے چلا؛ لیکن جب اندر داخل ہوئے تو سب نے دیکھا کہ نور دیدۂ خلیل اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب سے پہلے مرکزِ توحید میں پہنچ چکا ہے۔ وفورِ مسرت میں سب کی زبان سے بے ساختہ نکلا:

''جَاءَ الْأَمِيْنُ، جَاءَ الْأَمِيْنُ.''

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سارے قبائل کو اِس شرف سے بہرہ ور فرمانے کے لیے یہ ترکیب کی: ایک چادر بچھا کر اُس میں حجرِ اسود رکھا اور قبائل میں سے ایک ایک سردار کو منتخب فرمایا اور اُن سے کہا کہ سب مل کر چادر اٹھائیں، جب چادر اونچی ہو کر وہاں پہنچ گئی جہاں حجرِ اسود نصب کرنا تھا تو آپ نے اپنے دستِ حق پرست سے حجرِ اسود اٹھا کر اُس کی جگہ رکھ دیا۔ **اس طرح قبلۂ عالم کا تکمیلی پتھر آپ کے ہاتھوں نصب ہوا، آپ کے حسنِ تدبیر سے ایک خوفناک جنگ بھی ختم ہوگئی اور ہر قبیلہ اپنی اپنی جگہ خوش بھی رہا۔**

اب کعبہ پر چھت بھی بنا دی گئی؛ لیکن سامانِ عمارت کی کمی کی وجہ سے کعبہ کا ایک حصہ چھوڑ دیا گیا کہ پھر کبھی آئندہ اُسے ملا کر بنا لیں گے۔ ایک دیوار اٹھا دی گئی، اُسی حصے کو حطیم کہتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمایا [کرتے]:

''اہلِ مکہ کے نئے مسلمان ہونے کی وجہ سے اگر ان کے بھڑک جانے کا اندیشہ نہ

ہوتا، تو مَیں کعبہ ڈھا کر حطیم ملا کر اسے مکمل کر دیتا۔ (عینی)

حضرتِ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ۶۵ھ میں اس ارشاد کی تکمیل کی۔ جب حطیم کی دیوار ڈھا کر نیو کھودی گئی تو قواعدِ ابراہیم کے پتھر ملے، اُنھی پر دیوار چنی گئی۔ مگر مشہور مروانی سفاک عبد الملک بن مروان کے عہد میں اس کے خوں خوار درندے حجاج نے حضرتِ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کو سولی دے دینے کے بعد اُس عمارت کو ڈھا کر عہدِ جاہلیت کے مطابق پر بنا دی کہ حضرتِ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے احیاے سنت کا یہ نشان کیوں باقی رہے۔ (بخاری، ج:۱، ص:۲۱۶)

منصور نے جب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا یہ ارشاد سنا تو حضرتِ امامِ مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اجازت طلب کی کہ پھر قواعدِ ابراہیم پر حطیم کو لے کر کعبہ بنا دیا جائے؟ تو امامِ مالک نے اجازت نہیں دی اور فرمایا: میں کعبہ کو شہنشاہوں کا بازیچہ نہیں بنانا چاہتا۔

تعمیرِ کعبہ کے وقت آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی عمر مبارک ۲۵ رسال تھی۔

کسبِ معاش و تأہّل:

﴿وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنٰى.﴾

اور اللہ نے تمھیں تہی دست پایا تو غنی کر دیا۔ (سورۂ ضحیٰ:۸)

جب آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کاروبار کے لائق ہو گئے تو تجارت ہی کا شغل اپنے لیے منتخب فرمایا۔ تجارت کے لیے ہوش مندی کے ساتھ ساتھ تجربہ بھی لازم ہے۔ بچپن میں ابو طالب کے ساتھ تجارت کے لیے سفر کرنے سے پختہ کاری آ چکی تھی؛ اِسی لیے جب آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کاروبار شروع فرمایا تو تھوڑے ہی دنوں میں حسنِ کارکردگی، حسنِ معاملہ کی عام شہرت ہو گئی۔ بڑے بڑے رؤسا کا یہ دستور تھا کہ اپنا مال کسی دیانت دار ماہر کو شرکت پر دے دیا کرتے۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس اتنا سرمایہ نہ تھا کہ اپنا ذاتی کاروبار کرتے؛ اس لیے لوگوں کا مال بطور مضاربت لے کر تجارت کیا کرتے۔ جن جن لوگوں کے ساتھ معاملہ رہا، انھوں نے آپ کی صلاحیت، امانت، ایفاے عہد کی ہمیشہ تعریف کی۔ **چناں چہ ربّ العالمین کی امانت کبریٰ کا امین قبل ظہورِ نبوّت ہی امین کے لقب سے مشہور ہو چکا تھا۔**

شرکائے تجارت میں سے سائب رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب مسلمان ہوئے تو لوگوں نے اُن کی تعریف کی۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

میں [اُنھیں] اچھی طرح جانتا ہوں۔

انھوں نے عرض کیا:

فداک ابی وامّی- آپ میرے شریک تجارت تھے؛ لیکن معاملہ ہمیشہ صاف رکھا۔

فَکُنْتَ لَا تُدَارِیْ وَلَا تُمَارِیْ.

آپ نہ کبھی لڑتے اور نہ کبھی جھگڑا کرتے۔

(سننِ ابوداؤد، ص:۱۷)

اِسی طرح آپ کے دوسرے شریک تجارت قیس بن سائب مخزومی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے:

''شرکت داروں کے ساتھ آپ کا معاملہ ہمیشہ صاف رہتا تھا۔ کبھی کسی قسم کا جھگڑا نہیں پیش آتا تھا۔ تفسیر کے مشہور امام مجاہد انھی کے غلام تھے۔''

عبداللہ بن ابوالحمساء اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں:

''قبلِ نبوت میں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے کچھ چیزوں کی خرید وفروخت کی بات چیت کی تھی۔ ابھی بات ادھوری رہ گئی تھی کہ میں پھر آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا، عجب اتفاق کی تین دن تک مجھے اپنا وعدہ یاد نہ رہا۔ تیسرے دن جب میں اس جگہ پہنچا تو آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو منتظر پایا؛ مگر میرے حسبِ وعدہ نہ پہنچنے اور تین دن تک انتظار کی زحمت برداشت کرنے کے باوجود چہرۂ اقدس پر کوئی ملال کا اثر نہ تھا۔ ہاں! صرف اتنا فرمایا:

میں یہاں تین دنوں سے ہوں، تم نے مجھے مشقت میں ڈال دیا۔''

شام، بصریٰ یمن کے علاوہ حضور نے جن جن مقامات کے سفر کیے ان میں جواثیٰ جرش، بحرین کا ذکر ملتا ہے۔ عام الوفود میں جب بحرین کے مشہور قبیلہ عبدالقیس کا وفد آیا تو آپ نے وہاں کے ایک ایک مقام کا نام لے لے کر پوچھا، لوگوں کو تعجب ہوا۔

عرض کیا: ''ہمارے ملک کو ہم سے اچھی طرح جانتے ہیں۔''

فرمایا: ''میں نے تمھارے ملک کی اچھی طرح سیر کی ہے۔''

حضرتِ خدیجہ:

عرب کے رؤسا میں حضرتِ خدیجہ بنت خویلد بہت ہی ممتاز تھیں، قریش کا کاروانِ تجارت جب چلتا تو آدھا سامان اُن کا ہوتا، اور آدھے میں پورا قافلہ، دولت کے ساتھ ساتھ قدرت نے اُس دور جہالت میں بھی- غیر معمولی حسن و جمال کے باوجود- اُن کو عصمت و عفّت، شرافت و نجابت سے مالا مال کر رکھا تھا۔ اِسی بنا پر ان کا لقب 'طاہرہ' تھا۔

اِن کا نسب پانچویں پشت میں قصی پر آں حضور ﷺ سے مل جاتا ہے۔ اِن کی دو شادیاں پہلے ہو چکی تھیں۔ پہلی ابو ہالہ ہند بن نیاس تمیمی سے۔ دوسری عتیق بن عائذ مخزومی سے۔ اُس وقت یہ بیوہ تھیں۔ اپنا سامانِ تجارت مضاربتاً دوسروں کو دیا کرتی تھی۔ آں حضور ﷺ کی عمرِ مبارک کا پچیسواں سال تھا۔ قریش کا قافلہ سفر کی تیاری کر رہا تھا۔ اِدھر حضرتِ خدیجہ کو کسی تجربہ کار راست باز، امانت دار آدمی کی تلاش تھی جو اُن کا مال تجارت لے جائے۔ آں حضور ﷺ سے بڑھ کر اُنھیں کون امانت دار ملتا؟ اُنھوں نے آں حضور ﷺ کو بلا کر مال سپرد کر دیا اور اپنے غلام میسرہ اور ایک رشتے دار خزیمہ کو ساتھ کر دیا۔

نسطورا سے ملاقات:

کاروانِ تجارت جب بُصریٰ پہنچا تو اب کی بار ایک دوسرے راہب نسطورا کی خانقاہ کے قریب اترا۔ نسطورا نے آں حضور ﷺ کو دیکھ کر میسرہ سے پوچھا:

''یہ کون ہے؟''

میسرہ نے بتایا، تو نسطورا نے کہا:

''اِس درخت کے نیچے سوائے نبی کے اور کوئی نہیں اترا۔''

پھر پوچھا: ''کیا اِن کی آنکھوں میں یہ سرخی ہمیشہ رہتی ہے؟''

میسرہ نے کہا: ''ہاں! ہمیشہ رہتی ہے۔''

یہ سن کر نسطورا نے کہا:

''یہ وہی ہیں، یہ وہی ہیں، یہی آخرالانبیاء ہیں، اے کاش کہ میں اِن کی نبوت کا زمانہ پاتا۔''

پھر راہب خدمت اقدس میں حاضر ہوا، اور سرِ اقدس اور قدمِ پاک کو بوسہ دیا اور عرض کیا:

''میں آپ پر ایمان لایا، اور میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ ہی وہ ہیں جن کا ذکر اللہ عزّوجل نے توریت میں کیا ہے۔''

اُسی اثنا خاتمِ نبوت پر اس کی نظر پڑی تو اسے بوسہ دیا اور کہا:

''میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، نبیِّ امّی ہیں، جن کی بشارت عیسیٰ علیہ السلام نے دی تھی۔ انھوں نے بتایا تھا کہ میرے بعد اِس درخت کے نیچے نبیِ اُمّی ہاشمی عربی مکی صاحبِ حوض اور شفاعت کے سوا اور کوئی قیام نہیں کرے گا۔''

آپ نے وہی بصرہ کے بازار میں سامانِ تجارت بیچ کر دوسری اشیا خریدیں، ایک شخص سے خرید و فروخت میں اختلاف ہو گیا، اُس نے کہا:

''لات اور عزّا کی قسم کھاؤ!''

آپ نے فرمایا: ''مَیں نے کبھی اِن کی قسم نہیں کھائی ہے۔''

اِس پر اُس نے آپ کی بات مان لی اور میسرہ کو تنہائی میں لے جا کر کہا:

''یہ نبی ہیں، قسم ہے اُس کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، یہ وہی ہیں جن کے اوصاف ہمارے احبار اپنی کتاب میں پاتے ہیں۔''

میسرہ نے یہ سب بات نوٹ کر لیں۔ میسرہ نے یہ بھی دیکھا کہ دو پہر میں دو فرشتے سرِ اقدس پر سایہ کرتے ہیں۔ قافلہ کے دیگر افراد بھی یہیں مال بیچ کر واپس ہو گئے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو دونا نفع ہوا، حضرتِ خدیجہ نے بھی جو معاوضہ طے کیا تھا اس سے دونا دیا۔

عقدِ نکاح:

جب حضور مکہ واپس ہوئے تو دو پہر کا وقت تھا۔ حضرتِ خدیجہ اپنے بالا خانہ پر سہیلیوں کے ساتھ قافلہ کے واپسی کا منظر دیکھ رہی تھیں۔ اُنھوں نے دیکھا کے دو فرشتے چڑیوں کی شکل میں

سرِ اقدس پر سایہ کیے ہوئے ہیں۔ حضرتِ خدیجہ نے اپنے سہیلیوں کو بھی دکھایا، یہ دیکھ کر حضرتِ خدیجہ کے دل میں آں حضور ﷺ کی بے پناہ محبت پیدا ہوگئی۔ پھر جب میسرہ نے خدیجہ سے نسطورا کی باتیں، بازار کا واقعہ اور راستے کے حالات بتائے تو یہ جذبہ اس حد تک پہنچ گیا کہ اُن کے دل میں آں حضور ﷺ سے نکاح کا عزمِ مصمم پیدا ہو گیا۔ چناں چہ اِس سفر کے واپسی کے کم وبیش تین ماہ بعد حضرتِ خدیجہ نے ایک عورت کو آں حضور ﷺ کے پاس بھیجا کہ وہ اندازہ کرے کہ آپ شادی کی رغبت رکھتے ہیں یا نہیں؟ اُس عورت نے آ کر آں حضور ﷺ سے عرض کیا:

''اے محمد (ﷺ)! آخر آپ شادی کیوں نہیں کرتے ہیں؟''

حضور نے جواب دیا: ''شادی کو سرانجام کہاں سے کروں، ہاتھ خالی ہیں۔''

اس عورت نے کہا:

''اگر کوئی عورت ایسی ملے جو نسوانیت کے کمالات کے جامع ہوتے ہوئے آپ کی تمام اخراجات کی کفیل ہو تو؟''

آں حضور ﷺ نے دریافت فرمایا: ''ایسی کون عورت ہے؟''

اس نے حضرتِ خدیجہ کا نام لیا اور بتایا کہ وہ آپ سے بہت محبت رکھتی ہیں اور آپ سے شادی کی خواہش مند ہیں۔ اگر آپ رضامندی ظاہر کریں تو آسانی کے ساتھ یہ معاملہ طے ہو جائے گا۔

آں حضور ﷺ نے اپنی رضامندی ظاہر فرما دی۔ اُس عورت نے آ کر حضرتِ خدیجہ کو خوش خبری سنائی۔ حضرتِ خدیجہ نے اپنے چاچا عمر بن اسد کو بلا کر اپنے ارادے کی اطلاع دی۔ اس کے بعد نکاح کی تاریخ مقرّر ہوئی، تاریخِ معیّنہ پر آں حضور ﷺ معززینِ خاندان و دوست واحباب کے ساتھ۔ جن میں **ابو طالب، حضرتِ حمزہ، حضرتِ ابو بکر بھی تھے**۔ حضرتِ خدیجہ کے گھر تشریف لے گئے۔

آں حضور ﷺ کی طرف سے ابو طالب نے پہلے خطبۂ نکاح پڑھا۔ پھر حضرتِ خدیجہ کی طرف سے اُن کے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل نے پڑھا۔ ورقہ بن نوفل جب خطبے سے فارغ ہو چکے تو ابو طالب نے کہا: بہتر ہوتا کہ خدیجہ کے چچا عمر بن اسد بھی خطبہ پڑھیں۔ اس پر عمر

بن اسد نے بھی یہ کہا: اے قریش! گواہ ہو جاؤ میں نے خدیجہ بنت خویلد کو محمد بن عبداللہ کے نکاح دیا۔

نکاح کے بعد حضرتِ خدیجہ نے آں حضور سے کہا:

اپنے چچا سے فرمائیں کہ ایک دو اونٹ ذبح کر کے دعوت ولیمہ کریں۔

شادی چوں کہ پرورش کی آخری حد ہے؛ اس لیے اس اخیر بار سے سبکدوش ہو جانے کے بعد ابوطالب مطمئن ہو گئے اور شکریے میں یہ الفاظ کہا:

أَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ أَذْهَبَ عَنَّا الْكَرْبَ وَرَفَعَ الْهُمُوْمَ.

اس اللہ کے لیے حمد ہے جس نے ہم سے بے چینی کو دور کیا اور غم کو اٹھا لیا۔

بعض مفسرین نے آیۃ کریمہ:

﴿وَوَجَدَكَ عَائِلاً فَأَغْنٰى.﴾

اللہ نے آپ کو تہی دست پایا تو غنی کر دیا۔ (سورۂ ضحیٰ: ۸)

کی تفسیر یہ کی ہے کہ خدیجہ جیسی مال دار عورت سے آپ کو نکاح کرا کر غنی کر دیا۔

نکاح کے وقت آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر ۲۵ رسال تھی اور حضرتِ خدیجہ کی ۴۰ رسال، یہی صحیح ہے۔ مہر کے بارے میں چار روایتیں آئی ہیں:

- بیس نوجوان اونٹ۔
- پانچ سو درہم۔
- چار سو مثقال۔
- بارہ اوقیہ اور ایک نش۔

پھر یہ سوال ہوتا ہے کہ چاندی یا سونا؟

علامہ احمد خطیب قسطلانی اور علامہ عبدالباقی زرقانی نے یہی اختیار فرمایا ہے کہ مہر سونا تھا۔ مقدار کے بارے جو اختلاف ہے اُس کو یوں دور کیا جا سکتا ہے کہ بارہ اوقیہ اور ایک نش کی مقدار پانچ سو درہم ہے۔ اِس لیے کہ ایک اوقیہ ۴۰ رد رہم کا اور نش نصف اوقیہ کو کہتے ہیں، جو ۲۰ رد رہم ہوئے، جس کی میزان پانچ سو درہم ہوئی۔ اس لیے پانچ سو درہم اور ساڑھے بارہ اوقیہ اور نش کی روایتوں کا حاصل ایک ہی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ بیس اونٹ کی قیمت اُس زمانے میں پانچ سو درہم سونا ہوتی ہو، اِس لیے اِن تینوں روایتوں کا حاصل ایک ہی ہوا۔ البتہ چوں کہ چار سو

مثقال کا وزن ۱ء۷۵ ردرہم سے بھی زائد ہے؛ اس لیے اِن دونوں کا حاصل ایک نہیں ہوسکتا، نہ باعتبا وزن نہ باعتبار قیمت۔ اس لیے کہ اُس مبارک عہد میں ایک مثقال سونا کی قیمت دس درہم تھی، یعنی ایک تولہ سونا کی قیمت ۷ ر روپے ایک نیا پیسہ تھا۔ اِس طرح چار سو مثقال سونے کی قیمت ساڑھے چار ہزار درہم کے قریب ہوتی ہے۔ اس لیے علامہ زرقانی نے اِس کی توجیہ یہ کی کہ مہر پانچ سو درہم طلائی عقد کے وقت مقرر رہوا تھا؛ مگر بعد میں آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مہر میں اضافہ فرما دیا، اِس طرح اس کی مقدار چار سو مثقال ہوگئی۔ واللہ تعالیٰ اعلم

حضرتِ خدیجہ جس مکان میں رہتی تھیں وہ اُنھی کے نام سے مشہور تھا۔ طبری نے یہاں تک لکھا کہ اُن عہد میں بھی وہ مکان حضرتِ خدیجہ کے نام سے مشہور تھا۔ حضرتِ امیر معاویہ نے اُس مکان کو خرید کر مسجد بنا دیا۔

آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جتنی اولاد ہوئیں سب حضرتِ خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہی کے بطن سے ہیں، سوائے حضرتِ ابراہیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے، یہ حضرتِ ماریہ قبطیہ کی بطن سے ہیں۔

خصوصی احباب:

جس طرح ہر شخص کے خصوصی احباب ہوتے ہیں، آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بھی تھے۔

اُن میں سب سے نمایاں حضرتِ **ابوبکر صدیق** رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ یہ مختلف سفر میں بھی ہمرکاب رہے۔ نکاح کے وقت برات میں بھی شامل تھے۔

دوسرے **حکیم بن حزام** حضرتِ خدیجہ کے چچا زاد بھائی ہیں، یہ آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عمر میں پانچ سال بڑے تھے، قریش کے سر برآوردہ رئیس تھے، دارالندوہ اِنھی کی مِلکیت تھی، جسے اسلام کے بعد ایک لاکھ درہم میں امیر معاویہ کے ہاتھ سے بیچ ڈالا اور کل رقم خیرات کر دی۔ منصب رفادہ اِنھی کے سپرد تھا یہ اگرچہ ۸ ھ میں ایمان لائے؛ لیکن حالتِ کفر میں بھی آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بے پناہ محبت رکھتے تھے، ہجرت کے بعد مکہ میں ایک بار ''ذویزن'' کے اسباب نیلام ہوئے تھے، اُس میں سے ایک عمدہ حُلّہ پچاس اشرفیوں میں خریدا اور مدینۂ طیبہ خدمتِ اقدس میں لے کر حاضر ہوئے، پیش کیا۔

آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''میں مشرکین کا ہدیہ نہیں لیتا، اگر قیمت لو تو لے لوں گا۔''

مجبور ہو کر اُنھوں نے قیمت لی اور آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حُلّہ لے لیا۔

تیسرے دوست **ضماد بن ثعلبہ ازدی** تھے۔ جاہلیت میں طبابت، جراحی، جھاڑ پھونک کیا کرتے تھے۔ عہدِ نبوت میں ایک مرتبہ مکہ آئے تو دیکھا کہ آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آگے آگے اور لونڈوں کا غول شور مچاتا ہوا پیچھے پیچھے ساتھ ہے۔ مکہ کے جاہل آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مجنوں کہتے تھے۔ ضماد نے بھی آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس حالت میں دیکھ کر یہی سمجھا۔ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کی:

''محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اگر کہو تو تمھارا بھی علاج کر دوں۔''

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب میں مشہور خطبہ: 'اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ' پڑھا، یہ معجز کلمات سن کر عرض کیا: پھر پڑھیے حضور نے پھر پڑھا۔ پھر عرض کیا: اور پڑھیے! حضور نے تیسری بار پڑھا۔ کلمات رسالت کا اعجاز اپنا کام کر گیا، ضماد کے دل سے ظلمات کے پردے اٹھ گئے، عرض کیا: میں نے کاہنوں کے کلام سنے ہیں، ساحروں کے سنے ہیں، شاعروں کے سنے ہیں؛ لیکن یہ بات کسی میں نہیں۔ یہ اتھاہ سمندر ہیں، ہاتھ بڑھائیے کہ میں بیعتِ اسلام کروں۔

ضماد آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا علاج کرنے کے لیے آئے تھے؛ مگر دل میں خلوص تھا، جو قبول ہوا۔ خود مرضِ کفر سے شفا پا گئے۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ورقہ بن نوفل سے بھی دوستی تھی۔

دنیا کی حالت:

آفتابِ رسالت کے طلوع کے وقت دنیا پر کتنی ہمہ گیر ظلمت کی دبیز تہیں چڑھی ہوئی تھیں، اِس کا اندازہ اُس وقت کے دنیا کی مذہبی، اخلاقی، تمدنی حالت سے کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اُس وقت کے متمدن قوموں کی حالت کا ایک مختصر خاکہ ذہن میں رکھ لیا جائے، اُس وقت عرب کے علاوہ یہ قومیں زمین کے آباد حصے پر حکمراں اور اپنے اپنے مذہب و تہذیب کی اجارہ دار تھیں:

روم - فارس - ہندوستان - یورپ - چین، جن میں یہ مذاہب موجود تھے: عیسائیت

- مجوسیت- ویدک دھرم- بدھ مت- یہودیت۔

فارس:

یہ عرب کے پڑوسی اور دنیا کی دوسری بڑی قوت تھے۔ یہاں ساسانی خاندان فرماں رواں تھا۔ شاہ گشتاشپ کے عہد میں زرتشت پیدا ہوا۔ اُس نے آگ کی پرستش کو ذریعۂ نجات بتایا، خیر وشر کے دو الگ الگ خالق: 'یزداں' و 'اہرمن' بتائے۔ یہ اعتقاد بجائے خود شرک سے آلودہ تھا، بعد کی بدعتی ترقیات نے اسے اور زیادہ گندہ کر دیا۔ باپ کا بیٹی سے، بھائی کا بہن سے نکاح کر لینا، اُن کے یہاں جائز تھا۔

اخیر میں مزدک نام کا ایک شخص پیدا ہوا جس نے زر، زمین، زَن کو ہر شخص کی مشترکہ ملکیت قرار دیا۔ اِس کی وجہ سے عیاشی بدافعالی خواص سے لے کر عوام تک میں پھیل گئی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اہلِ ایران متاہل زندگی کے بجائے مجرد رہنا پسند کرنے لگے۔ نوشیرواں نے اس گندگی کو بزورِ شمشیر ختم کرنے کی کوشش کی اور بظاہر کامیاب بھی ہوا، مگر جو آوارگی گھٹی میں پلا دی گئی تھی وہ نہ جا سکی۔

بادشاہ ووالیان کو سجدہ کیا جاتا، رؤسا اور اُمرا کو بڑے بڑے جرم پر بھی سزا نہیں دی جاتی، شراب خوری عام تھی، مطلب برآری کے لیے خوں ریزی وقتل کوئی جرم نہیں تھا۔ حیرت ہے ایران کا ضرب المثل عادل نوشیرواں تختِ حکومت حاصل کرنے کے لیے ہزاروں عزیزوں، ملکی عہدے داروں اور دوسرے لوگوں کا بلا دریغ خون بہاتا ہے؛ لیکن یہ خوں ریزی بھی اس کی عدل گستری کو داغدار نہ کر سکی۔ مزدور، کسان، ناتواں اور نادار کے لیے ایران کی بارگاہِ دادرس میں کوئی گنجائش نہیں تھی۔ جنگ کے موقعوں پر مفتوح قوموں کے ساتھ جو بہیمانہ سلوک ہوتا اُس سے انسانیت کانپ اٹھتی۔

روم:

کسی وقت یہ دنیا کی سب سے بڑی سلطنت تھی؛ لیکن آپس کے اختلافات کی بدولت ۳۲۵ء میں اِس کے دو حصے ہو گئے۔ ایک شرقی دوسرا غربی۔ مشرقی حصہ عرب کے پڑوس شام،

فلسطین، ایشیا کوچک سے لے کر یورپ تک وسیع تھا، جس کے زیرنگیں بڑے بڑے والیانِ ملک تھے۔ عرب کے متعدد سرحدی قبائل باج گزار تھے۔

یہی وہ ملک تھا جس میں مریم عذرا کے لختِ جگر کلمۃ اللہ مبعوث ہوئے؛ لیکن اُن بدنصیبوں نے اُن کی امن وآشتی کے پیغام کا دارورسن سے استقبال کیا، مدتِ عمر کی جدوجہد کے نتیجے میں ۱۲/اشخاص ایمان لائے، ممکن تھا کہ یہی ۱۲/اشخاص متحد ومتفق رہ کر روح اللہ کے پیغامات کو نئی زندگی بخشتے؛ لیکن سوے اتفاق ایک یہودی -جس کا نام پال تھا- منافقانہ عیسائیت میں داخل ہوا اور اُس نے عیاری سے عیسائیت کی توحیدِ خالص کو تثلیث سے گندہ کر دیا۔ تعلیماتِ عیسوی کے شہد میں بدعات کے زہرِ ہلاہل ملا کر پیروانِ مسیح کو اِس طرح ہلاک کر دیا کہ اُنھیں شعور تک نہ ہوا۔

کتنا بڑا ستم ہے جس نے دنیا کو یہ سبق پڑھایا کہ اگر کوئی تمھارے ایک رخسار پر طمانچہ مارے تو دوسرا بھی تم اس کے سامنے کر دو۔ اُس معلمِ امن وصلح کے پیروؤں نے سفاکیوں میں دنیا کی تمام ریکارڈ توڑ ڈالے۔ اسقفِ اعظم کے عہدے کو حاصل کرنے کے لیے سیکڑوں خونِ ناحق کیے جاتے۔ خاص گرجاؤں میں بھی کشت وخون سے نہیں چوکتے۔ حضرتِ عیسیٰ، حضرتِ مریم اور حواریوں کے مجسمے بنا کر پوجے جانے لگے۔ پادریوں کے سامنے اقرارِ گناہ کر کے گناہ سے پاک ہو جانے کے عقیدے نے جرائم کے بے خوف ارتکاب کا غیر مختتم سلسلہ قائم کر دیا۔ پادریوں، بطریقوں کو سجدے کیے جاتے۔ مرنے کے بعد اُن کی قبریں پوجی جاتیں، رُہبانیت، تجرُّد، علائق دنیوی سے کنارہ کشی لازمِ مذہب بنا لیا گیا۔ کنواری بتول کی سنت کے احیا کے نام پر گرجا کی خدمت کے لیے کنواری عورتیں رکھی جانے لگیں، جنھیں 'نَنْ' کہا جاتا ہے، گرجا کے مقدس مذہبی پیشوا اُن کنواریوں کے ساتھ جو رنگ رلیاں مناتے ہیں اُس سے معبد کے در ودیوار پناہ مانگتے۔

یہود:

موسیٰ کلیم اللہ علیہ الصلاۃ والسلام کی تعلیمات کی اتباع کے مدعی یہودی بھی دنیا کے مختلف حصوں میں منتشر طور پر پھیلے ہوئے تھے، مگر ان کا قوی ترین جتھا فلسطین میں تھا، جو اسی روم کا ایک صوبہ تھا، جب سے دنیا قائم ہوئی۔ آج تک اِس سے زیادہ بدنصیب دوسری قوم صفحۂ ارض پر نہیں

پیدا ہوئی۔ اِنھیں ہدایت کے لیے الواح تورات ملیں، کھانے کے لیے آسمان سے منّ وسلویٰ نازل ہوا، پینے کے لیے پتھر کی چھاتی سے چشمے اُبلے، عصاے کلیم اِن کا حامی بنا، یدِ بیضا اِن کی تاریک قلوب کو روشن کرنے کے لیے چمکا؛ لیکن بایں ہمہ اِن بدبختانِ ازل کے حصے میں خدا کی لعنت اور غضب کا طوق ہی رہا۔

تعلیماتِ موسوی کو پسِ پشت ڈال کر، دین میں ہزاروں اختراعات کیں۔ حدودِ الٰہیہ میں تعدّیاں کیں، فرعون اور گئوشالہ کی خدائی سے نجات پانے کے بعد عزیر کو خدا کا بیٹا بنا دیا، انبیاے کرام کا خون بے دریغ بہایا، خوں ریزیوں، درندگیوں، فرقہ بندیوں میں ہمیشہ منہمک رہے، اپنے عیسائی دشمنوں کو آگ میں زندہ جلانے سے بھی نہیں چوکتے، عیسائیوں کے قتل کے شوق میں مجوسیوں کی فوج میں بھرتی ہو کر لاکھوں عیسائیوں کو تہ تیغ کیا۔ سود خوری، قمار بازی، زر اندوزی، افترا پردازی، کذب گوئی، بخل وحرص، بزدلی، اوہام پرستی، جادوگری اِن کا طرۂ امتیاز بن چکا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جس قوم کے آباوجداد نے جالوت اور عمالقہ کے نخوت وغرور کو پیوندِ خاک کیا تھا، وہ کبھی بخت نصر کے ہاتھوں پامال ہوئی، کبھی خردوش کے ہاتھوں انتقامِ ربانی کا نشانہ بنی اور آخر میں رومیوں نے اُن کی عظمت ووقار کے بچے کھچے نشان کو بھی ملیامٹ کر کے انھیں ذلت ورسوائی کے ساتھ در بدر ٹھوکریں کھانے پر مجبور کر دیا، جب کہ اُن کی قبلہ گاہ سب سے مقدس ''معبد ہیکلِ سلیمانی'' کو کھدوا کر اُس کو کوڑا کرکٹ پھینکنے کی جگہ بنا دیا۔

ہنود:

یہ مذہب آج کی طرح اُس وقت بھی ہندوستان کے طول وعرض میں پھیلا ہوا تھا، جس کتاب کو یہ الہامی مانتے ہیں اس کا نام وید ہے۔ یہ چار ہیں: رِگ وید، شام وید، اتھر وید، یجر وید۔

اِس مذہب کو اپنی قدامت پر بہت ناز ہے؛ لیکن مذہب کا کمال قدامت نہیں؛ بلکہ ملک وقوم کی اخلاقی وروحانی، عمرانی، سیاسی، سماجی اصلاح ہے۔ تو ہر منصف بلا جھجک کہنے پر مجبور ہے کہ اِس مذہب کی جتنی تاریخ معلوم ہے اُس کی رو سے یہ مذہب اُس جوہر سے ہمیشہ کورا رہا۔ شرک ابتدا ہی سے جزءِ ایمان رہا، اصنام پرستی مدتِ مدید سے چلی آرہی ہے، توہّم پرستی، بدشگونی اِس کی خمیر میں داخل ہے۔ بعد میں ذات پاک کی تفریق نے اِس کی رہی سہی وقعت بھی کھودی۔ برہمن اور

اونچی ذات والوں کے مقابلے میں شودروں کی وہ حیثیت بھی نہ رہ گئی تھی جو حیوانات کی تھی، شودر عورت سے زنا کرنا کوئی جرم نہ تھا؛ لیکن شودر کسی اونچی ذات والے کو چھولے تو اُس کی سزا موت تھی۔ شودر اگر کسی اونچی ذات والے کو مارے تو اعضا کاٹ لیے جاتے، گالی دیتا تو زبان نکال لی جاتی۔ اگر اونچی ذات والے کو تعلیم دینے کا دعویٰ کرے تو کھولتے ہوئے تیل سے منہ بھون دیا جاتا۔ شراب نوشی، قمار بازی عام تھی۔

تناسخ کے قائل تھے۔ تناسخ کے چکر سے روح کو نجات دینے کے لیے جسم کو طرح طرح کی ایذائیں دینا، آبادی چھوڑ کر جنگلوں کی جھاڑیوں، پہاڑیوں کے غاروں میں تپسیا کرنے کو انسانیت کا مقصد تخلیق جانتے تھے۔

چاند، سورج، زمین، درخت، پتھر، دریا، حیوانات کی پرستش کرنا عبادت تھا۔ حد یہ کہ شیو اور اس کی تقلید میں دوسرے مادر زاد ننگے رہنے والے سادھوؤں کے عضو تناسل کی بے محابا پوجا ہوتی تھی؛ بلکہ بعض بعض فرقے والے ننگی عورتوں اور عورتیں ننگے مرد کی پوجا کرتی تھیں۔ مردانہ وزنانہ اعضا کے اتصال کی ہیئت کذائیہ کی مورتی عام طور پر پوجی جاتی تھی۔

عورتوں کو جوؤں میں ہار جاتے، ایک عورت کے کئی کئی شوہر ہوتے۔ 'ستی' اور ''جوہر'' کے ظالمانہ رسم معیارِ غیرت وحمیت تھی۔ بعض تہواروں پر شراب کے نشے کی سرمستی میں ماں، بیٹی بہن، اپنی پرائی جو بھی مل جاتی اُس سے اپنے جذبۂ شہوانی کی تکمیل کرنا بڑے پُنّ کا کام سمجھتے۔ عورتیں بیچی جاتیں۔ اونچی ذات والوں کے لیے الگ اور نیچی ذات والوں کے لیے الگ قوانین ہوتے۔ نیچی ذات والے تعلیم وتربیت، تمدن وعمران حتیٰ کہ دھرم ودھارمک باتوں سے دور اور محروم رکھے جاتے۔ شودر وید سن نہیں سکتے تھے اور اگر سن لے تو اُس کے کان میں سیسہ پلانے کا حکم ہوتا۔ یہ وہ اصول تھے جن پر آریہ ورت کی راج نیت اور دھرم کی بنیادیں قائم تھیں۔

بدھ:

کپل وستو کا راج پاٹ چھوڑ کر گوتم بدھ آتما کی مکتی کی تلاش میں جنگلوں، پہاڑوں میں مارے مارے پھرے اور جیسا کہ اُن کا بیان ہے:

''گیا میں پیپل کے درخت کے نیچے دُرمقصود پالیا۔''

لیکن اپنے پیروؤں کے لیے کیا چھوڑا؟ بدھ مت کے سفینے اس سے خالی نظر آتے ہیں۔ ممکن ہے اُنھوں نے کوئی ٹھوس تعلیم دنیا کو دی؛ لیکن اُن کے بعد اُن کی چیلوں میں اتنے زبردست اختلافات پیدا ہوئے کہ آج تک یہ معلوم کرنا ناممکن رہا کہ ان کی اصلی تعلیم کیا تھی؟ مشہور تو یہی ہے کہ اُنھوں نے قوم کو بت پرستی سے روکا تھا؛ مگر آج کا بدھشٹ خود ان کے مجسمے کی پرستش کر رہا ہے۔

یوروپ، افریقہ، چین، جہاں نظر ڈالیے اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ کہیں کوئی تمدن نہیں اور اگر ہے تو ایسا کہ جس کی سفاکی سے درندے الامان الحفیظ پکاریں۔ کہیں کوئی مذہب نہیں، اگر ہے تو ایسے خرافات کا مجموعہ کہ جنھیں سن کر انسانیت شرم سے پانی پانی ہو جائے۔ انسان نے اپنی خودغرضیوں، بوالہوسیوں کو مذہب کا نام دے رکھا تھا۔ ہر قوم دوسری قوم کے خون کی پیاسی تھی۔ ہر قبیلہ دوسرے قبیلے سے برسرِ پیکار تھا۔ انسان کے دل سے انسان کی عظمت اٹھ چکی تھی۔ ہر شخص حبِ جاہ، نفسی برتری کے لیے دوسرے سے دست بگریباں تھا۔ شرافت، اعلیٰ اخلاق، باہمی ہمدردی، انسانیت کا درد، عصمت وعفت، تزکیۂ نفس، خدا پرستی، مظلوموں، بے کسوں کی یاوری، داد خواہی، فریادرسی دنیا سے مٹ چکی تھی۔

عرب کی حالت:

آفتابِ رسالت جس اُفق سے طلوع ہونے والا تھا، خود وہ دنیا کے دوسرے خطوں سے کم تاریک نہ تھا، حضرت خلیل اللہ علیہ الصلاۃ والسلام نے 'وادیِ غیر ذی زرع' میں اپنے لختِ جگر کو آباد کر کے بیت اللہ کی تعمیرِ نو اس لیے کی تھی کہ لوگ اس مرکز سے وابستہ رہ کر وحدہٗ لاشریک کی عبادت کریں؛ لیکن امتدادِ زمانہ سے بدعات کی اختراع ہوتی گئی اور رفتہ رفتہ یہ آندھی اتنی تیز ہوئی کہ ملتِ ابراہیمی کا چراغ گل ہو گیا۔ جس زمانہ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پیدا ہوئے عرب میں مختلف مذاہب پھیلے ہوے تھے۔ دہریت، شرک، یہودیت، مجوسیت، نصرانیت۔

دہریت کی بنیاد اِس پر قائم ہے کہ خدا کا کوئی وجود نہیں، سارے انقلابات پر زمانہ اثر انداز ہے۔ نہ قیامت ہے نہ اعمال کی جزا وسزا ہے۔ اُنھی کے اعتقاد کی ان آیات میں حکایت ہے:

﴿وَقَالُوْا مَا هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَنَحْیَا وَمَا یُهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ.﴾

اُن لوگوں نے کہا کہ دنیا کی زندگی کے سوا اور کوئی زندگی نہیں، از خود مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہمیں مارنے والا زمانہ ہی ہے۔ (سورۂ جاثیہ: ۲۴)

کچھ خدا کے قائل تھے؛ لیکن قیامت کے منکر تھے۔ اُن کے اعتقادات کی تقریر و تردید اس آیتِ کریمہ میں مذکور ہے:

﴿قَالَ مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَهِیَ رَمِیْمٌ قُلْ یُحْیِیْهَا الَّذِیْ اَنْشَاَهَا اَوَّلَ مَرَّةٍ﴾

اس نے کہا: گلی ہوئی ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا؟ تم بتا دو وہی دوبارہ پھر زندہ کرے گا جس نے پہلی بار بنایا تھا۔ (سورۂ یٰسٓ: ۷۸۔۷۹)

بعض خدا کے بھی قائل تھے اور قیامت کے بھی؛ لیکن نبوت کے منکر تھے، اُن کا خیال تھا کہ انسان پیغمبر نہیں ہوسکتا، پیغمبر ہونے کے لیے فرشتہ ہونا ضروری ہے۔ اُن کے اعتقاد کا ذکر اس آیت میں ہے:

﴿وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ یَاْكُلُ الطَّعَامَ وَیَمْشِیْ فِی الْاَسْوَاقِ.﴾

اُن لوگوں نے کہا یہ کیسا رسول ہے؟ جو کھاتا پیتا ہے اور بازاروں میں گھومتا ہے۔

(سورۂ فرقان: ۷)

اور فرمایا ہے:

﴿قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا﴾ (سورۂ اسریٰ: ۹۴)

اُنھوں نے کہا: کیا اللہ نے بشر کو رسول بنا کر بھیجا؟

لیکن مذکورہ بالا اعتقادات رکھنے والے خال خال تھے، اکثر بت پرست تھے۔ یہ بت پرست خدا کے قائل تھے، بتوں کی پرستش کو خدا کی رضا کا ذریعہ جانتے تھے، قرآنِ کریم اِن کے خیالات کو اِن الفاظ میں نقل فرماتا ہے:

﴿مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَآ اِلَی اللّٰهِ زُلْفٰی.﴾ (سورۂ زمر: ۳)

ہم بتوں کو صرف اِس لیے پوجتے ہیں کہ وہ ہمیں خدا سے قریب کریں۔

عرب میں بت پرستی کی بنیاد ربیعہ بن حارثہ نے ڈالی تھی، جو عمرو بن لحی سے مشہور ہے،

قبیلۂ خزاعہ کا مورثِ اعلیٰ یہی ہے۔

پہلے گزر چکا کہ عمرو نے جرہم کو مکے سے نکال کر خود کعبے کا متولّی بن بیٹھا تھا، ایک مرتبہ شام گیا، وہاں لوگوں کو بت پوجتے دیکھ کر پوچھا:

انہیں کس لیے پوجتے ہو؟

بت پرستوں نے بتایا:

یہ ہماری حاجتیں پوری کرتے ہیں، دشمنوں پر فتح دیتے ہیں، قحط میں پانی برساتے ہیں۔

عمرو نے کہا: ایسا ہے تو مجھے بھی کچھ بت دے دو۔

اُن لوگوں نے چند بت دے دیے جن میں ہُبل نامی بت بھی تھا۔ عمرو نے ان بتوں کو کعبے کے اردگرد نصب کر دیا۔

کعبے میں بتوں کی پرستش دیکھ کر تمام عرب اِس وبا میں مبتلا ہو گئے، حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا ہے کہ عمرو بن لحی کی آنتیں آگ میں گھسیٹی جاتی ہیں، یہ بت پرستی کی بنیاد ڈالنے کی سزا ہے۔

تین سو ساٹھ بت کعبے میں نصب تھے، جن میں حضرتِ ابراہیم، حضرتِ اسماعیل علیہما الصلاۃ والسلام کے مجسمے بھی تھے۔ دور دراز سے حج کے لیے آنے والے افراد مکے سے پتھر لے جاتے اور اُنھیں کعبے کے بتوں کی شکل پر تراش تراش کر نصب کر لیتے اور اُنھیں پوجتے۔

ہُبل:

اِن بتوں میں سب سے بڑا ہبل تھا۔ انسانی شکل کا تھا جسے سرخ پتھر تراش کر بنایا گیا تھا۔ کعبے کی چھت کے بیچوں بیچ نصب تھا، لڑائیوں میں قریش اِس کی جَے پکارتے، اِس پر قربانیاں چڑھاتے، حتیٰ کہ انسان کی بھی۔

ہبل کے آگے فال کے تیر رکھے ہوئے تھے جن سے کسی کام کے کرنے سے پہلے فال نکالا کرتے تھے، یہ خاص قریش کا بت تھا۔

مَنات:

یہ سب سے قدیم بت تھا، قدید کے پاس مکے مدینے کے مابین مدینے سے سات میل کے فاصلے پر لبِ سمندر نصب تھا، یہ خزیمہ اور ہذیل کا مخصوص بت تھا؛ لیکن قریش بھی اِس کی پرستش کرتے تھے، مدینے کے باشندوں میں اوس وخزرج کو بھی اِس سے عقیدت تھی، اِسی پر قربانیاں چڑھاتے، حج کا احرام یہیں پر کھولتے۔

عزّیٰ:

یہ بت خاص بنوغطفان کا تھا، اُنھی کے باغ میں عزیٰ نام [کے] درخت کے پاس نصب تھا، قریش بھی اِسے پوجتے تھے، قربانیاں کرتے تھے، برکت کے لیے اپنا نام عبد العزیٰ رکھتے۔

لات:

یہ بنوثقیف کا خاص بت تھا، یہ طائف میں نصب تھا۔ طائف والے اِسے کعبے کے برابر مانتے تھے، حجاج اِس پر اپنے ستو گوندھا کرتے تھے۔ بنی ثقیف میں اِسی نام کا ایک شخص مر گیا، کسی نے اڑا دیا کہ وہ مرا نہیں؛ بلکہ اپنے ہم نام پتھر میں حلول کر گیا ہے، اِس بنا پر لوگ اِسے پوجنے لگے۔ ثقیف کے علاوہ قریش اور کنانہ بھی اِس کی پوجا کرتے تھے، اپنے زعم میں اِن تینوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے اور قیامت کے دن اِن کی شفاعت کی امید کرتے تھے، طواف کے وقت اِن کے نام کا ورد کیا کرتے تھے۔

اساف ونائلہ:

یہ قریش کے خاص بت تھے، اِن کے پاس قریش قربانیاں کیا کرتے تھے۔ مشہور تھا کہ یہ دونوں پہلے زندہ انسان تھے، اساف مرد، نائلہ عورت تھی۔ اِن دونوں نے حرم میں بدکاری کی، اُسی کی سزا میں مسخ ہو کر پتھر ہو گئے۔

اِن کے علاوہ: وُدّ-سواع-یغوث-یعوق-نسر وغیرہ نامی گرامی بتوں میں سے تھے، چھوٹے چھوٹے قبیلے کے الگ الگ سینکڑوں بت تھے۔ بت پرستی کے اِس عام تسلط کے باوجود

سب اِس بات کے معتقد تھے کہ اِن سب سے بالاتر ایک اور ہستی ہے جو تمام عالم کی خالقِ حقیقی اور عالم کے تمام افراد پر متصرف ہے، جو معبودِ اعظم ہونے کے ساتھ ساتھ قدرت وطاقت میں اُن تمام معبودوں سے بڑھی ہوئی ہے۔ جسے وہ اپنی زبان میں اللہ کہتے تھے، اُن کے اِس عقیدے کو اِن آیات میں بیان فرمایا گیا ہے:

﴿وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضَ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ، لَيَقُوْلُنَّ اللهُ فَأَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ؟﴾

اور اگر آپ اُن کافروں سے پوچھیں کہ کس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور چاند و سورج کو کس نے تابع دار کیا؟ تو یقیناً وہ کہیں گے: اللہ۔ یہ کدھر بہکے جا رہے ہیں؟ (سورۂ عنکبوت:۶۱)

﴿وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللهُ.﴾

اور اگر تم اُن سے پوچھو گے کہ آسمان سے کس نے پانی برسایا اور اُس پانی سے زمین کو مردہ ہونے کے بعد زندہ کیا؟ تو لوگ یقیناً کہیں گے: اللہ۔ (سورۂ عنکبوت: ۶۳)

﴿فَإِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ فَلَمَّا نَجّٰهُمْ إِلَى الْبَرِّ، إِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ﴾

جب کشتی پر چڑھتے ہیں تو سچے دل سے خدا کو پکارتے ہیں، پھر جب خدا نجات دے کر خشکی کی طرف پہنچا دیتا ہے تو شرک کرنے لگتے ہیں۔ (سورۂ عنکبوت: ۶۵)

صلحِ حدیبیہ کے موقع پر جب صلح نامہ لکھا جانے لگا، آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرتِ علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا:

''لکھو! بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔''

قریش کے نمائندے سہیل بن عمرو نے یہ اعتراض کیا:

أَمَّا الرَّحْمٰنُ فَوَاللهِ مَا أَدْرِيْ مَا هُوَ، وَلٰكِنِ اُكْتُبْ: بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ، كَمَا كُنْتَ تَكْتُبُ.

خدا کی قسم! رحمٰن کو ہم نہیں جانتے؛ لیکن ''بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ'' لکھو۔ جیسا کہ لکھا کرتے

تھے۔

دوسری روایت میں ہے:

میں رحمٰن رحیم کو نہیں جانتا، بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ لکھو۔

سہیل بن عمرو کا اللہ کی قسم کھانا اور بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ لکھوانا اور اُس کو رواجِ عام بتانا، اِس بات کی دلیل ہے کہ اہلِ عرب بتوں کی پرستش کے ساتھ ساتھ ایک معبودِ اعظم کے قائل تھے۔

ستارہ پرستی:

بت پرستی کے علاوہ عرب کے بہت سے قبائل میں ستارہ پرستی بھی رائج تھی، یمن کے باشندے حمیر آفتاب کو پوجتے تھے، بنی کنانہ 'ماہتاب پرست' تھے، بنی حمیر 'وبران' کو، [بنی] قیس 'شعریٰ' کو، [بنی] اسد 'عطارد' کو، [بنی] لخم اور جذام 'مشتری' کو پوجتے تھے۔

نصرانیت:

یہ مذہب بھی عرب میں جگہ جگہ زمانۂ دراز سے پھیلا ہوا تھا، چناں چہ قبائلِ عرب میں ربیعہ، غسان، لخم، جذام، بہرا، بلی، قیس، تغلب، یہ سب عیسائی قبائل تھے۔ قضاعہ کے بھی کچھ افراد اُس سے متأثر تھے، نجران کا پورا علاقہ نصرانی تھا، خود مکے میں ورقہ بن نوفل زبردست عیسائی عالم موجود تھے، اِن کے علاوہ بھی متعدد اشخاص نے شام جا کر انجیل کی تعلیم حاصل کی تھی۔ عبید اللہ بن جحش، عثمان بن حارث بھی عیسائی تھے۔

یہودیت:

خیبر کی پوری آبادی یہودی تھی۔ حِمْیَر، کنانہ، بنی حارث بن کعب، کندہ، تمام قبائل یہودی تھے۔ مدینۂ طیبہ میں قریظہ، بنی نضیر، بنی قینقاع یہودی تھے۔ اقتصادی حیثیت سے پورے مدینۂ طیبہ پر اُن کا قبضہ تھا، عرب کا مشہور شاعر سموال بن عادیا- جس کی وفاداری اب تک ضرب المثل ہے- یہودی تھا۔

یہودیت اور نصرانیت کی بنا پر اہلِ کتاب کی مرویات پورے عرب میں پھیلی ہوئی تھیں۔ چناں چہ قرآنِ کریم میں بنی اسرائیل کے قصص جب مذکور ہوئے تو مشرکین نے یہ گمانِ فاسد

کیا کہ انھیں کوئی یہودی یا عیسائی سکھاتا ہے۔

مجوسیت:

ایران، عرب کا پڑوسی ملک تھا۔ پورا ایران آتش پرست تھا، اِس کے اثر سے کہیں کہیں عرب میں بھی آتش پرستی پائی جاتی تھی۔ قبیلۂ تمیم مجوسی تھا؛ اِسی وجہ سے اُس قبیلے کے رئیس نے -جس کا نام زرارہ تھا- اپنی بیٹی سے شادی کر لی تھی۔ اپنی بیٹی سے شادی کرنا عرب کی غیرت کے منافی تھا؛ اس لیے بعد میں اِس پر نادم ہوا، اقرع بن حابس رضی اللہ عنہ- جو بعد میں مسلمان ہوئے- پہلے مجوسی تھے۔

اخلاقی حالت:

اخلاقی حیثیت سے اہلِ عرب کی اکثریت بہت گری ہوئی تھی۔ ڈاکہ زنی، چوری، غارت گری، بے حیائی، شراب نوشی، قمار بازی، زنا کاری، دختر کشی، سفاکی، بے رحمی، درندگی، بہیمیت، سود خوری، دجل وفریب اُن کی گھٹی میں پلا دی گئی تھی۔ عوام تو عوام بڑے بڑے سربرآوردہ رؤسا میں بھی یہ عیوب پائے جاتے تھے، پھر بھی وہ ریاست کی مسند پر بیٹھے ہوئے تھے، جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

دینِ حنیف:

کفر ومعصیت کی اس گھنگھور گھٹا میں کچھ سلیم الطبع افراد بھی تھے، اُن کے دلوں میں اِس طوفانِ بدتمیزی کے خلاف شدید نفرت کا جذبہ تھا۔ جن میں ورقہ بن نوفل، زید بن عمرو بن نفیل، عثمان بن حویرث، عبید اللہ بن جحش کا نام تاریخوں میں مذکور ہے۔ یہ سب قریش کے معزز افراد میں سے تھے۔

- ورقہ بن نوفل اُم المؤمنین حضرتِ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے چچا کے لڑکے تھے۔
- زید بن عمرو بن نفیل حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ کے چچا تھے۔
- عبید اللہ بن جحش حضرتِ حمزہ کے بھانجے تھے۔
- عثمان بن حویرث عبد العزیٰ کے پوتے تھے۔

یہ لوگ ایک بار کسی میلے میں تھے، بتوں کی پوجا دیکھ کر دل میں خیال آیا کہ یہ کیا لغویت ہے کہ ہم ایک پتھر کو سجدہ کرتے ہیں، جو نہ دیکھتا ہے، نہ سنتا ہے، نہ نقصان پہنچا سکتا ہے نہ فائدہ۔ اِس خیال کے آتے ہی بت پرستی چھوڑ کر دینِ حق کی تلاش میں نکل پڑے۔

زید دینِ حق کی جستجو میں شام پہنچے۔ یہودیوں کے ایک حِبرُ سے ملے، اُس سے اُس کے دین کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہونے کے بعد کہا:

''ہوسکتا ہے کہ تمھارا دین قبول کرلوں۔''

تو اس یہودی حِبر نے کہا:

''اگر خدا کا غضب مول لینا چاہتے ہو تو ہمارا دین اختیار کرو۔''

زید نے کہا:

''میں خدا کے غضب ہی سے تو بھاگا ہوں، حتی الوسع خدا کا غضب مول نہیں لے سکتا، کوئی دوسرا دین بتاؤ۔''

اس نے کہا:

''یہ دین صرف دینِ حنیف دینِ ابراہیم ہے، وہ نہ یہودی تھے نہ نصرانی، وہ صرف اللہ کی عبادت کرتے تھے۔''

اِس کے بعد زید ایک عیسائی پادری سے ملے، وہاں بھی وہی گفتگو ہوئی، اس نے کہا:

''اگر خدا کی لعنت چاہتے ہو تو نصرانیت اختیار کرلو۔''

اِنھوں نے جواب دیا:

''خدا کی لعنت سے بچنے کے لیے ہی تو بھاگ رہا ہوں، اچھا کوئی اور دین بتاؤ۔

اس نے بھی یہی کہا:

''دینِ حنیف دینِ ابراہیم کو اختیار کرو۔''

جب یہودی، نصرانیوں، پادریوں سے دینِ حنیف کا پتہ پا چکے تو شام سے واپس آئے اور دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا:

''اے اللہ! میں تجھے گواہ بناتا ہوں کہ میں ملتِ ابراہیم پر ہوں۔''

اِسی طرح ایک مرتبہ کعبہ سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے، تب قریش سے مخاطب ہو کر کہ:

''میرے سوا تم میں کوئی دینِ ابراہیم پر نہیں۔''

(بخاری، باب: حدیث زید بن عمرو بن نفیل)

وہ کہا کرتے تھے:

''میرا معبود ابراہیم کا معبود ہے، میرا دین ابراہیم کا دین ہے۔''

(عمدۃ القاری، ج:۸، ص:۳۷)

اور کہا کرتے تھے:

''اے اللہ اگر میں جانتا کہ تو موجودات میں کسی ہستی کی عبادت پسند کرتا ہے تو میں ضرور اس کی پرستش کرتا۔''

یہ ہتھیلیوں پر سجدے کیا کرتے۔ بتوں کے نام پر جانور ذبح کرنا عرب میں عام تھا، زید نہ بتوں کے نام جانور ذبح کرتے اور نہ بتوں کے نام پر ذبح کیا ہوا جانور کا گوشت کھاتے۔

جب کسی شقی کو دیکھتے کہ وہ اپنی بچی کو زندہ درگور کرنے کے لیے لے جا رہا ہے تو اُس سے لے لیتے، اس کی پرورش کرتے، جب وہ ہاتھ پاؤں کی ہو جاتی، اس کے باپ سے کہتے:

''چاہو تو اپنی بچی لے جاؤ، چاہو تو میرے پاس ہی رہنے دو۔''

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے پانچ سال قبل جس سال کعبہ کی تعمیر ہوئی تھی، اِن کا انتقال ہو گیا، حرا کے نیچے دفن کیے گئے۔

ابنِ سعد نے عامر بن ربیعہ سے نقل کیا ہے:

''زید نے ہمیں بتایا تھا کہ میں قوم کے خلاف ملتِ ابراہیم و اسماعیل کا متبع ہوں، مجھے بنی اسماعیل میں سے ایک نبی کا انتظار ہے، میرا اندازہ ہے کہ میں اُن سے نہ مل سکوں گا؛ لیکن اُن کی تصدیق کرتا ہوں اور اُن پر ایمان لاتا ہوں اور گواہی دیتا ہوں کہ وہ یقیناً نبی ہیں۔ اگر تمھاری زندگی وفا کرے اور ان سے تم کو شرفِ ملاقات حاصل ہو تو اُن سے میرا اسلام کہہ دینا۔

عامر بن ربیعہ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جب یہ ذکر کیا تو حضور نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا:

''اللہ اُن پر رحم کرے، میں نے جنت میں انھیں دامن گھسیٹتے ہوئے دیکھا ہے۔''

دوسری حدیث میں ہے، حضور نے یہ فرمایا:

''جنت میں اُن کے لیے دو درجے ہیں۔''

ایک اور حدیث میں ہے کہ حضور نے فرمایا:

''قیامت کے دن وہ ایک مستقل اُمت ہوں گے۔''

ورقہ، عبید اللہ بن جحش، عثمان بن حویرث عیسائی ہو گئے تھے۔ اِن میں ورقہ بن نوفل کے بارے میں حدیث میں مذکور ہے۔ حضرتِ ام المؤمنین خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا:

''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ورقہ نے آپ کی تصدیق کی تھی؛ لیکن اعلان نبوت سے پہلے ہی ان کا انتقال ہو گیا۔؟

آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''میں نے انھیں جنت میں سفید لباس پہنے ہوئے دیکھا ہے، اگر وہ اہلِ نار سے ہوتے تو کوئی اور لباس ہوتا۔''

اِسی بنا پر بعض علما نے اُنھیں صحابہ میں شمار کیا ہے اور 'اول المسلمین' اُنھی کو کہا ہے۔

عبید اللہ بن جحش نے بعثت کا زمانہ پایا، پہلے ایمان لایا، اپنے خاندان کے ساتھ حبشہ ہجرت کر گیا، پھر مرتد ہو کر عیسائی ہو گیا اور عیسائیت ہی پر مرا۔

قس بن ساعدہ:

اِن کے علاوہ موحّدینِ عہدِ جاہلیت میں 'قس بن ساعدہ ایادی' کا نام بہت نمایاں طور پر ملتا ہے۔ اِنھوں نے بازارِ عکاظ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد آمد کے سلسلے میں وہ مشہور خطبہ دیا ہے جو شعر و ادب کی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔ اُس وقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی موجود تھے، اُس کا ایک جزیہ ہے:

نَبِيًّا قَدْ حَانَ حِينُهُ وَ أَتَىٰ لَكُمْ أَوَانُهُ فَطُوبَىٰ لِمَنْ اٰمَنَ بِهِ فَهَدَاهُ، وَوَيْلٌ لِمَنْ خَالَفَهُ وَعَصَاهُ.

ایک نبی کی آمد کا زمانہ قریب آ گیا ہے، مبارک باد ہے اُسے جو اُن پر ایمان لایا اور اُنھوں نے اُسے راہ حق دکھائی اور بربادی ہے اُس کے لیے جس نے اُن کی مخالفت اور نافرمانی کی۔

اُمیہ بن صلت:

اِسی طرح اُمیہ بن صلت نے بھی بت پرستی چھوڑ دی تھی اور اُس کے خلاف بہت سے اشعار کہے ہیں، جو اُس کے دیوان میں آج تک موجود ہیں۔ اصابہ میں ہے:

''امیہ نے آسمانی کتابیں پڑھی تھیں، جس سے متاثر ہو کر بت پرستی چھوڑ کر دینِ حنیف قبول کر لیا تھا، یہ غزوۂ بدر تک زندہ رہا، طائف کا رئیس تھا، ہندہ کے باپ عتبہ کا ماموں زاد بھائی تھا، عتبہ جب بدر میں مارا گیا تو اُمیہ نے اُس پر ایک مرثیہ لکھا، ہوسکتا ہے اِس تعصب نے اُسے ایمان سے محروم رکھا ہو، یہ حالت کفر میں مرا۔

اِن کے علاوہ اور بہت لوگ تھے جن کی عقلوں نے اس ہمہ گیر تاریکی میں بھی توحید کی طرف رہنمائی کی۔

چھٹی صدی عیسوی میں آباد دنیا کی مشرکانہ رسوم، سفاکانہ نظامِ حکومت، بہیمانہ تمدن، ننگِ انسانیت، مذہبی تقریبات پکار پکار کر کیا یہ نہیں کہہ رہے تھے:

''ضرورت ہے اور اشد ضرورت ہے کہ اب وہ ہستی تشریف لائے:

- جن کے ہاتھوں میں حضرتِ خلیل اللہ کا بت شکن تبر ہو،
- موسیٰ کا عصائے غضب وجلال ہو،
- جس کے مظہرِ قدرت ہاتھوں میں یوشع کی تلوار ہو،
- جس کے خزانے میں حضرتِ عیسیٰ کی کیمیائی ہو،
- جس کے صحیفۂ قدس میں عرش کو ہلا دینے والی مناجاتیں ہو،
- مملکتِ سلیمان جس کے رکاب میں ہو،
- یحییٰ وزکریا کا ضبط وتحمل جس کا خلقِ عظیم ہو۔''

بعثت

غارِ حرا:

نبوت کسبی چیز نہیں؛ بلکہ یہ عطیۂ ربانی ہے، اپنے فضل سے وہ جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَآءُ﴾

یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔ (سورۂ مائدہ: ۵۴)

اِس کے باوجود وہ جسے دینا چاہتا ہے اُس کے اندر اول روز ہی سے وہ جوہر ودیعت کر دیتا ہے جس کے سہارے وہ اِس بارِ گراں کو اٹھا لیتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس دور جہالت میں پیدا ہوئے تھے، اُس کا ایک خاکہ اوپر گزر چکا۔ جس طوفان میں ساری دنیا بہی جا رہی تھی اُس میں کسی بھی انسان کا بہ جانا کوئی تعجب کی بات نہیں تھی؛ لیکن آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبلِ بعثت کی زندگی پڑھیے! حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی بھی رسومِ جاہلیت میں کوئی حصہ نہیں لیا، نہ کبھی بتوں کو سجدہ کیا، نہ شراب پی، نہ قمار بازی کی، نہ فواحش کے قریب گئے۔

عرب میں افسانہ گوئی کا رواج عام تھا۔ ہر کہ ومہ اِس میں شریک ہوتا، ایک بار آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی افسانہ سننے کے ارادے سے گھر سے چلے؛ لیکن راستے میں ایک جگہ شادی ہو رہی تھی، اُسے دیکھنے کے لیے کھڑے ہوئے، وہیں نیند آ گئی اور صبح تک وہیں سوتے رہے۔

راست بازی، دیانت داری کے بارے میں گزر چکا کہ ساری قوم آپ کو امین کہہ کر پکارتی تھی، یہ سب کچھ اِس لیے تھا کہ قدرت کو ایک دینِ محکم اور شریعت غرّا کی تعمیر کرانی تھی، اِس کے لیے ایسے مقدس اور ستھرے ہاتھوں کی ضرورت تھی جو ہر قسم کے آلودگیوں سے پاک ہوں، جس کے قوائے قدسیہ اُس قادر قیوم کی حفاظت میں ہوں جو ہر غالب سے بڑھ کر غالب ہے۔

ایک انسان جو بال بچے والا ہو، دنیوی کاروبار میں پھنسا ہو، اُس کو نورِ ایزدی کا پتہ معلوم

کر لینا آسان نہیں، وہ بھی اُس حال میں جب گھٹا ٹوپ اندھیری پوری دنیا پر چھائی ہوئی ہو؛ لیکن بایں ہمہ قدرت کو جب کسی سے کام لینا ہوتا ہے تو لے لیتی ہے۔

مکۂ معظّمہ سے منیٰ جاتے ہوئے تین میل کے فاصلے پر بائیں ہاتھ جبل نور ہے، اُس کی چوٹی پر ایک غار ہے جس کا نام ہے غارِ حرا۔ پہاڑ کی دو چٹانوں پر ایک چٹان چڑھی ہوئی ہے، جس سے یہ غار بن گیا ہے۔ پورب جانب دروازہ ہے، دروازے کے باہر تھوڑا سا صحن ہے، صحن کے اتر جانب انتہائی گہری کھائیاں ہیں، جن میں ہرے بھرے درخت رہتے ہیں۔ اور دکھن اور پورب جانب پہاڑ ہیں۔ بہت پُر فضا مقام ہے، وہاں پہنچتے ہی طبیعت میں نشاط پیدا ہو جاتا ہے، اُس غار میں اتنی جگہ ہے کہ ایک شخص کھڑے ہو کے نماز پڑھ سکتا ہے اور ایک شخص بیٹھ کر اور ایک آدمی آرام سے سو سکتا ہے۔

غار کے شمالی مغربی گوشے میں ایک دراڑ ہے، اِتنی کشادہ کہ کروٹ سے آدمی آ جا سکتا ہے، اس دراڑ سے غار کے اندر بہت خوشگوار ہوائیں آتی رہتی ہیں اور کچھ روشنی بھی۔ غار میں شمال کی طرف بیٹھ کر دیکھنے سے کعبۂ مقدس نظر آتا ہے اُسی کو غارِ حرا کہتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم قبلِ بعثت اُسی غارِ حرا میں جا کر ایک ایک مہینے تک خلوت گزیں رہتے۔ اپنے طور پر اللہ عزوجل کی عبادت کرتے۔ اپنے ہمراہ کھانے پینے کا سامان لے جاتے، جب وہ ختم ہو جاتا تو واپس آ کر پھر توشہ لے کر تشریف لے جاتے۔ کبھی کبھی ایک مہینہ تک قیام فرماتے۔ ایسی صورت میں ام المؤمنین حضرتِ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کھانے کا سامان پہنچا دیا کرتی تھیں۔

یہی سلسلہ جاری تھا کہ ایک دن حضرتِ جبرئیلِ امین حاضر ہوئے اور حضور سے عرض کیا:

'پڑھیے!'

حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''میں نہیں پڑھتا۔''

جبرئیلِ امین نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو سینے سے لگا کر طاقت بھر دبوچا، پھر چھوڑ دیا اور عرض کیا: ''پڑھیے۔''

حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اب کی بار بھی فرمایا: ''میں نہیں پڑھتا۔''

یہ سن کر جبرئیلِ امین نے دوبارہ سینے سے لگا کر طاقت بھر دبوچا اور علاحدہ کر کے کہا:

''پڑھیے!''

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''میں نہیں پڑھتا۔''

اس کے بعد تیسری بار جبرئیلِ امین نے سینے سے لگا کر پھر طاقت بھر دبوچا اور علاحدہ کر کے عرض کیا:

﴿اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۚ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ اِقْرَأْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ؕ﴾

پڑھیے! اپنے رب کے نام سے جس نے انسان کو منجمد خون سے پیدا فرمایا۔ پڑھیے اور آپ کا رب بہت کرم والا ہے، جس نے قلم سے علم سکھایا اور انسان کو وہ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔

(سورۂ علق: ۱۔۵)

اب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُسے پڑھا، اِس کے بعد جبرئیلِ امین واپس چلے گئے۔

بعض روایتوں میں ہے:

جبرئیلِ امین نے زمین پر پاؤں سے ٹھوکر ماری جس سے پانی کا چشمہ ابل پڑا، وضو کیا اور دو رکعت حضور کو نماز پڑھائی اور چلے گئے۔

نزولِ وحی کی وجہ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسمِ اقدس پر شدید لرزہ طاری ہو گیا، یہاں تک کہ دونوں شانوں کے درمیان کا گوشت بھی کانپنے لگا، اسی حال میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہاڑ سے نیچے اترے اور گھر تشریف لائے اور گھر والوں سے کہا مجھے کمبل اڑھاؤ! مجھے کمبل اڑھاؤ! آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کمبل اڑھا دیا گیا۔

بعض روایتوں میں ہے کہ جسم پر ٹھنڈا پانی ڈالنے کے لیے فرمایا، لوگوں نے ٹھنڈا پانی ڈالا، تھوڑی دیر کے بعد جب سکون حاصل ہوا تو ام المؤمنین حضرتِ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کو پورا واقعہ سنایا اور فرمایا:

''مجھے اپنی جان کا ڈر ہے۔''

اِس پر حضرتِ خدیجۃ الکبریٰ نے عرض کیا:

''ہرگز نہیں! بخدا اللہ آپ کو رسوا نہ فرمائے گا، آپ صلہ رحمی کرتے ہیں اور بے سہارا کا

بوجھ اٹھاتے ہیں اور نادار کو کما کر دیتے ہیں اور مہمان داری کرتے ہیں اور راہِ حق میں پیش آنے والی مصیبتوں پر لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔''

اِس کے بعد حضرتِ خدیجہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لے کر اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل بن اسد کے پاس لائیں، یہ جاہلیت میں نصرانی ہو چکے تھے، عبرانی خط جانتے تھے، انجیل کو عبرانی میں لکھتے تھے بہت بوڑھے نابینا ہو چکے تھے۔

حضرتِ خدیجہ نے اُن سے کہا:

''اے میرے چچا کے بیٹے! اپنے بھتیجے کی بات سنیے۔

ورقہ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا:

''اے بھتیجے! تم کیا دیکھتے ہو؟''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو کچھ دیکھا تھا بتایا، وہ سب سن کر ورقہ نے کہا:

''یہ وہ ناموس ہیں جو موسیٰ پر اترتے تھے۔ کاش! اُس وقت میں جوان ہوتا، زندہ ہوتا، جب تمھاری قوم تم کو نکالے گی، تو آپ کی بھرپور مدد کرتا۔''

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ورقہ سے پوچھا:

''کیا میری قوم مجھ کو وطن سے نکالے گی؟''

ورقہ نے کہا: ''ہاں! جو تم لائے ہو، جو بھی اُس کی مثل لے کر آیا، تو اس کی قوم نے اُس کے ساتھ یہی معاملہ کیا۔

اِس کے کچھ ہی دنوں کے بعد ورقہ کا انتقال ہو گیا۔

اس کے بعد تین سال تک وحی کا سلسلہ بند رہا۔

غارِ حرا میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کس طرح عبادت کرتے تھے، عبادت صرف غور و فکر اور مراقبہ تھا؟ یا قول و فعل سے بھی تھی؟ علما کے دونوں قول ہیں۔ راجح یہ ہے کہ دونوں طرح عبادت تھی۔

غور و فکر، مراقبہ بھی کرتے تھے اور کچھ پڑھتے بھی تھے، کچھ ارکان بھی ادا کرتے تھے، اور یہ عبادت کسی شریعت کی اتباع میں نہیں تھی، کسی سے سیکھ کر نہیں کرتے تھے؛ بلکہ اللہ عزوجل آپ کے دل میں جس طرح ڈالتا اُس طرح کرتے تھے، یہ دوسری بات ہے کہ واقع میں ملت

ابراہیمی کے مطابق تھی۔

عام طور پر ''ما انا بقاری'' کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ ''میں پڑھا ہوا نہیں''، یہ ترجمہ بھی غلط نہیں۔ مراد یہ ہے کہ رسمی طور پر بظاہر میں پڑھا ہوا نہیں؛ لیکن عرب کے محاورے اور یہاں کی حالت کے مطابق یہی ترجمہ بہتر ہے جو میں نے کیا یعنی: ''میں نہیں پڑھتا۔''

نحو کی کتابوں میں لکھا ہے کہ جب اسم فاعل کے شروع میں ''مائے نافیہ'' ہوتا ہے تو حال یا استقبال کے معنی میں ہوتا ہے۔ چوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُس وقت استغراقی کیفیت میں تھے، ذاتِ باری تعالیٰ کے صفات کے مشاہدے میں مستغرق تھے، دنیا و مافیہا سے بے تعلق، اِس عالم میں جب جبرئیلِ امین نے کہا: پڑھیے! تو اِس شہودی کیفیت میں جو لذتِ وارفتگی تھی اور پڑھنے (کے سبب) اُس میں خلل واقع ہوتا؛ اس لیے فرمایا: ''میں نہیں پڑھتا۔''

حدیث میں یہ کلمات وارد ہیں:

فَأَخَذَنِيْ فَغَطَّنِيْ حَتّٰى بَلَغَ مِنِّي الْجُهْدُ.

میں نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے:

''جبرئیل نے مجھے پکڑا اور طاقت بھر دبوچا۔''

اس ترجمے کو بہت سے معاندین نے کہا ہے کہ غلط ہے، یہ ان کی خام کاری ہے۔

''جهد''، جیم کے فتحہ کے ساتھ بھی ہے اور ضمہ کے ساتھ بھی، اس کے معنی یہاں مشقت یا طاقت ہے اور یہ ''بلغ'' کا فاعل بھی ہوسکتا ہے اور مفعولِ بہ بھی، جس کی پوری تفصیل نزہۃ القاری جلد اول میں مذکور ہے۔ جب اِس کو ''بلغ'' کا فاعل بنا دیں گے تو بلغ کا مفعولِ محذوف ''مبلغه'' ہوگا، اب ترجمہ یہ ہوگا:

''فرشتے نے مجھے دبوچا یہاں تک کہ میری طاقت اپنے حد کو پہنچ گئی۔''

اور جب ''الجهد'' کو منصوب پڑھیں گے یہ ''بلغ'' کا مفعولِ بہ ہوگا اور ''بلغ'' کا فاعل ضمیرِ مستتر ہوگی، جس کا مرجع ''غط'' ہے، جس پر ''غطنی'' دلالت کرتا ہے۔ اب معنی یہ ہوں گے:

''فرشتے نے مجھے دبوچا، یہاں تک کہ اُس کا دبوچنا میری غایت کو پہنچ گیا۔''

اِن دونوں کا حاصل یہ ہوا کہ فرشتے نے مجھے میری طاقت بھر دبوچا۔

لیکن یہاں ایک توجیہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ''مِنِّیْ'' کے ''مِنْ'' کو تعلیل کے لیے لیں اور چوں کہ نفسِ ذات کسی چیز کی علت نہیں ہوسکتی؛ اِس لیے ''غط'' مضاف محذوفِ ہوگا، یعنی ''لِأَجَلِ غَطِّیْ.''

''الجھدُ'' پر الف لام عہد کا مانو، اِس سے مراد ''جہدِ ملک'' ہو۔

اب ''الجھدُ'' کے ضمہ کی روایت کا معنی یہ ہوا:

''میرے دبوچنے کہ وجہ سے فرشتے کی طاقت اپنے حد کو پہنچ گئی۔''

اور دوسری کی بنا پر جب ''الجھدُ'' کو ''بلغ'' کا مفعولِ بہ مانیں گے، تو ''بلغ'' کی ضمیرِ مستتر فاعل کا مرجع ''ملک'' ہوگا۔ اب معنیٰ یہ ہوا:

''میرے دبوچنے کی وجہ سے فرشتہ اپنے طاقت کی انتہا کو پہنچ گیا۔''

اِن دونوں کا حاصل یہ نکلا:

''فرشتے نے اپنی قوت بھر مجھے دبوچا۔''

میں نے ان چاروں احتمالوں کا لحاظ کر کے اختصار و جامعیت کے ساتھ ترجمہ یہ کیا:

''طاقت بھر دبوچا۔''

یہاں طاقت عام ہے، خواہ حضور کی طاقت ہو خواہ جبرئیل کی، دونوں کو شامل ہے۔

ہر ایمان دار جانتا ہے کہ یہ دوسرے اخیر کے دو معنی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمتِ شان کے کتنے مناسب ہیں۔

اس دبوچنے کی حکمت یہی تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی استغراقی کیفیت کو فرو کیا جائے، اگر کوئی شخص پورے انہماک سے کسی طرف متوجہ ہو اور اس سے کچھ کہا جائے وہ نہ سنے تو اس کا طریقہ یہی ہے کہ اسے جھنجھوڑا جاتا ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس استغراقی کیفیت میں تھے، اُسے فرو کرنے کے لیے جبرئیلِ امین نے تین بار دبوچا، ورنہ اِس دبوچنے کی کیا توجیہ ہوسکتی ہے؟ اور یہ کہنا کہ جبرئیل نے فیض پہنچانے کے لیے دبوچا تھا، توجیہِ بارد ہے۔

بزمِ فیضانِ رضا کی دیگر مطبوعات

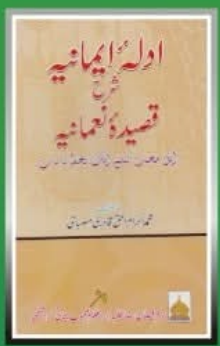

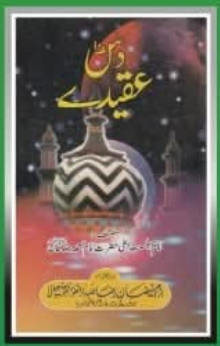

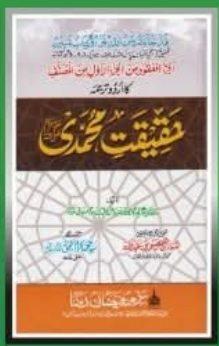

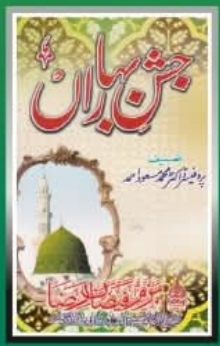

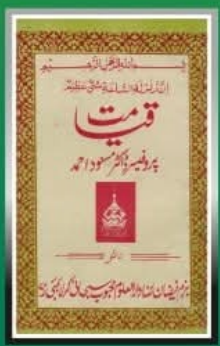

Publisher
BAZME FAIZANE RAZA
Talba-e-Darul Uloom Mahboobe Subhani
Imam Ahmad Raza Chowk, New Mill Road, Kurla (west) Mumbai-70